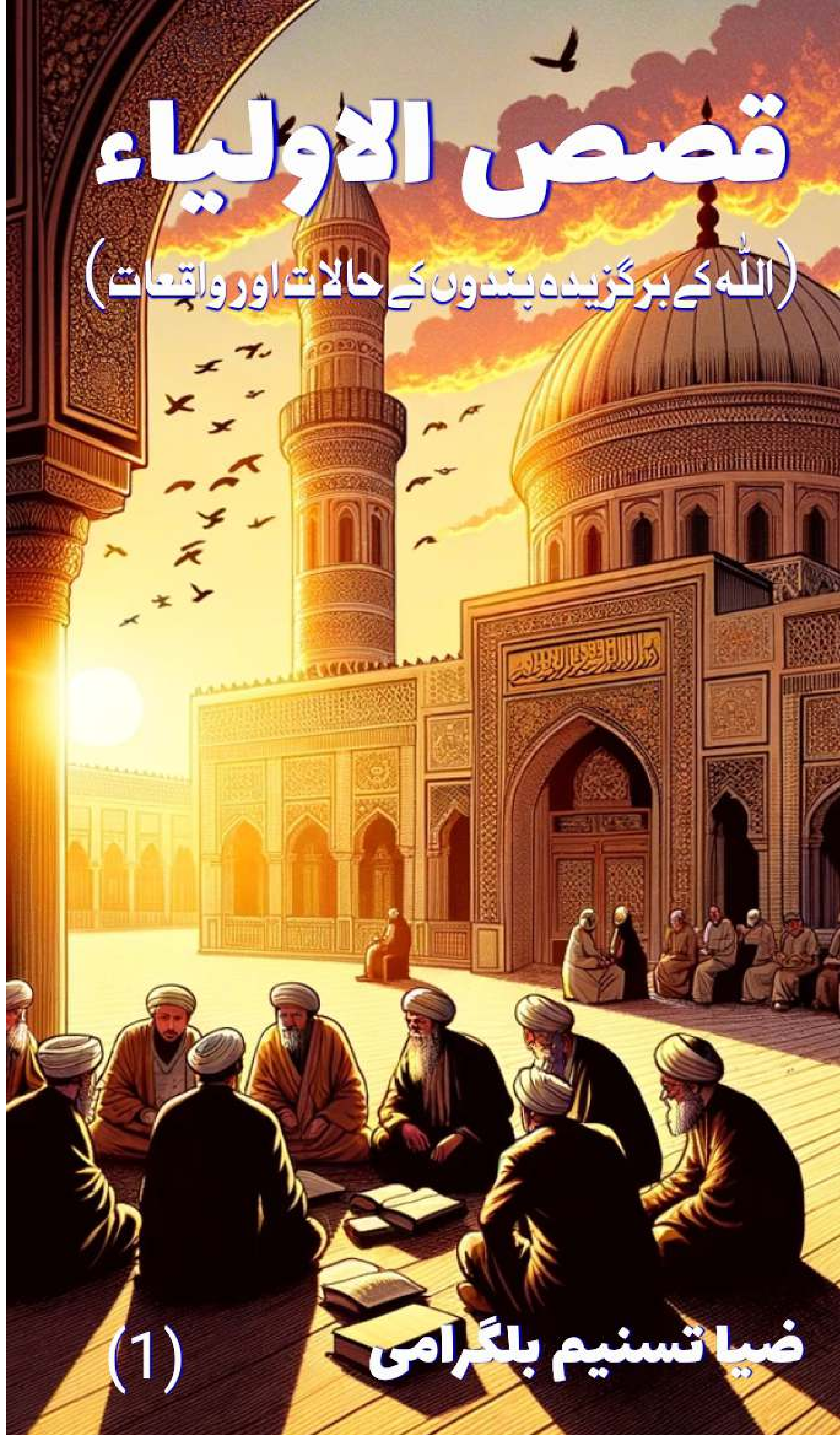
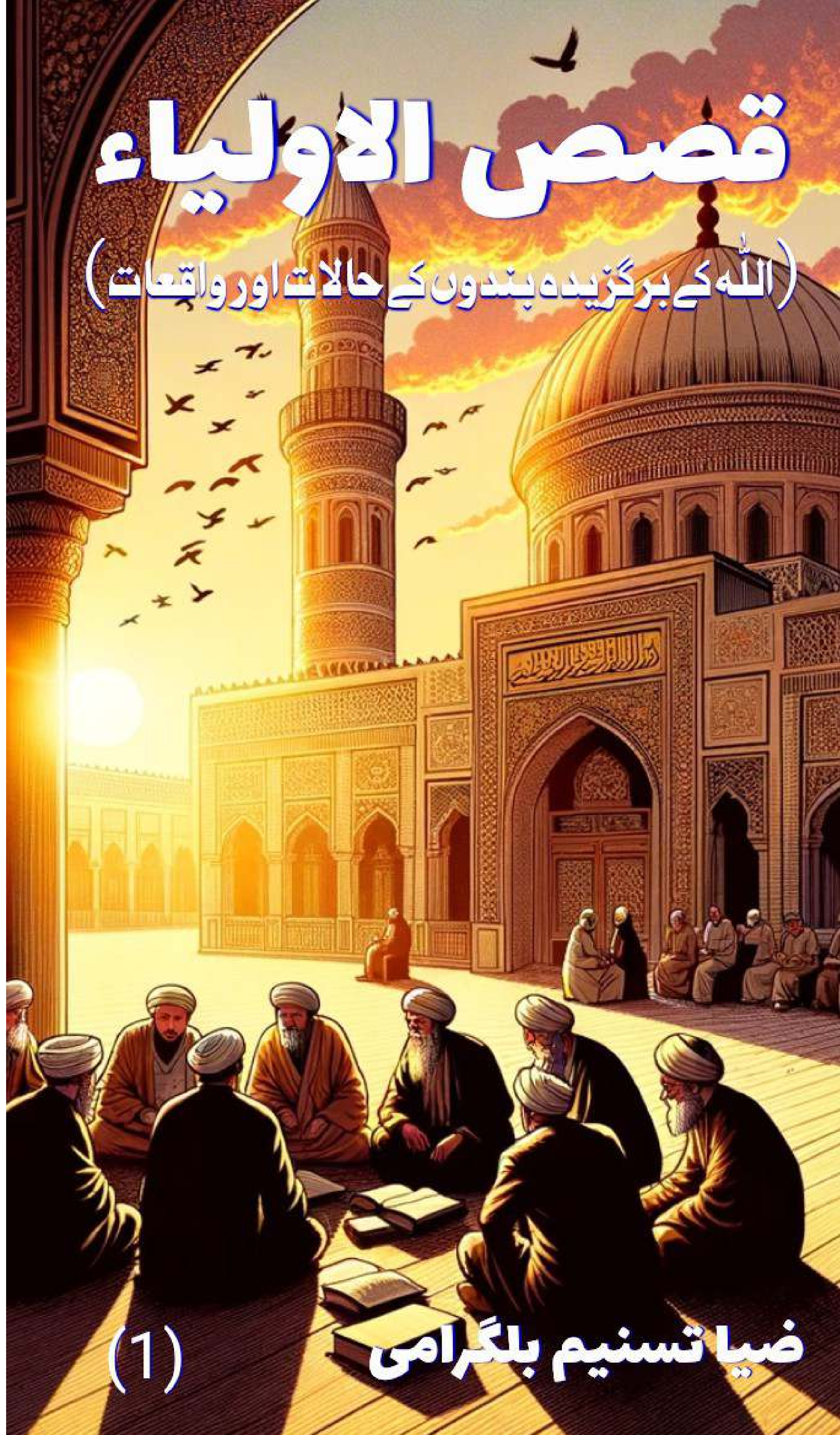

قصص الاولیاء
(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)
ضیا تسنیم بلگرامی
(1)


قصص الاولیاء
(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)
ضیا تسنیم بلگرامی
(1)

Compiled by

Abdul Basit

ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے

مغزن اصفیا

ملتان کا بادشاہ

شیخ نظام الدین

شمس عرفان

شاہ عبدالرحمان

عارف حق

شاہ دولہ

ابوسفیان ثوری

شیخ نجیب الدین

سلطان باہو

خواجہ باقی باللہ

فضل رحمن

جان جاناں کا خلیفہ

محبوب الٰہی

تصوف کی زبان

شیخ وجیہہ الدین

مخزنِ اصفیا

ضیا تسنیم بلگرامی



کس قدر خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ پیدائش سے قبل ہی اپنی عنایتوں اور کرامتوں سے نوازتا ہے۔ آپ کا شمار بھی ایسے ہی مقرب بندوں میں ہوتا ہے جنہیں ماں کے شکم میں ہی ولایت عطا کی گئی جبکہ آپ کے والدین کا شہرہ بھی اسی حوالے سے دور دور تک پھیلا ہوا تھا... اللہ کی رضا میں راضی رہنے والوں کے حوالے سے آپ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بے شک جب بندہ اللہ کی چاہت کو دل و جان سے اپنا لیتا ہے تو اللہ بھی بندے کی چاہت کا بھرم رکھتا ہے اور اسے کچھ اس انداز سے نوازتا ہے کہ بندہ یقین و بے یقینی کی کیفیت میں سوچتا رہ جاتا ہے۔

ولی باپ اور ولی بیٹے کے کشف و کرامات کے سبق آموز واقعات

خواجہ ابو احمد کی بزرگی اور کشف و کرامت کے قصے بہت مشہور تھے...... آپ ایران کے چشت نامی قصبے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ ابھی خواجہ معین الدین کی ولادت میں تقریباً دو، سوا دو سو برس باقی تھے جن سے خانوادۂ چشت کو شہرتِ دوام ملا۔ خواجہ ابو احمد کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ فرسناقہ کا سلطان خواجہ احمد کا باپ تھا لیکن خواجہ احمد نے اپنے لیے شہریاری کو گوارا نہیں کیا اور فقر فقیری کی راہ اختیار کی۔ اس میں انہوں نے وہ مقام حاصل کیا کہ زمانہ عمدۃ الابرار اور ندوۃ الاخیار کہہ کر پکارنے لگا۔

درویشی کے اس بلند مقام پر فائز ہوجانے کے بعد خواجہ احمد کو اولادِ نرینہ کی خواہش نے بے قرار کر رکھا تھا۔ وہ اپنے

رب سے کہتے۔ ''اے اللہ! کیا میں لاولد ہی رہوں گا، کیا میرا سلسلۂ نسل مجھ پر ختم ہو جائے گا؟''
یہ ایسے سوالات تھے جن کے جوابات نہیں مل رہے تھے۔ ان کی بیوی بھی اپنے نیک اور بزرگ شوہر کی اس خواہش اور پریشانی سے اچھی طرح واقف تھیں لیکن یہ ایسا مسئلہ نہیں تھا جس کا حل ان کے اختیار میں ہوتا۔ وہ بھی غمزدہ اور اشکبار، خدا سے درخواست کرتیں۔ ''بارالٰہی! مجھے اس لائق کردے کہ میں اپنے شوہر کی خواہش پوری کردوں۔ میں نے شہریار کے گھر میں آنکھ کھولی، نازونعم میں پلی، پھر جب جوان ہوئی تو تیری مشیت نے مجھے اس تارک الدنیا، زاہد شب بیدار کے حوالے کردیا۔ میں نے اپنی مقدرت بھر یہی کوشش کی ہے کہ اپنے شوہر کو خوش رکھوں اور اسے کسی طرح آزردہ نہ ہونے دوں۔ مگر میں تیری مشیت نہیں جانتی جو مجھے لاولد رکھ کر مجھے پریشان اور میرے شوہر کو آزردہ کیے ہوئے ہے۔ اب میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تو کسی طرح مجھے یہ بتادے کہ میری قسمت میں کوئی اولاد ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس میں تاخیر کیوں؟ اگر نہیں ہے تو کیا اس 'نہیں' میں تیری کوئی ایسی مصلحت شامل ہے جو ہمارے حق میں بہتر ہو۔''
دونوں کی بے قراری حد کو پہنچ چکی تھی۔ سوتے، جاگتے، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے، بس اولاد کی ہی فکر گھیرے رکھتی۔
ایک دن خواجہ احمد اداس اور خوفزدہ اپنی بیوی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بیوی کو ایک دم اپنی لاولدی کا خیال آیا۔ شوہر کو غمزدہ لہجے میں سمجھایا۔ ''آپ کو پریشان یا ملول نہیں ہونا چاہیے کیونکہ خدائی معاملات میں کسی انسان کی دخل اندازی فضول ہے۔ ہمیں یہ سوچ کر صبر کرلینا چاہیے کہ شاید اسی میں ہمارے لیے بہتری ہو۔''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''نیک بخت! میری اداسی یا غمزدگی کا سبب میری لاولدی نہیں ہے۔ ذرا میرے چہرے کو غور سے دیکھ، تجھ کو میرے چہرے پر مایوسی کے ساتھ ہی خوف کے اثرات بھی نظر آجائیں گے۔ مجھ کو تسلی دے، دلاسے دے، ڈھارس بندھا اور ہمت افزائی کر۔''
بیوی نے سہم کر پوچھا۔ ''آپ خوفزدہ کیوں ہیں؟''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے عالم رویا میں مجھے ڈانٹا گیا ہے۔ میں نے ایک آواز سنی جو کہہ رہی تھی کہ اے خواجہ احمد! تو یہ کیا غضب کررہا ہے کہ تیرا دل جو میرا گھر ہے، آج اس میں اولاد کی خواہش جاگزیں ہے۔ کیا یہی دعوئ محبت ہے تیرا؟''
بیوی نے آزردگی سے کہا۔ ''اگر خدا کی یہی مرضی ہے کہ میں جس چیز سے محروم ہوں، اس کی خواہش یا ذکر نہ کروں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''
اس کے بعد ان دونوں نے اپنے دلوں سے اولاد کی خواہش نکال دی اور سرتاپا یادِ الٰہی اور ذکرِ رب میں مشغول ہوگئے۔ اب وہ دونوں اپنے رب کے سرتاپا شکرگزار بندے تھے۔ اس حالت کو کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ بیوی کو اپنے آپ میں کچھ تبدیلیاں محسوس ہوئیں اور جس آرزو کو اپنے دل سے نکال باہر کیا تھا، اس کا نخل اپنے پہلو میں نمودار ہوتے محسوس کیا۔ انہیں ڈر لگا کہ کہیں یہ محض خوش فہمی اور خوابیدہ خواہش کی بیداری نہ ہو، جس سے اللہ ان کا امتحان لے رہا ہو، انہوں نے اس کا ذکر اپنے شوہر سے نہیں کیا۔
دوسرا مہینا گزرا تو شبہ یقین میں بدلنے لگا۔ مگر وہ بدستور خاموش رہیں اور شوہر کو کچھ نہ بتایا لیکن تیسرے مہینے نے جملہ شکوک اور خدشات کو رفع کردیا اور انہیں بارآور ہونے کا یقین ہوگیا تو یہ خوش خبری اپنے شوہر کو سنانا چاہی۔ کئی بار زبان کھولتے کھولتے رہ گئیں اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔
آخر ایک دن انہوں نے حتمی ارادہ کرلیا کہ وہ اس راز کو اپنے شوہر پر منکشف کرکے رہیں گی۔ وہ اپنے شوہر کے پاس بیٹھ کر اپنے رب کا ذکر کرنے لگیں، بولیں۔ ''آپ یقین کیجیے کہ میں نے اپنی لاولدی کو اللہ کی مشیت سمجھ کر قبول کرلیا اور اس خیال کو اپنے دل سے اس طرح نکال دیا تھا، جس طرح روح جسم سے نکل جاتی ہے، پھر......''
خواجہ احمد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''یہ 'اپنے دل سے نکال دیا تھا' جملے میں ''تھا'' کا کیا مطلب ہے؟ یعنی تمہارا یہ عمل ماضی کی چیز بن چکا ہے۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''
بیوی نے گھبرا کر جواب دینے کی کوشش کی۔ ''آخر اللہ کے شکرگزار بندوں کا کیا فرض ہے؟ یہی نا کہ وہ ہر حال میں اپنے مالک کے شکرگزار اور قانع رہیں۔ کیا میں اپنے رب کی شکرگزار نہیں ہوں؟''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''تیری شکرگزاری پر میں نے کب شک کیا ہے؟ مجھ کو اب اس وقت بھی یہی یقین ہے کہ

میری ہی طرح تو بھی اپنے رب کی شکر گزار بندی ہے۔"

بیوی نے مزید کہا۔ "اور میں اس پر بھی یقین رکھتی ہوں کہ اپنے رب کی بدلتی ہوئی مشیت کو شکریے کے ساتھ قبول کرلوں۔"

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ "بے شک بے شک۔ یہی ہر انسان کا ایمان ہونا چاہیے۔"

بیوی نے پوچھا۔ "میں ایک مسئلہ جاننا چاہتی ہوں۔"

شوہر نے جواب دیا۔ "پوچھ، پوچھ...... وہ کیا مسئلہ ہے؟"

بیوی نے کہا۔ "مسئلہ یہ ہے کہ ایک صابر وشاکر شخص نے اپنے رب سے کسی ایسی خواہش کا اظہار کیا جو اس کی مشیت کے خلاف تھا۔ پھر جب اس انسان کو کسی طرح سرزنش ہوئی کہ خدا اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ کسی صابر وشاکر بندے کے دل میں اس کے رب کی خواہش کے علاوہ کوئی اور خواہش بھی جگہ لے تو اس صابر وشاکر بندے نے اپنے آپ کو اور دل کو اپنے رب کی مرضی کے تابع کر دیا اور اپنے دل کو خواہشات ماسوا اللہ سے یکسر خالی کر دیا......"

خواجہ احمد مسکرانے لگے، بات کاٹ کر کہنے لگے۔ "وہ اللہ کا صابر وشاکر بندہ تیرے سوا کون ہو سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تو کیا کہنا چاہتی ہے؟ میرے رب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں دو مہینے پہلے ہی یہ ذکر چھیڑنا چاہتا تھا...... لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے کہیں وہ میری خوابیدہ خواہش کی جلوہ گری تو نہیں...... لیکن آج تین ماہ بعد میں تجھ سے یہ ذکر کرنے ہی والا تھا کہ بات تو نے شروع کر دی۔"

بیوی کا خوشی سے عجیب حال ہو رہا تھا، پوچھا۔ "آپ کیا ذکر کرنے والے تھے؟"

خواجہ احمد نے کہا۔ "جو تو کہنا چاہتی ہے۔"

بیوی نے کہا۔ "میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟"

جواب ملا۔ "تو کہنا چاہتی ہے کہ میں اللہ کے دین سے بار آور ہو گئی ہوں۔ تو بتانا چاہتی ہے کہ میرے شکم میں نخلِ آرزو پرورش پا رہا ہے۔"

بیوی نے خوشی سے دونوں ہونٹ بھینچ لیے اور جوشِ مسرت کو دبا کر پوچھا۔ "یہ بات آپ کو کس طرح معلوم ہوئی؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "میں تین ماہ سے مسلسل یہی دیکھ رہا ہوں کہ میرے جسم سے روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی اور تیرے شکم میں اتر گئی۔ پہلے میں نے یہ منظر عالمِ رویا میں دیکھا، پھر بیداری میں دیکھا کہ ایک آواز مجھ سے کہہ رہی ہے، خواجہ احمد مبارک ہو کہ تو ایک ایسے بیٹے کا باپ بن چکا ہے جو اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سرفہرست ہو گا...... اور مبارک ہو یہ خوشخبری کہ اس کے بعد خدا تجھے ایک ایسی بیٹی سے نوازے گا جو تیرے بیٹے ہی جیسی نورانی شخصیت کی ماں بنے گی اور جو خانوادۂ چشت کے اولین اکابرین میں شمار کیے جائیں گے۔"

بیوی فرطِ خوشی میں شوہر کی باتیں سنتی رہیں اور آخر میں کہا۔ "مجھے یہ افسوس زندگی بھر رہے گا کہ میں نے بے صبری سے کام لیا اور زندگی کا کچھ عرصہ ناشکری میں گزار دیا۔"

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ "خود مجھے بھی یہ افسوس زندگی بھر رہے گا۔"

بیوی نے پوچھا۔ "تو کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ میرے شکم میں پرورش پانے والا لڑکا ہی ہے، لڑکی نہیں؟"

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ "مجھ کو پورا یقین ہے کہ یہ لڑکا ہی ہوگا کیونکہ لڑکی اس کے بعد پیدا ہوگی۔"

اس گفتگو کے کئی دن بعد نصف شب کو خواجہ احمد تہجد کے لیے مصلّے پر کھڑے ہوئے اور چند رکعت پڑھنے کے بعد وہ اس خیال سے بیوی کے بستر کے پاس گئے کہ اس سرد رات میں ان کی بیوی کہیں سوتے میں کھل تو نہیں گئی۔ بیوی گہری نیند میں سوئی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے سرہانے جا کھڑے ہوئے اور انہماک شوق سے ان کا معصوم چہرہ دیکھنے لگے۔ اچانک ان کے کانوں میں کسی کے ذکر کی آواز سنائی دی۔ کوئی آہستہ آہستہ کلمۂ طیبہ کا ورد کر رہا تھا۔ خواجہ احمد نے بیوی کے بستر کے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ پھر وہ دم سادھ کر ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد آواز کی سمت کا تعین ہو گیا۔ یہ آواز بیوی کے وجود سے آ رہی تھی۔ یہ تصدیق و تجربے کے لیے بیوی کے پاس جا کھڑے ہوئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بیوی کے جسم سے کلمۂ طیبہ کی صاف آواز آ رہی تھی۔

خواجہ احمد چپ چاپ اپنے مصلّے پر واپس آ گئے اور نمازِ تہجد میں مشغول ہو گئے۔

کئی دن بعد بیوی نے ان سے کہا۔ "میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔"

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ”تمہیں جو ضروری بات کرنا ہے کرلو، اس کے بعد ایک بات میں بھی تم سے پوچھوں گا۔“
بیوی نے کہا۔ ”کچھ دنوں سے میں ایک پراسرار کیفیت میں مبتلا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے؟“
خواجہ احمد نے کہا۔ ”تو تفصیل سے بتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی وہی بات ہے جو میں تجھ سے پوچھنے والا ہوں۔“
بیوی نے جواب دیا۔ ”میں کئی دن سے اپنے وجود سے کلمۂ طیبہ کی آواز سن رہی ہوں۔ معلوم نہیں یہ کیا ہے؟“
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ”یہی تو میں خود بھی سوچ رہا ہوں کیونکہ کئی دن پہلے کی بات ہے کہ میں نصف شب کو تیرے کمرے میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ کہیں اس سرد رات میں تو کھل تو نہیں گئی لیکن تو بالکل صحیح لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے تیرے کمرے میں کلمۂ طیبہ کے ورد کی آواز سنی۔ کوئی آہستہ آہستہ کلمۂ طیبہ کا ورد کر رہا تھا۔ میں حیران و پریشان پورے کمرے میں چکر لگانے لگا کہ آواز کا منبع اور سمت کا اندازہ لگاؤں اور کچھ دیر بعد میں نے اس کے منبع اور سمت کا اندازہ لگالیا۔ یہ آواز تیرے جسم سے آرہی تھی۔“
بیوی نے پوچھا۔ ”یہ کیسی آواز ہے؟ اور میرے وجود سے کیوں نکلتی ہے جبکہ میں خود ایسا کوئی ورد نہیں کر رہی؟“
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ”جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس آواز کا تعلق اس ذات سے ہے جو تیرے شکم میں پرورش پا رہی ہے۔“
بیوی نے کہا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو ابھی پیدا بھی نہ ہوا ہو، وہ کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔“
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ”ممکن اور ناممکن کا علم تو صرف خدا کو ہے لیکن میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں، وہ ہر بات پر قادر ہے۔“
بیوی نے کہا۔ ”اس کے علاوہ میرے جسم سے خوشبو کی لپٹیں نکلتی ہیں۔“
خواجہ نے جواب دیا۔ ”اس خوشبو کا بھی تعلق اس معصوم ذات سے ہے جو عنقریب پیدا ہونے والی ہے۔“
پھر وہ دونوں ان باتوں کے عادی ہو گئے اور انہیں یہ عجیب باتیں گوارا ہو گئیں۔
ایک دن ولادت سے چند یوم پہلے، خواجہ احمد اپنی بیوی کے پاس بیٹھے تھے اور بیوی کو خفیف سی تکلیف محسوس ہو رہی تھی کہ خواجہ احمد کو یوں محسوس ہوا گویا کوئی انہیں سلام کر رہا ہے۔ خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ”وعلیکم السلام یا ولی اللہ و خلیفتی!“
بیوی نے پوچھا۔ ”یہ آپ نے کس کے سلام کا جواب دیا ہے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اللہ کے برگزیدہ بندے کے سلام کا جواب دے رہا ہوں، جو میرا خلیفہ بھی ہوگا۔“
بیوی نے کہا۔ ”افسوس کہ میں آپ کی باتیں نہیں سمجھ پا رہی ہوں۔“
شوہر نے جواب دیا۔ ”میں تجھے کتنی بار یہ بات بتاؤں کہ تیرے شکم میں پرورش پانے والا بچہ ولی ہوگا۔ ابھی ابھی میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ مجھے سلام کر رہا ہے چنانچہ میں نے اس کے سلام کا جواب دے دیا۔“
بیوی نے کہا۔ ”لیکن میں نے وہ آواز نہیں سنی۔“
شوہر نے جواب دیا۔ ”اس نے سلام مجھ کو کیا تھا، میں نے وہ آواز سن لی۔ اگر تجھ کو سلام کیا گیا ہوتا تو، تو بھی سن لیتی۔“
بیوی نے کہا۔ ”لیکن آواز سے تو علم نہیں ہوسکتا اور پھر آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ آنے والا لڑکا ہی ہے، وہ لڑکی بھی ہوسکتی ہے۔“
خواجہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، وہ لڑکی نہیں لڑکا ہے۔“
محرم کی نو تاریخ تھی۔ بیوی کی حالت یوں تو خراب نہیں تھی لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ولادت میں اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ خواجہ احمد بیوی سے ذرا فاصلے پر بیٹھے اللہ، اللہ کر رہے تھے۔ اچانک ان کی آنکھ لگ گئی اور پلک جھپکتے ہی انہوں نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ احمد، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کھڑے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”خواجہ احمد! تیرے گھر میں فرزند پیدا ہوا ہے۔“
خواجہ احمد نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ! مجھ کو تو پتا نہیں لیکن میں خوش بہت ہوں۔“
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”خواجہ احمد! اپنے اس فرزند کا نام میرے نام پر ”محمد“ رکھنا۔“
خواجہ احمد کی آنکھ کھل گئی اور گھر میں موجود عورتوں سے بیوی کی خیریت معلوم کی۔ عورتوں نے فرزند کی ولادت کی خوشخبری سنائی۔ آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور عورتوں سے کہا۔ ”میں اپنے فرزند کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔“
عورتوں نے راستہ دے دیا۔ آپ بیوی کے پہلو میں لیٹے ہوئے فرزند کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ بچے نے پلکیں جھپکائے بغیر باپ کو دیکھا اور باپ نے کچھ دیر محویت سے دیکھ کر کہا۔ ”اے فرزند! میں نے تیرا نام محمد رکھ دیا ہے کیونکہ تیرے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی یہی ہدایت تھی۔“

اس کے بعد خواجہ سجدے میں گر گئے اور دعا کی۔ ''یا الٰہی! میرے بیٹے کو ولی بنا دے۔ ولی اللہ، اپنا ولی۔''
ابھی سجدے سے سر اٹھا بھی نہ تھا کہ کانوں میں آواز آئی۔ ''احمد! تیری دعا قبول ہوئی، تیرا فرزند مقبول بندہ بنا لیا گیا۔''
پیدائش کے دوسرے دن عاشورہ تھا۔ ماں بچے پر واری ہوتی جا رہی تھی۔ فجر سے ذرا پہلے بچے کو دودھ پلایا تھا اور اب آفتاب بھی طلوع ہو چکا تھا لیکن بچے نے دودھ نہیں پیا تھا۔ ماں نے سوچا، بچہ خاصا بھوکا ہوگا لیکن بچے نے دودھ نہیں پیا۔ منہ ہٹا لیا۔ ماں نے زبردستی دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن بچے نے منہ بھینچ لیا اور مچلنے لگا۔ جب ماں اپنی کوشش میں ناکام ہو گئیں تو انہیں گمان گزرا کہ شاید بچے کی طبیعت خراب ہے، شوہر سے کہا۔ ''میرا خیال ہے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ دودھ نہیں پی رہا۔''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''نہیں، یہ بات نہیں ہے، اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔''
بیوی نے پوچھا۔ ''اگر طبیعت ٹھیک ہے تو یہ دودھ کیوں نہیں پیتا؟''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''بیوی! یہ مادر زاد ولی ہے، انبیاء اور اولیاءؒ کا روزِ عاشورہ روزہ رکھنا دستور چلا آ رہا ہے۔ یہ اس دستور پر ابھی سے عمل پیرا ہو گیا ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔''
بیوی نے تشویش سے کہا۔ ''اگر آپ کی بات درست ہے تو واقعی بڑی خوشی کی بات ہے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر تشویش اور فکر کی بات ہے۔ ایک دن کے بچے کا دن بھر بھوکا رہنا عجیب بھی ہے اور تشویش ناک بھی۔''
خواجہ احمد نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''بہر حال بڑی خوشی کی بات ہے، شام تک انتظار کر لو میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔''
بیوی خاموش ہو گئیں اور شوہر کے چلے جانے کے بعد ایک بار پھر کوشش کی کہ بچہ دودھ پی لے لیکن اس نے دودھ نہیں پیا۔ اس طرح پورا دن گزر گیا، شام ہو گئی اور مغرب کی اذان سے فضا گونجنے لگی۔ ماں نے بچے کو دودھ پلایا تو وہ فوراً پینے لگا۔ ماں کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''سبحان اللہ بارِ الٰہی! میں کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں۔''
شوہر نے نماز کے بعد پوچھا۔ ''بچے نے روزہ افطار کیا؟''
بیوی نے جواب دیا۔ ''ہاں، آپ کی بات درست ہے۔ میرا بچہ پیدائشی ولی ہے۔''
چند ماہ بعد، ایک دن ماں اپنے بیٹے کو دودھ پلا رہی تھیں، خواجہ احمد ان کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ان دونوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ بچے نے دودھ پینا تو چھوڑ دیا اور بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ ماں کو اپنے بیٹے کی اس حرکت پر تعجب ہوا اور شوہر سے پوچھا۔ ''آپ نے کچھ دیکھا؟''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''ہاں، دیکھا اور تیری ہی طرح میں خود بھی حیران ہوں کہ آخر یہ بے اختیار ہنسا کیوں۔''
بیوی نے کہا۔ ''اگر آپ اس کا سبب نہیں بتائیں گے تو کون بتائے گا؟''
خواجہ احمد نے آنکھیں بند کر لیں اور بیوی سے کہا۔ ''ذرا صبر کر، میں کشف سے معلوم کرتا ہوں۔''
اس کے بعد وہ مراقبے میں چلے گئے اور دیر تک یوں ہی بیٹھے رہے۔ بیوی دم بخود بیٹھی شوہر کی صورت دیکھتی رہیں۔ بچہ دودھ پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد خواجہ احمد نے آنکھیں کھول دیں اور بیوی سے کہا۔ ''بیوی! اس وقت میں نے ایک عجیب سماں دیکھا۔ حیران ہوں کہ آخر تیرے بچے کا مقام کیا ہے اور خدا کا یہ کتنا برگزیدہ بندہ ہے۔''
بیوی نے پوچھا۔ ''پھر بھی مراقبے سے کیا معلوم ہوا؟''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''میں نے مراقبے میں دیکھا، شیطان میرے بچے کی طرف رلانے کے لیے بڑھ رہا ہے لیکن عین اس وقت جبکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والا تھا، چند فرشتوں نے شیطان کی مرمت شروع کر دی اور شیطان بدحواس ہو کر بھاگا۔ عالم یہ تھا کہ شیطان بھاگ رہا تھا اور فرشتے مارنے میں مصروف تھے۔ بس اس مضحکہ خیز منظر نے میرے فرزند کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔''

☆☆☆

محمد کی عمر ڈھائی سال کی ہو چکی تھی۔ ماں کو بڑی فکر تھی کہ ان کا بیٹا خوب کھائے پیے اور صحت بنائے لیکن محمد کو کھانے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، وہ بہت کم کھاتے تھے۔ ماں نے بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے! تم کھانا بہت کم کھاتے ہو؟ آخر کیوں؟''
محمد نے جواب دیا۔ ''ماں! کھانا کم ہی کھانا چاہیے۔''
ماں کو ننھے منے بیٹے کی زبان سے یہ جواب سن کر بڑی حیرت ہوئی اور اپنے شوہر سے یہ واقعہ بیان کر کے پوچھا۔ ''میں

حیران ہوں کہ محمد کے اس جواب کا مطلب کیا ہوا؟ اور یہ کہ کیا اتنا ننھا منا بچہ ایسی بات کر سکتا ہے؟''

خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ یہ بچہ اللہ کا ولی ہے۔ یہ ابھی سے کم کھانے کی سنت پر عمل کر رہا ہے۔ اللہ کے پیارے بندے کھانے پینے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔''

ماں نے فرطِ خوشی میں رونا شروع کر دیا۔

اب ماں کا یہ حال تھا کہ اپنے بیٹے کی کسی بات پر بھی انہیں حیرت نہیں ہوتی تھی۔ محمد کی ہر بات، ہر واقعہ اور ہر فعل ایسا تھا جو کسی یادرزاد ولی سے وابستہ ہو سکتا تھا۔ کم کھانا، کم سونا اور کم باتیں کرنا، ہر وقت فکر میں ڈوبے رہنا۔ یہ محمد کی فطرت تھی، محمد کی عادت تھی۔ پاس پڑوس کے بچوں سے محمد کے تعلقات ایسے نہیں تھے جیسے عموماً ہم عمر بچوں میں ہوا کرتے ہیں۔ وہ خواجہ احمد کے بچے سے چڑنے لگے تھے لیکن ننھے محمد کو اس کی نہ تو فکر تھی نہ پروا۔

آپ کو مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ آپ کے شوق اور انہماک کا یہ حال تھا کہ کسی کو مکتب تک پہنچانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اپنے آپ ہی چلے جایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ حسبِ معمول تنہا مکتب جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بزرگ نے انہیں روک لیا، پوچھا۔ ''کیا تم مکتب جا رہے ہو؟''

محمد نے جواب دیا۔ ''ہاں، کیا آپ نے میرے ہاتھ میں کتابیں نہیں دیکھیں؟''

بزرگ نے پوچھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مکتب کیوں جاتے ہو؟''

محمد نے کہا۔ ''میں مکتب تعلیم حاصل کرنے جاتا ہوں، پڑھنے جاتا ہوں۔''

بزرگ نے کہا۔ ''تمہاری تعلیم پر مجھے مقرر کیا گیا ہے۔ تمہیں میں پڑھاؤں گا، تم مجھ سے پڑھو۔''

محمد نے بڑے میاں کو ایک بار پھر بڑی توجہ اور حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ ''لیکن آپ ہیں کون؟''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''میں وہ ہوں جو راہنمائی کرتا ہے۔ خدا نے میرے ذمے تم لوگوں کی تعلیم و تربیت اور راہنمائی کا فرض سونپا ہے۔ میں خاصہ خاصان کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا گیا ہوں۔''

محمد نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ''تو گویا آپ خواجہ خضر ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''بے شک، تم نے بہت صحیح پہچانا، میں تمہیں تعلیم دینے آیا ہوں۔''

محمد نے درخواست کی۔ ''پھر آپ اپنا کام شروع کر دیجیے۔ خدا نے آپ کو جو حکم دیا ہے اس کو پورا کیجیے۔''

حضرت خضر علیہ السلام انہیں ایک کونے میں لے گئے اور کچھ یاد کرانے لگے۔ محمد نے اسے بہت جلد یاد کر لیا۔ خواجہ خضر نے کہا۔ ''بیٹے! یہ اسم اعظم ہے۔ اس کا یاد کر لینا ہی کافی ہے۔ اب تمہیں کچھ اور پڑھنے یا یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اولیاء اللہ کے لیے اسم اعظم کا یاد کر لینا ہی کافی ہے۔''

محمد نے واقعی یہ محسوس کیا کہ ان کے سینے میں علم کا سمندر اتر چکا ہے۔ علم و معارف کا بحرِ ذخار دل و دماغ میں ہچکولے لے رہا تھا۔ وہ اس کے بعد مکتب نہیں گئے اور وہیں سے گھر واپس چلے گئے۔ ماں نے خلافِ معمول گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو پوچھا۔ ''کیا آج تم مکتب نہیں گئے؟ راستے ہی سے واپس آ گئے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ماں! میں اب مکتب نہیں جاؤں گا۔ جتنا پڑھ لیا بس اتنا ہی کافی ہے۔''

ماں کو اس جواب سے دکھ پہنچا، پوچھا۔ ''نہ پڑھنے کی وجہ؟ بیٹے علم کے بغیر تو خدا کی معرفت بھی ناممکن ہے کہ بے علم نتواں خدا را شناخت۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''ماں! میرے جواب کا یہ مطلب نہیں کہ میں جاہل رہنا پسند کرتا ہوں۔ نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں فارغ التحصیل ہو چکا ہوں۔ میرے لیے مکتب کی تعلیم غیر ضروری ہو چکی ہے۔''

ماں نے بیٹے کو شک و شبے کی نظروں سے دیکھا۔ ''تو جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے مفہوم سے بھی واقف ہے؟''

محمد نے جواب دیا۔ ''ماں! آپ یقین کریں، میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں اور آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا مفہوم بھی جانتا ہوں۔''

ماں نے کہا۔ ''اگر تو غلط فہمی سے یہ سمجھنے لگا ہے کہ تو اس ذرا سی عمر میں فارغ التحصیل ہو چکا ہے تو یہ محض طفلانہ خوش فہمی ہے۔ پڑھتے پڑھتے لوگوں کی زندگیاں گزر جاتی ہیں مگر وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔''

بیٹے نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''ماں! میں نے جو کچھ کہا ہے، آپ اس کا امتحان لے لیجیے۔ میرا خیال ہی نہیں یقین

ہے کہ میں اللہ کے فضل سے ہر امتحان میں پورا اتروں گا کیونکہ میں واقعی فارغ التحصیل ہو چکا ہوں۔''

ماں نے بیٹے سے کتابیں اور تختی لے لی اور کہا۔ ''لاؤ، اپنی تختی لاؤ، میں تمہارا امتحان لوں گی۔''

محمد نے جواب دیا۔ ''ماں! آپ اس تختی اور کتابوں سے میرا کیا امتحان لیں گی۔ میں نے آج جو کچھ اپنے استاد سے پڑھا اور سیکھا ہے، وہ ان کتابوں سے ماورا ہے اور وہ علم نہ تو اس تختی میں سما سکتا ہے اور نہ دنیا بھر کی تختیاں اس کی متحمل ہو سکتی ہیں۔''

ماں نے تعجب سے کہا۔ ''پھر میں تمہارا امتحان کس طرح لوں؟''

محمد نے جواب دیا۔ ''ماں! اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ قرآن پاک کو کھول کر اپنے سامنے رکھ لیں۔ آپ خوب جانتی ہیں کہ میں نے قرآن پاک کو حفظ نہیں کیا لیکن میں نے آج جو کچھ سیکھا ہے، اس کی روشنی میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ مجھے قرآن پاک حفظ ہو چکا ہے۔ آپ اس دعوے کا امتحان لے لیجیے۔''

ماں نے قرآن پاک کو کھول کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ بائیسواں پارہ ان کے سامنے تھا، بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے! بائیسواں پارہ سنانا تو۔''

محمد نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر بائیسواں پارہ زبانی پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کا لہجہ اور تجوید اتنی درست تھی کہ ماں کو اس پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ فرفر پڑھے چلے جا رہے تھے۔ جب وہ پورا پارہ سنا چکے تو ماں نے فرطِ محبت سے بیٹے کو گلے لگا لیا، بولیں۔ ''بیٹے! یہ کیا بات ہے؟ یہ قرآن پاک کب حفظ کیا تھا تم نے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''ماں! آپ سے نہ تو جھوٹ بول سکتا ہوں اور نہ کسی مغالطے میں رکھ سکتا ہوں۔ آج جب میں مکتب جا رہا تھا تو ایک بڑے میاں نے میرا راستہ روک لیا اور مکتب جانے سے منع کر دیا، بولے...... ''محمد! مکتب کی تعلیم تیرے لیے ضروری نہیں۔ تو مجھ سے پڑھ کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تیری تعلیم پر مامور کر دیا ہے۔''

ماں نے یہ مختصر سی روداد حیرت و تعجب سے سنی پھر پوچھا۔ ''یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟''

محمد نے بات پوری کی۔ ''ماں! پہلے تو میں نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب وہ میرے پیچھے ہی پڑ گئے تو میں نے پوچھا کہ حضرت! آخر آپ ہیں کون؟ اور اللہ نے خاص طور پر آپ ہی کو کیوں میرے پاس بھیج دیا؟ ماں، آپ جانتی ہیں کہ انہوں نے میرے اس سوال کا کیا جواب دیا؟''

ماں نے کہا۔ ''میں تیرے بتائے بغیر اس جواب سے کس طرح آگاہ ہو سکتی ہوں جو اس بزرگ نے تمہیں دیا ہوگا۔''

محمد نے کہا۔ ''انہوں نے بتایا کہ میں وہ ہوں جس کو راہنمائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور میں وہ ہوں جو اولیاء اللہ کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا جاتا رہا ہے، میں خواجہ خضرؑ ہوں۔''

ماں چونک پڑیں۔ ''کیا آج تجھے خضرؑ ملے تھے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ہاں ماں! آج میں نے حضرت خضرؑ سے ملاقات کی تھی۔ وہ میرے پاس بطورِ خاص آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ خدا نے انہیں بطورِ خاص میرے پاس بھیجا ہے اس لیے میں نے ان سے تعلیم حاصل کر لی۔ تعلیم تو کیا حاصل کی بس ان سے اسمِ اعظم سیکھ لیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اسمِ اعظم یاد کرنے کے بعد کسی اور علم کی ضرورت نہیں رہتی۔''

ماں کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ ان کے ولی بیٹے کو خواجہ خضرؑ نے اسمِ اعظم یاد کرا دیا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔

اب محمد نے جس راستے پر قدم رکھ دیا تھا، وہ وہی تھا جس پر ان سے پہلے حسن بصریؒ، جنید بغدادیؒ، معروف کرخیؒ، رابعہ بصریؒ اور دوسرے جید صوفیائے کرام چل چکے تھے۔ آپ کے والد کو سماع سے بے حد شغف تھا اور اس کو روحانی غذا کہتے تھے۔ باپ نے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا لیکن قوالی سننے کے دوران بیٹے کو دور ہی رکھتے۔ محمد قوالوں کی آواز دور سے سنتے تو انہیں یوں لگتا گویا انہیں غیر مرئی قوت اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ قوالوں کی طرف کھنچنے لگتے۔ کئی بار ان کے جی میں آئی کہ وہ اپنے باپ سے محفلِ سماع میں شمولیت کی اجازت حاصل کر لیں لیکن ہمت نہیں پڑی اور خاموش رہے۔

ایک دن محفلِ سماع گرم تھی اور خواجہ احمد سماع سننے میں مشغول تھے۔ ان پر وجد طاری تھا۔ دوسری طرف محمد کی یہ حالت تھی کہ وہ خود کو روکے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کے قدم بے اختیار محفلِ سماع کی طرف اٹھے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ محفلِ سماع کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں سے خواجہ احمد صاف نظر آرہے تھے۔ محمد کے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ محفلِ سماع میں باپ کی مرضی کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے تھے اور باہر کھڑا رہنا دشوار تھا۔ اسی عالم میں باپ کی نظر مضطرب بیٹے پر پڑ گئی۔ باپ نے اشارے سے پاس بلا لیا۔ جب یہ باپ کے پاس پہنچے تو خواجہ احمد نے پوچھا۔ ''تم وہاں رک کیوں گئے تھے؟''

محمد نے جواب دیا۔ ''میں اس محفل میں آپ کی اجازت کے بغیر کس طرح آسکتا تھا۔''
باپ نے کہا۔ ''بیٹے! پہلے میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ تو وقت سے پہلے اس محفل میں آئے لیکن میرا خیال ہے کہ اب تو محفلِ سماع میں آسکتا ہے۔''
لیکن اب محمد کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ ان کے ہوش وحواس رخصت ہو چکے تھے۔ سماع نے انہیں بے حال و بے خود کر دیا تھا۔ انہوں نے بڑی بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا اور مدہوش ہو کر گر گئے۔ باپ نے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی مگر نہیں سنبھال سکے۔ نماز کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ باپ نے افسوس سے کہا۔ ''محمد! اگر وجد و کیف کا یہی عالم رہا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو نماز کس طرح پڑھے گا؟''
بیٹے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باپ نے قوالوں کو روک دیا کہ وہ قوالی نہ گائیں۔ وہ رک گئے۔ کافی دیر بعد محمد کو ہوش آنے لگا۔ باپ نے کہا۔ ''بیٹے! ہوش میں آؤ، نماز کا وقت ہو چکا ہے۔''
بیٹے نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر وضو کرنے چلے گئے۔ اس کے بعد نماز ادا کی۔ نماز کے بعد باپ نے کہا۔ ''فرزند! تجھ پر سماع نے جو اثر کیا ہے اس سے یہ ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ وجد و کیف سے تیری نماز قضا ہو جایا کرے گی۔''
بیٹے نے جواب دیا۔ ''باوا جان! جب میں وجد و کیف میں مدہوش ہو جاؤں تو اگر میرے کان کے پاس بار بار الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہا جائے گا تو میں ہوش میں آجایا کروں گا کیونکہ اس عالم مدہوشی میں بھی خشیتِ الٰہی کی حس بیدار رہتی ہے۔''
باپ نے کہا۔ ''بیٹے! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے۔''
محمد نے خواہش کی۔ ''باوا جان! قوالوں کو حکم دیجیے کہ قوالی شروع کریں۔''
باپ نے بیٹے کی خواہش کا احترام کیا اور قوالوں سے کہا۔ ''قوالی شروع کریں۔''
قوالوں نے پوچھا۔ ''کتنی دیر کے لیے؟''
باپ کے بجائے بیٹے نے جواب دیا۔ ''جب تک میں منع نہ کروں۔''
باپ نے تائید کی۔ ''میں اس کی تائید کرتا ہوں۔''
قوالوں نے قوالی شروع کر دی اور محمد پر ایک بار پھر وجد و کیف طاری ہو گیا۔ اب ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ جب نماز کا وقت آتا تو کوئی شخص ان کے کان کے پاس الصلوٰۃ الصلوٰۃ کی صدا لگاتا جس سے وہ ہوش میں آجاتے۔ نماز ادا کرتے اور اس کے بعد پھر کیف میں مبتلا ہو جاتے۔ قوالوں کو ان کا اتنا پاس ولحاظ تھا کہ وہ سات دن تک اسی طرح قوالیاں سناتے رہے، آخر آٹھویں دن خواجہ احمد نے قوالوں کو منع کیا اور کہا۔ ''اب تم لوگ قوالی بند کر دو، بہت ہو چکا۔''
قوالوں نے کہا۔ ''حضرت! ہمیں تو آپ کے فرزند کے حکم کی تعمیل کرنا تھی سو سات دن سے کر رہے ہیں۔ اب خاموش ہو جانے کا حکم دے رہے ہیں تو خاموش ہوئے جاتے ہیں۔''
قوال خاموش ہو گئے۔ خاموشی کے کافی دیر بعد محمد کو ہوش آیا تو بے اختیار قولو، قولو کہنا شروع کر دیا۔ قوالوں نے خواجہ سے پوچھا۔ ''حضرت! کیا حکم ہے، کیا ہم قوالی شروع کر دیں؟''
خواجہ احمد نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بہت ہو چکا۔ اب اس کو ہوش میں آجانا چاہیے۔''
لیکن عشقِ الٰہی میں چور فرزند کا وہی حال تھا کہ نیم مدہوشی میں ''قولو، قولو'' کی صدا لگائے جا رہے تھے پھر اچانک محمد نے قوالوں سے کہا۔ ''کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟ قولو، قولو۔''
قوالوں نے خواجہ احمد کی طرف دیکھا، انہوں نے آنکھ کے اشارے سے چپ رہنے کا حکم دیا۔
محمد نے نیم مدہوشی میں ادھر ادھر دیکھ کر جوش میں کہا۔ ''میں کیا کہہ رہا ہوں کسی نے سنا؟ میں کہہ رہا ہوں قولو، قولو۔ قوالی شروع کی جائے۔''
باپ نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نرمی سے کہا۔ ''فرزند! قوال تھک چکے ہیں۔ آج آٹھواں دن ہے کہ انہوں نے آرام تک نہیں کیا بس قوالی سنائے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اب انہیں آرام کر لینے دو۔''
لیکن فرزند کی کیفیت سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کس آگ میں پھنک رہا ہے۔ کوئی ایسی شے ضرور ہے جو محمد کو مضطرب اور بے چین کیے ہوئے ہے۔ بیٹے نے باپ کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور قولو، قولو کا نعرہ بلند کیا۔ کچھ دیر بعد جب ان کی خواہش نہیں پوری کی گئی تو انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور قولو، قولو کی صدا لگائی۔ اس صدا کے جواب میں فضا

سے نغمے سنائی دینے لگے۔ باپ کو اس پر یقین نہیں آیا اور آسمانی نغمے کو بغور سننا شروع کر دیا۔ اب یہ آواز اتنی صاف آ رہی تھی کہ اس آواز کو ہر کوئی سن سکتا تھا۔

تین دن گزر گئے مگر فضا سے نغمہ سرائی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس سے ہر شخص لطف اندوز ہو رہا تھا۔ محمد کے ہوش و حواس ان کے اختیار اور قابو ہی میں نہیں آتے تھے۔ تین دن بعد بھی فضا سے نغمگی جاری تھی۔ خواجہ احمد نے بیٹے کو ہوش میں دیکھ کر نصیحت کی۔ ”بیٹے! اعتدال۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”باوا جان! پہلے میں سماع کو اہم تو سمجھتا تھا لیکن اتنا اہم نہیں سمجھتا تھا۔“

باپ نے زور دیا۔ ”بیٹے! اعتدال، اعتدال۔“

محمد نے باپ کے قدموں کو بوسہ دے کر عرض کیا۔ ”باوا جان! جو لذت سماع میں ہے اور جیسی کامیابی سماع سے حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسرے شغل سے ممکن نہیں اور باوا جان! میں چند دنوں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کوئی شخص سو برس تک ریاضتِ شاقہ اور مجاہدے میں مشغول رہے تو وہ بھی اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتا جو دوسرے شخص کو ایک مرتبہ کے سماع سے حاصل ہو جاتا ہے۔“

خواجہ احمد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”بیٹے! خاموش، سماع ایک رازِ سربستہ ہے جسے عارفوں نے عوام پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ تو بھی اسے راز میں رکھ اور عام لوگوں سے پوشیدہ رکھ کیونکہ بیچارے عوام اس کی تاب نہیں لا سکتے۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”باوا جان! واقعی اگر سماع کے راز کو ظاہر کر دیا جائے تو ساری دنیا سماع میں مبتلا ہو جائے گی اور خدا سے سماع کے سوا کسی چیز کا مطالبہ ہی نہیں کرے گی۔“

اس دوران خواجہ احمد کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی اور جو بشارت پہلے ملی تھی، وہ پوری ہو گئی۔

آپ اپنی زندگی کے چوبیسویں سال میں داخل ہوئے تو خواجہ احمد نے فرمایا۔ ”بیٹے! میں نے آج تک تجھے اپنا مرید نہیں کیا۔ اب تو میری مریدی میں بھی آ جا۔“

بیٹے نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”میں مریدی کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔“

اس کے بعد محمد نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ باپ نے پوچھا۔ ”بیٹے! تو رو کیوں رہا ہے؟“

محمد نے جواب دیا۔ ”آپ آج میری عمر کے چوبیسویں سال میں مریدی کا ذکر فرما رہے ہیں حالانکہ آپ سالوں پہلے مجھے مرید کر سکتے تھے، چنانچہ میں نے آپ کا اصل مفہوم پا لیا ہے۔“

خواجہ احمد نے پوچھا۔ ”میرے بیٹے! تو نے کون سا مفہوم پا لیا؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”آپ کے ارشاد کی روشنی میں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب وقتِ جدائی آ گیا ہے اور میرے مرید ہو جانے کے بعد آپ ہم میں زیادہ دن نہیں رہیں گے۔“

باپ نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر تیری بات درست ہی ہو تو تجھے خوش ہونا چاہیے کہ تیرا باپ عنقریب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو مریدی میں آ جا تاکہ میں خرقۂ خلافت بھی تیرے ہی حوالے کر دوں۔“

بیٹے نے کہا۔ ”باوا جان! آپ مجھ پر یقین کریں، یہ بات امرِ مسلّم میں سے ہے کہ میں آپ کی جدائی کا صدمہ بہ مشکل برداشت کر سکوں گا۔“

خواجہ احمد ان باتوں میں زیادہ نہیں پڑنا چاہتے تھے اس لیے موضوع ہی بدل دیا اور کچھ دیر بعد اپنے بیٹے کو اپنی مریدی میں لے لیا اور انہیں اپنا خرقہ پہنا کر جانشین کر دیا۔ آپ نے بیٹے سے کہا۔ ”بیٹے! فقر و فاقے کو کبھی بھی نہ چھوڑنا، یتیم اور نادار بچے ہی تمہاری توجہ کے سب سے زیادہ مستحق ہوں گے بیٹے! دولت مندوں سے پرہیز کرنا کیونکہ دولت مندوں کے فتنے اپنے ساتھ صالحین کو بھی رسوا کر دیتے ہیں۔“

بیٹے نے باپ کی نصیحتیں گرہ میں باندھ لیں اور باپ کی اجازت سے لوگوں کو مرید کرنا شروع کر دیا۔

کچھ دنوں بعد خواجہ احمد کا وصال ہو گیا اور محمد نے ان کی جانشینی کا فرض انجام دینا شروع کر دیا۔

چشت اور اس کے آس پاس اب بھی غیر مسلموں کی آبادی موجود تھی، آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور انہیں مسلمان کرنے کا کام شروع کیا۔ ان کی زبان میں اتنا اثر تھا کہ جب غیر مسلموں میں جا کر تبلیغ کرتے تو وہ سحر زدہ ہو کر آپ کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیتے۔ بہت جلد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ چشت اور اس کے مضافات میں غیر مسلموں کا وجود ہی نہ رہا۔

ایک دن لوگوں نے آپ کی خدمت میں اس لیے حاضری دی کہ آپ کا عام مسلمانوں کی طرف سے شکریہ ادا کریں

کیونکہ چشت کی پوری غیر مسلم آبادی کو مسلمان کر لینا ایک انتہائی اہم واقعہ تھا لیکن آپ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھے۔ آپ کی تلاش شروع ہوئی تو آپ کے انتہائی قریبی مرید نے لوگوں سے کہا۔ ''تم سب انہیں بے سود تلاش کرتے ہو کیونکہ جب وہ زمین پر موجود ہی نہیں تو تم انہیں پاؤ گے کیسے؟''

لوگوں نے پوچھا۔ ''وہ زمین پر موجود نہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس وقت وہ زمین کے اوپر نہیں، اندر ہیں۔''

لوگوں نے اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا اور چیخیں مار کر رونے لگے۔ مرید نے کہا۔ ''اس میں رونے کی کیا بات ہے؟''

ایک شخص نے جواب دیا۔ ''تو بھی ان کا عجیب مرید ہے کہ ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ پیر و مرشد زمین کے اوپر موجود ہی نہیں اندر ہیں اور دوسری طرف یہ پوچھتا ہے کہ اس میں رونے کی کیا بات ہے؟''

مرید نے کہا۔ ''لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ پیر و مرشد رحلت فرما گئے۔ آؤ، میں تم لوگوں کی ان سے ملاقات کرا دوں۔''

مرید ان کو لے کر ایک کنویں کے پاس پہنچا اور کنویں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا اس میں جھانک کر تو دیکھنا۔''

لوگوں نے کنویں میں جھانک کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس میں ان کے پیر و مرشد الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ انہوں نے گھبرا کر مرید سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟ کنویں میں انہیں کس نے اور کیوں لٹکایا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''یہ کس کی مجال ہے، پیر و مرشد خود ہی یہ عمل فرماتے رہتے ہیں اور اس سے ان کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اپنے جسم اور نفس کو اذیتیں پہنچا کر متنبہ کرتے رہیں کہ خبردار جو گمراہی اختیار کی اور تجاوز سے کام لیا۔''

شام کو آپ نے اس مرید کو بہت ڈانٹا اور پوچھا۔ ''تو ان لوگوں کو کنویں کے پاس کیوں لے گیا تھا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! وہ سب آپ سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے۔''

آپ نے کہا۔ ''ان کی بے چینی اپنی جگہ، میں تو پوچھ رہا ہوں کہ تو انہیں کنویں کے پاس کیوں لے گیا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! وہ آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ میں اگر آپ کے پاس نہ لاتا تو وہ معلوم نہیں کس قسم کے شک و شبے میں گرفتار ہو جاتے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تیری اس حرکت کا جانتا ہے کیا اثر ہوا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''کیا اثر ہوا؟ مجھے نہیں معلوم۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میرے نفس نے سرکشی کی اور اس نے مجھے باور کرا دیا کہ اے محمد! جن لوگوں نے تجھے کنویں میں الٹا لٹکا دیکھ لیا ہے، ان پر تیری عبادت اور نفس کشی کا بڑا گہرا اور اچھا اثر پڑا ہوگا اور یہ بات میرے لیے تباہ کن ہے۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تیری یہ غلطیاں میرے حق میں وبال بن جایا کریں گی۔ خدا کے لیے ان سے بچ اور میری بربادی کے درپے نہ ہو۔''

☆☆☆

اب آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں میں شہزادگان تک شامل ہو چکے تھے۔ وہ آپ کے پاس حاضریاں دیتے اور نصیحتوں اور دعاؤں کی برکتیں لے کر واپس جاتے۔

ایک دن آپ دجلہ کے کنارے تشریف لے گئے۔ یہاں آپ نے نماز ادا کی اور اس کے بعد پھٹا ہوا خرقہ اپنے ہاتھ سے سینے لگے۔ آپ اس میں اتنے منہمک ہوئے کہ آنے جانے والوں پر نظریں تک نہ ڈال سکے۔ کچھ دیر بعد آپ کو محسوس ہوا کہ کسی شے کا آپ پر سایہ پڑ رہا ہے۔ آپ نے نظریں اٹھا کر اوپر جو دیکھا تو اپنے سامنے خلیفہ کے بیٹے اور اس کے خدمت گاروں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ان کے گھوڑے ان کے ساتھ تھے۔ شہزادے نے ان سے نظریں ملتے ہی سلام کیا۔ آپ نے جواب دیا اور پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟ کیسے آنا ہوا؟''

خلیفہ کے بیٹے نے جواب دیا۔ ''آپ کی قدم بوسی کو حاضر ہوا ہوں۔ اس ناچیز کو اپنے تبرکات میں سے کچھ عنایت فرمائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس عاجز کے پاس دولتِ دنیا تو ہے نہیں جو تمہیں پیش کی جائے اور دولتِ دنیا کی یوں بھی تمہیں کوئی کمی نہیں۔ خدا نے تیرے باپ کو حکومت عطا فرمائی ہے تو وہی سب کچھ گویا تجھے بھی مل گیا ہے۔''

ابنِ خلیفہ نے اصرار کیا۔ ''میں تو کچھ لیے بغیر جانے سے رہا۔ آیا ہوں تو کچھ لے کر ہی جاؤں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اچھا میں تجھے چند نصیحتیں کرتا ہوں۔ انہی کو میرے پاس سے لے جا اور کوشش کرتا رہ کہ۔۔ زندگی بھر ان پر عمل پیرا رہے اور اگر تو ان کے خلاف کرے گا تو اس کا وبال بھی تجھی پر رہے گا۔''

خلیفہ کے بیٹے نے کہا۔ ''حضرت! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو نصیحت فرمائیں گے میں اس پر زندگی بھر چلتا رہوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''شہزادے! رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ کسی بادشاہ کی سلطنت میں اگر کوئی بوڑھی عورت بھی ایک رات فاقے سے رہ جائے تو اسے قیامت کے دن اس بادشاہ کا دامن پکڑنے کا حق حاصل ہوگا۔ اللہ نے تم لوگوں کو بادشاہت عطا فرمائی ہے اور اس میں فقراء اور بے سہارا لوگ بھی رہتے ہیں تو تمہیں ایک لمحہ بھی غفلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل قیامت کے دن تمہیں شرمسار ہونا پڑے۔''

آپ کی نصیحتوں کا شہزادے نے یہ اثر لیا کہ شاید آپ اپنی مدد کے لیے اشارہ فرما رہے ہیں۔ اس نے کچھ نقد اور دوسری چیزیں تحفے کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کیں۔ آپ مسکرائے اور فرمایا۔ ''شہزادے! تجھ کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ہمارے خواجگان میں سے کسی نے بھی ان چیزوں کو قبول نہیں کیا پھر میں کس طرح قبول کر سکتا ہوں۔ میرے لیے فقر کی نعمت سلیمان کی دولت سے زیادہ بہتر ہے۔''

شہزادے نے عاجزی سے کہا۔ ''حضرت! میں نہایت عاجزی سے درخواست کر رہا ہوں کہ انہیں قبول فرمالیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''شہزادے! خدا کے بندوں کے لیے غیب کے خزانے کھلے رہتے ہیں۔ انہیں تمہارے عطیات کی ضرورت نہیں۔''

شہزادے نے پھر خوشامد کی۔ ''حضرت! آپ کو کمی ہو یا نہ ہو، یہ عطیات تو آپ کو قبول کرنا ہی پڑیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''شہزادے! ایک ایسی چیز پر تو کیوں مصر ہے جس کی مجھے ضرورت نہیں۔''

شہزادے نے عرض کیا۔ ''حضرت! مال و زر کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ مانا کہ آپ مستغنی ہیں مگر استغنا سے مال و زر کی اہمیت اور قدر و قیمت تو کم نہیں ہوتی۔''

آپ کو شہزادے کی سادگی اور بھولے پن پر ہنسی آگئی۔ آپ نے شہزادے کو اپنے پاس بٹھا لیا اور فرمایا۔ ''شہزادے! تو یہاں میرے پاس بیٹھ جا اور جو کچھ میں دکھاؤں اسے دیکھ۔''

شہزادہ آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ آپ نے شہزادے کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس کے بعد اس کے چہرے اور آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''خداوندا! میں نے جو کچھ دیکھا ہے اسے دوسروں کو بھی دکھا دے۔'' اس کے بعد آپ نے شہزادے سے فرمایا۔ ''ذرا دریا کی تہ میں دیکھنا کچھ نظر آرہا ہے؟''

شہزادے نے دجلہ کی سطح پر دیکھا، بولا۔ ''حضرت! مجھ کو تو دریا کی سطح نظر آرہی ہے، اس کی تہ بالکل نظر نہیں آرہی۔''

آپ نے زور دے کر فرمایا۔ ''شہزادے! میں دریا کی سطح کی بات نہیں کر رہا ہوں، تہ کی بات کر رہا ہوں۔ دجلہ کی تہ میں دیکھنے کی کوشش کر اور جو کچھ دکھائی دے اس سے مطلع کر۔''

شہزادے نے ایک بار پھر دجلہ کی سطح پر دیکھا تو اب سطح آب غائب ہو چکی تھی اور شفاف سطح کے نیچے دجلہ کی تہ میں دور تک سونے کے ذخائر نظر آرہے تھے۔ سونے کی ڈلیاں تلے اوپر تہ در تہ رکھی تھیں۔ شہزادہ اس ذخیرے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور حرص و طمع کے زیر اثر بولا۔ ''حضرت! یہاں تو سونا ہی سونا نظر آرہا ہے۔ کیا اس ذخیرے کو کسی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''شہزادے! تیرے پاس دولت اور مال و زر کی کوئی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود تو حرص و طمع کا شکار ہے۔ فقراء کو اس چیز سے محروم رکھا گیا ہے۔ جا اور فقر اور استغنا کی دولت مانگ تاکہ تجھے سب کچھ مل جائے کیونکہ کسی انسان کو اگر فقر اور استغنا کی دولت سے محروم کر دیا گیا ہے تو گویا اس کو ہر چیز سے محروم کر دیا گیا ہے۔''

شہزادہ حیران و پریشان دیکھتا اور سنتا رہا اور آخر آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ آپ نے اس کو چند نصیحتیں اور کیں اور وہ واپس چلا گیا۔

☆☆☆

آپ کی بہن کی عمر شادی کے لائق ہوگئی لیکن وہ شادی کے لیے نہیں تیار ہوئیں۔ ان کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت



میں گزرتا تھا۔ وہ اپنی معاش کے اخراجات چرخہ کات کر اور سوت بیچ کر پورا کرتی تھیں۔ محمد اکثر اشاروں کنایوں میں بہن کو شادی کا مشورہ دیتے رہتے تھے لیکن بہن شادی پر آمادہ ہی نہیں ہوتی تھیں۔

آخر ایک دن انہوں نے اپنی بہن کو اپنے سامنے بٹھایا اور کہا۔ ''بہن! اب تم شادی سے انکار نہ کرو۔ تمہاری کافی عمر ہو چکی ہے، آخر کب شادی کرو گی؟''

بہن نے جواب دیا۔ ''بھائی! آپ شادی پر اصرار نہ کیجیے کیونکہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

بھائی نے پوچھا۔ ''آخر کیوں؟ تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟''

بہن نے جواب دیا۔ ''میرا جی نہیں چاہتا۔ آپ اس پر مجبور نہ کیجیے۔''

بھائی نے کہا۔ ''میں تمہیں اس لیے مجبور کر رہا ہوں کہ یہ رسول ﷺ کی سنت ہے اور جب تم عبادت و ریاضت اور روزمرہ اعمال اور اشغال میں سنتِ رسول ﷺ ترک نہیں کرتیں تو اس سنت کو کیوں نظر انداز کر رہی ہو؟''

بہن نے جواب دیا۔ ''شادی سنت ہی تو ہے فرض تو نہیں۔ میں فرض چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہیں لاسکتی۔''

بھائی نے کہا۔ ''بہن، میں شادی پر اس لیے اصرار کر رہا ہوں کہ تمہارے بطن سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوگا جو اپنے عہد میں یکتا ہوگا، مادر زاد ولی اور یگانۂ روزگار عارف ہوگا۔''

بہن نے جواب دیا۔ ''میں سوچوں گی لیکن فی الحال شادی کے لیے آمادہ نہیں۔''

دونوں بھائی بہن ایک عرصے تک خاموش رہے اور کسی کی بھی ہمت نہ پڑی کہ اس موضوع کو دوبارہ چھیڑتا۔ بھائی نے یہ محسوس کر لیا کہ ان کی بہن سامنے آنے میں ہچکچاہٹ ظاہر کرتی رہتی ہے۔ بہن اپنی طرف یہ سوچ رہی تھی کہ بھائی کو بحث مباحثے میں شکست نہیں دی جاسکتی، اس لیے ان کی نظروں سے دور ہی رہنا چاہیے۔

ایک دن محمد نے خواب میں دیکھا، ان کے والد خواجہ احمد تشریف لائے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ ''بیٹے! تو نے خاموشی کیوں اختیار کر لی۔ اپنی بہن کو شادی پر مجبور کر، اب وہ چالیس سال کی ہو چکی ہے، اس کو شادی کر لینا چاہیے۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باوا جان! میں نے بڑی کوشش کی لیکن بہن شادی پر تیار ہی نہیں ہوئیں۔ آپ ہی بتائیے اب میں کیا کروں؟''

باپ نے کہا۔ ''بیٹے! جیسا کہ تو خود بھی اسے بتا چکا ہے کہ اس کے بطن سے ایک ولیِ کامل پیدا ہونے والا ہے۔ اس لیے اس کا شادی کرنا بے حد ضروری ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''باوا جان! میں ایک بار پھر کوشش کر دیکھتا ہوں، آپ بھی میری مدد کیجیے۔''

باپ نے کہا۔ ''میں اس سے بھی کہہ رہا ہوں، وہ شادی پر آمادہ ہو جائے گی۔''

آپ نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ''باوا جان! اب ایک بات کی اور فکر ہے اگر بہن نے شادی کے لیے آمادگی ظاہر کر دی تو بتائیے وہ شخص کہاں ہے جس سے بہن کی شادی کی جاسکتی ہے کیونکہ بہن کا شوہر بھی تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''بیٹے! تم اپنے کسی مرید کو چشت کے مغرب میں روانہ کر دو، راستے میں اس کو متعدد مواضع اور قصبے ملیں گے، وہ ان مواضع اور قصبات میں یہ معلوم کرتا جائے کہ اس میں محمد سمعان نامی کوئی ایسا درویش رہتا ہے، جس نے ابھی تک شادی نہیں کی اور وہ سید زادہ بھی ہو۔ بس جب یہ شخص مل جائے تو اس کو اسی مرید کے ذریعے بلوا لو۔ وہ آجائے گا، یہی تمہاری بہن کا ہونے والا شوہر ہے۔''

وہ شاید کچھ اور پوچھتے مگر اسی لمحے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ لیٹے لیٹے دیر تک اس خواب کی بابت سوچتے رہے پھر ایک دم بہن کا خیال آگیا۔ آپ نے بہن سے ملاقات کی اور پوچھا۔ ''بہن! تم نے اپنی شادی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟''

بہن نے جواب دیا۔ ''بھائی! آپ کی بات دوسری تھی لیکن میں والد مرحوم کی نافرمانی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے خواب میں مجھے تنبیہ کی ہے اور شادی کر لینے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے اب میں شادی کر لوں گی۔''

بھائی نے فرطِ خوشی سے بہن کی پیشانی چوم لی اور صبح ہوتے ہی انہوں نے محمد سمعان کے نام ایک خط لکھا۔

''اے محمد سمعان! میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے؟ لیکن والد مرحوم نے تیرا جو تعارف کرایا ہے اس سے میں اتنا واقف ہو چکا ہوں کہ تو ایک پرہیزگار اور عبادت گزار انسان ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تو مجھ سے واقف ہے یا نہیں؟ اگر نہیں واقف ہے تو میں تجھ سے یہ خواہش کروں گا کہ میرے پاس چلا آ اور مجھ سے ملاقات کر...... اور اگر تو مجھ سے واقف ہے اور تیرے دل

میں میری عزت و حرمت ہے تو پھر میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو جس حال میں بھی ہو، اسی حال میں میرے مرید کے ساتھ چلا آ۔ یہاں تک کہ اگر تو نے ایک جوتا پہن رکھا ہو تو دوسرا پہننے کی ضرورت نہیں، اسی ایک جوتے میں میرے پاس چلا آ۔''

مرید اسی وقت خط لے کر روانہ ہو گیا اور مواضع اور قصبات سے گزرتا ہوا ایک ایسے گاؤں میں پہنچا جو مذکورہ شخص کا وطن تھا۔ مرید سیدھا اس شخص کے پاس پہنچ گیا اور خط اسے دے دیا۔ اس شخص نے یہ خط اس حال میں وصول کیا کہ کہیں جانے کی تیاری میں تھا اور واقعی ایک جوتا پہن رکھا تھا اور دوسرا پہننے والا تھا۔ اس نے خط پڑھا تو مسکرا دیا اور کہا۔ ''میں ان بدقسمتوں میں سے نہیں ہوں جو اس بزرگ ذات سے واقف نہیں۔ میں خواجہ احمد کے ان عدیم المثال بزرگ صاحبزادے کو اچھی طرح جانتا ہوں اور پھر یہ کہ مجھے کسی اور سے یہ حکم مل چکا ہے کہ میں خواجہ محمد سے چشت پہنچ کر فوراً ملاقات کروں۔ میں تو خود ہی حاضر ہونے والا تھا۔''

اس کے بعد انہوں نے دوسرا جوتا نہیں پہنا اور جس حال میں تھے، اسی حال میں چشت روانہ ہو گئے۔ شب و روز سفر کرتے ہوئے جب یہ خواجہ محمد کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے محمد سمعان کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا۔ ''محمد سمعان! کیا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کیوں بلایا ہے؟''

محمد سمعان نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں واقف تو ہوں لیکن اس کا اظہار اپنی زبان سے نہیں کر سکتا۔''

خواجہ محمد نے کہا۔ ''اے سیدزادے! میں اپنی بہن کی شادی تجھ سے کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ میرے والد مرحوم نے مجھے اس کی ہدایت کی ہے۔''

محمد سمعان نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں جانتا تھا کیونکہ حضرت خواجہ احمد نے مجھے بھی ہدایت کی تھی کہ میں فوراً آپ کے پاس پہنچوں۔''

آپ نے بہن کو مطلع کر دیا۔ ''تیرا ہونے والا شوہر آ چکا ہے۔''

بہن نے شرما کر جواب دیا۔ ''بھائی! میں ہتھیار ڈال چکی ہوں۔''

بھائی نے بہن کی شادی محمد سمعان سے کر دی اور سمعان بھی انہی کے ساتھ رہنے لگے۔

☆☆☆

اس دوران جبکہ خواجہ محمد کی عمر ستر سال ہو چکی تھی، انہیں معلوم ہوا کہ غزنی کا حکمراں محمود غزنوی ہندوستان کے مشہور بت کدے سومنات پر حملہ کرنے جا رہا ہے۔ آپ بھی غزنی چلے گئے اور سلطان محمود کو اپنی مہم میں جب آپ کی شمولیت کا علم ہوا تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ دوسری طرف اسے دوسرے مشہور صوفی ابوالحسن خرقانی کا خرقہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔

سومنات کے سامنے جنگ کا آغاز ہوا تو آپ پہلے دن جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ سارے دن کی جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان قدرے پسپا ہو کر جنگل کی طرف ہٹ گئے۔ دوسرے دن آپ بھی جنگ میں شامل ہو گئے اور بہت خوفناک رن پڑا۔ آپ نے میدانِ جنگ ہی سے اپنے مریدِ خاص محمد کاکو، کو آواز دی۔ ''محمد کاکو! تو کیا کر رہا ہے؟ میری مدد کو پہنچ''

محمد کاکو ان دنوں چشت میں تھے اور آرام کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد کی آواز سنی تو وہ فوراً اٹھے اور ایک لکڑی لے کر دیوار پر بے تحاشا مارنا شروع کر دیا لیکن سومنات کے محاذ پر لوگوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک درویش خواجہ محمد کے پہلو بہ پہلو جنگ میں مشغول ہے اور خواجہ محمد اس کو بار بار ہدایت دے رہے ہیں۔ ''محمد کاکو! ادھر، اس محاذ کو سنبھالنا، ادھر بڑھو، دیکھو وہ کفار بڑھے چلے آ رہے ہیں، انہیں روکو۔''

محمد کاکو آپ کے حکم اور ہدایت پر عمل شروع کر دیتے۔

چشت میں لوگوں نے محمد کاکو کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہا ہے اور وہ بڑے جوش و خروش سے دیوار پر لکڑی مارے جا رہے ہیں۔

اس جنگ میں محمود غزنوی نے ہندوؤں کو شکست دے دی اور اس کا برملا اعتراف کیا کہ اس فتح میں خواجہ محمد کا روحانی تعاون اگر حاصل نہ ہوتا تو بڑی مشکل پیش آتی۔ اس نے آپ کی خدمت میں ارادت مندانہ حاضری دی اور دعا کی استدعا کی۔

آپ اپنے محبوب مرید محمد کاکو سے بہت خوش تھے اور چشت واپس پہنچ کر آپ نے ان کی بڑی تعریف کی۔ آپ کے ایک دوسرے مریدِ خاص استاد مردان کو رشک ہوا اور عرض کیا۔ ''حضرت! کچھ مجھ پر بھی نوازش ہو جائے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تو نوازش چاہتا ہے تو میں از راہِ نوازش تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو اپنے وطن سنجان خواف واپس جا۔''

مرید استاد مردان آزردہ خاطر ہوئے اور مایوسی سے کہا۔ ''حضرت! یہ کیسی نوازش ہے کہ آپ مجھ کو چشت سے نکالے

دے رہے ہیں۔ میں تو وطن واپس نہیں جاؤں گا۔''

آپ نے زور دیا۔ ''استاد مروان! تو نے نوازش کی خواہش کی تھی، میں نے کر دی۔ اب پس و پیش نہ کر چلا جا اپنے گھر۔ لوگ تو وطن جانے کی خواہش میں دیوانے ہو جایا کرتے ہیں، تو کیسا شخص ہے کہ اپنے وطن سے گریز کر رہا ہے؟''

استاد مروان نے عرض کیا۔ ''حضرت! صاف بات تو یہ ہے کہ میں آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔''

آپ نے تسلی دی۔ ''تو اپنے وطن واپس تو جا۔ میں تجھ سے جدا نہیں ہوں گا۔''

استاد مروان نے پھر عرض کیا۔ ''حضرت! سنجان خواف میں چشت کی ہوائیں نہیں ہوں گی۔ وہاں چشت کی روحانی برکت کہاں ملے گی۔''

آپ نے کہا۔ ''تو کیسا مرید ہے کہ تیرا پیر جو حکم دے رہا ہے تو اس کی تعمیل میں تامل اور ہچر مچر سے کام لے رہا ہے۔''

استاد مروان نے شرمساری سے جواب دیا۔ ''پیر و مرشد! میری یہ مجال نہیں کہ میں آپ کی حکم عدولی کروں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''پھر وہی بات، میں تجھے اپنے آپ سے دور کب کر رہا ہوں؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! جب میں اپنے وطن چلا جاؤں گا تو آپ سے خود بخود جدا ہو جاؤں گا۔''

آپ نے تبسم ہو کر فرمایا۔ ''میرے عزیز مرید! تو میرا مریدِ خاص ہے اور میں خود بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ تو مجھ سے جدا اور چشت سے اوجھل ہو جائے۔''

استاد مروان نے جواب دیا۔ ''حضرت! یہی تو میں کہتا ہوں۔ میں آپ کی مفارقت گوارا نہیں کر سکتا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''استاد مروان! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کو غور سے سن۔ میں نے یہ انتظام کر دیا ہے کہ جب تو یہاں سے چلا جائے گا تو، تو اپنے وطن سنجان خواف میں رہ یا کہیں اور...... میں اور چشت ہمیشہ تیرے سامنے رہیں گے۔''

استاد مروان نے حیرت سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ کس طرح؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ اس طرح کہ جب تو اپنے وطن میں مجھ سے ملنا اور دیکھنا چاہے گا اور چشت کی یاد ستائے گی تو میں چشت سمیت تیرے سامنے موجود ہوں گا اور ہماری مفارقت کا تیرے دل میں خیال تک نہیں آئے گا۔''

استاد مروان نے قدرے پس و پیش سے پوچھا۔ ''تو میں اپنے وطن چلا جاؤں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تجھے حکم جو دے رہا ہوں اور تیرے حق میں میری نوازش ہے کہ میں محض تیری خاطر خدا سے یہ درخواست کر چکا ہوں کہ وہ سنجان خواف میں، جب تو چاہے چشت اور میرا دیدار کرا دیا کرے چنانچہ میری یہ درخواست منظور ہوئی اور میرے رب نے مجھ کو یہ بشارت پہنچائی کہ استاد مروان کو یہ اختیار دیا گیا کہ اپنے وطن میں میرا اور چشت کا دیدار کر لیا کریں۔''

استاد مروان نے آپ کی باتوں پر یقین کیا اور اپنے وطن چلے گئے۔

جاتے ہی انہوں نے چشت اور اپنے پیر و مرشد خواجہ محمد کا خیال کیا اور انہیں دیکھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے سامنے چشت بھی موجود تھا اور پیر و مرشد خواجہ محمد بھی اور آپ زیرِ لب فرما رہے ہیں کہ اے استاد مروان! تجھے اب میری باتوں کا یقین آ گیا؟

مرید نے عاجزی و انکساری سے جواب دیا۔ ''حضرت! یقین تو مجھے پہلے بھی تھا لیکن اس کا عملی مشاہدہ اب کیا۔ میں آپ کا شکریہ کس زبان سے اور کس طرح ادا کروں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''شکریے کی بات کوئی نہیں۔ میں نے تجھ سے جو وعدہ کیا، اس کو پورا کر دیا۔''

آپ کی عمر کا پیمانہ لبریز ہونے کو تھا۔ آپ نے اپنے تین مریدوں کو خلافت بخشی۔ ان میں دو کے نام وہی ہیں جن کا ذکر پیچھے کیا جا چکا ہے۔ محمد کاکو اور استاد مروان...... تیسرے خلیفہ بہن کے صاحبزادے ابو یوسف تھے۔

آپ کا وصال 4 ربیع الثانی 411 ہجری میں ہوا اور چشت ہی میں آخری رسوم ادا کی گئیں۔

ماخذات

اذکار ابرار، محمد غوثی شطاری۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع۔ بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن۔ خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین برنی۔ حضرت بو علی قلندر، اقبال صلاح الدین





ضیا تسنیم بلگرامی



کمال الدین علی شاہ نامی ایک بزرگ مکہ معظمہ سے خوارزم پہنچے اور یہاں سے اکتا کر ملتان چلے آئے۔ یہ خاندان قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ ملتان کے لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی آمد سے کچھ عرصے پہلے منگول فاتح چنگیز خاں صحرائے گوبی سے نکل کر چین، ماوراالنہر اور خوارزم کے بسنے والوں کو خاک اور خون اور ان کی تہذیبی علامتوں کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرچکا تھا۔ جو لوگ اس کی سفاکی سے بچ گئے۔ انھوں نے اپنی جان اور عزت و آبرو بچانے کے لیے دور دراز علاقوں کا رُخ کیا۔ انھی لوگوں میں مولانا حسام الدین نامی ترمذ کے ایک بزرگ بھی تھے جو ماوراالنہر سے بھاگ کر ملتان کے قلعہ کوٹ کروڑ میں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ دو مختلف سمتوں سے آنے والے خاندانوں میں سے ترمذی خاندان میں ایک لڑکی تھی اور مکہ معظمہ سے آنے والے قریشی خاندان میں شیخ وجیہہ الدین نامی لڑکا تھا۔ دونوں خاندانوں نے ایک دوسرے کو بہت پسند کیا اور قریشی باپ نے اپنے بیٹے کی شادی ترمذی خاندان میں کردی۔ اس رشتۂ مناکحت سے ۵۷۸ھ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا پیدا ہوئے۔

ابھی بہاء الدین زکریا بارہ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ انھوں نے باپ کی کمی اور غم کو سیر و سیاحت سے دُور کیا پہلے خراسان گئے پھر بخارا چلے گئے۔ ابھی یہ اپنی عمر کے پندرہ برس کو بھی نہ پہنچے تھے کہ بڑے بڑے علما ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنے لگے۔ یہاں سے رخصت ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے اور دل کی گہرائیوں اور جذبات کی شدت سے مناسکِ حج بجالائے ——— یہیں شیخ کمال الدین یمنی نامی بزرگ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ بزرگ یہاں حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ یہاں حضرت زکریا ملتانی نے پچاس سال سے زائد کا عرصہ علم حدیث کا درس لینے میں گزار دیا۔ اور ساتھ ہی گرد و پیش مدفون اولیاء اللہ، انبیائے کرام اور زندہ مشائخ کی زیارت سے بھی طمانیتِ قلب حاصل کرتے رہے۔

مکہ معظمہ کے بعد آپ بغداد تشریف لے گئے، وہاں شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ شہاب الدین سہروردی اپنی نوعمری ہی میں تصوّف پر عوارف المعارف نامی شاہکار کتاب لکھ چکے تھے۔ شیخ نے زکریا ملتانیؒ کو ایک نظر دیکھا اور ان میں جو کچھ بھی تھا کشف سے شیخ پر ظاہر ہوگیا۔ شیخ الشیوخ سہروردیؒ کے آس پاس بیسیوں صاحبانِ حال و قال موجود تھے لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا حضرت زکریا ملتانیؒ سے موازنہ کیا جاسکتا۔

شیخ سہروردیؒ کی خدمت میں رہتے ہوئے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ حضرت زکریا ملتانی عشا کی نماز ادا کر کے حجرے سے باہر نکلے تو تاروں بھرے آسمان کو دیکھ کر خالقِ کائنات کی عظمت سے سینے کو شق ہوتا محسوس کیا۔ مشرق میں اُفق سے ذرا اوپر زرد چاند جس کا کچھ حصہ جھڑا ہوا تھا سر اُٹھائے دنیا کو دیکھ رہا تھا اور دنیا کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں منہ چھپائے سونے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ حضرت زکریا ملتانی دیر تک دل ہی دل میں خالقِ ارض و سما کی مدح و ثنا میں مصروف رہے۔ پھر تہجد کا وقت آگیا۔ آپ نے تہجد میں رات کا بیشتر حصہ گزار دیا۔ فجر سے ایک گھنٹے پہلے بستر پر پہنچے۔ نیند نے غلبہ کیا۔ سوتے ہی جو منظر سامنے آیا اور پھر بعد میں جب اس کی تعبیر سامنے آئی تو حضرت سہروردیؒ کی بارگاہ کے بہت سے بزرگ رشک و حسد کی آگ میں جل بھن گئے۔

آپ نے خواب میں دیکھا، ایک نہایت منوّر اور شان دار مکان میں آپ داخل ہوئے ہیں، آپ نے وہاں حضرت رسُولِ مقبولؐ کو موجود دیکھا۔ رسُولِ مقبولؐ کے روبرو حضرت شیخ الشیوخ سہروردیؒ نظریں جھکائے ادب سے کھڑے ہوئے تھے۔ رسُولِ مقبولؐ کے داہنی طرف ایک الگنی بندھی ہوئی تھی، اور اس الگنی پر کئی خرقے لٹکے ہوئے تھے۔

رسول مقبولؐ نے حضرت شیخ سہروردیؒ کو آواز دی "شہاب الدین! ادھر ہمارے قریب آؤ۔!"

شہاب الدین سہروردیؒ نہایت ادب سے چل کر رسول اللہؐ کے قریب پہنچ گئے۔

رسول اللہؐ نے دریافت کیا۔ "بہاء الدین زکریا کہاں ہے ؟"

شہاب الدین نے جواب دیا۔ "حضور! اپنے حجرے میں ہوگا!"

آپؐ نے حکم دیا۔ "اُسے بُلا کر یہاں لاؤ، ہمارے رُوبرو!"

حضرت سہروردیؒ حکم کی تعمیل میں، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر، اُلٹے قدموں چل کر مکان سے باہر نکلے اور زکریا ملتانی کو ساتھ لے کر رسول اللہؐ کے پاس دوبارہ پہنچ گئے۔ حضرت سہروردیؒ نے زکریا کو حکم دیا "زکریا! یہ بارگاہِ نبویؐ ہے، ادب سے جھک کر تعظیم بجا لاؤ!"

زکریا فرطِ عقیدت اور افراطِ جوش سے رسول اللہؐ کے رُوبرو جھک گئے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا "زکریا! اس کی کوئی ضرورت نہیں، سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

جب زکریا سیدھے ہو گئے تو آپؐ نے حضرت شیخ سہروردیؒ سے فرمایا "شہاب الدین! زکریا کو وہ خرقہ پہناؤ جو الگنی کے انتہائی سرے پر سب سے قیمتی نظر آتا ہے۔"

شہاب الدینؒ میں انکار کی کیا مجال تھی، وہ قیمتی خرقہ الگنی سے اُتار کر حضرت زکریا ملتانی کو پہنا دیا۔

اس کے بعد حضرت زکریا کی آنکھ کھل گئی تو ایسا لگا جیسے پورا حجرہ ناقابلِ بیان اور ناقابلِ تعریف خوشبو سے مہک رہا ہے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہاں ابھی ابھی رسول اللہؐ ضرور تشریف فرما رہے ہوں گے اور یہ خوشبو اور یہ مہک انھی کے وجودِ اطہر سے خارج ہوئی ہو گی۔

خواب سے بیدار ہوئے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مسجد سے اللہ اکبر کی آواز آنے لگی۔

فجر کی نماز پڑھ کر ابھی حضرت زکریاؒ بیٹھے ہی تھے کہ حضرت شہاب الدین سہروردی کے ایک مُرید نے ادب سے عرض کیا کہ "حضرت آپ کو شیخ یاد فرما رہے ہیں!"

حضرت زکریا ملتانی جب اُس خاص مکان میں تشریف لے گئے جہاں شہاب الدین سہروردی اُن کا انتظار فرما رہے تھے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ وہی مکان تھا جہاں رات کے پچھلے پہر رسولِ مقبولؐ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی طرح ایک طرف الگنی پر مختلف نوع کے خرقے لٹکے ہوئے تھے اور انھی میں ایک طرف کنارے پر وہ خرقہ بھی موجود تھا جو رات کو حضرت رسولِ مقبولؐ نے انھیں عطا فرمایا تھا۔

حضرت سہروردیؒ زکریا ملتانی کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا "بابا بہاء الدین! تم کہاں ہو؟ ہم تو دیر سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔"

حضرت زکریا ملتانی نے فرمایا "حضرت! یہ ناچیز تو حضور کا پیام پاتے ہی چل پڑا تھا۔ بس آنے میں جتنی دیر بھی لگی ہو۔"

حضرت شہاب الدین سہروردی نے بڑھ کر الگنی سے خواب کا معروف خرقہ الگنی سے اُتار لیا اور پھر حضرت زکریا ملتانی کو پہناتے ہوئے فرمایا "بابا بہاء الدین!" پھر الگنی پر لٹکے ہوئے خرقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سارے خرقے حضرت رسولِ مقبولؐ کے ہیں اور میری حیثیت ایک واسطے کی ہے۔ تمھارے لیے رسولِ مقبولؐ نے جو حکم صادر فرمایا تھا اس کی تعمیل میں یہ خرقہ   پہنا دیا گیا ہے!"

آس پاس وہ مرید بھی موجود تھے جنھوں نے حضرت شیخ الشیوخ کی خدمت اور اللہ کی اطاعت و ریاضت میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزار دیا تھا اور جو ان خرقوں کے طالب تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ بہاء الدین زکریا ملتانی نامی ایک ایسے مُسافر کو ایک خصوصی خرقہ بارگاہِ مرشد سے عطا ہو گیا ہے جسے شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں رہتے ہوئے صرف سترہ دن گزرے ہیں، تو رشک و حسد کی آگ نے انھیں مشتعل کر دیا۔ انھوں نے بیک زبان شکایتاً کہا۔ "حضرت! گستاخی معاف! ہم خاکسار، حضرت کے درِ مرشدی کے ناصیہ فرسا کچھ پوچھنے کی جسارت کر سکتے ہیں ؟"

حضرت سہروردیؒ نے مشفقانہ انداز میں انھیں دیکھا اور حرفِ شکایت زبان پر لانے کی اجازت دے دی۔

شاکی مریدوں نے عرض کیا۔ "حضرت! ہم آپ کے خادم اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے کے باوجود اب تک خرقوں کے عطیات سے محروم ہیں اور ایک وہ شخص جسے اس بارگاہ میں آئے ابھی سترہ ہی دن گزرے ہیں خرقۂ خصوصی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر اس میں کیا رمز ہے ؟"

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ مسکرائے اور جواباً فرمایا۔ "لوگو! تمھاری مثال اُس لکڑی جیسی ہے جس میں پانی کی تری پائی جاتی ہے اور جسے آگ بمشکل ہی پکڑ سکتی ہے لیکن یہ ہندی فقیر خشک لکڑی کی طرح ہے جسے آگ فوراً پکڑ لیتی ہے۔ اس کے دل میں اللہ کے عشق اور رسولؐ کی محبت کا سوز پایا جاتا ہے اسی لیے اس کو یہ خرقہ عطا ہوا۔" اس کے بعد آپ نے زکریا ملتانی کو حکم دیا۔ "بابا بہاء الدین! تم ملتان واپس جاؤ کیونکہ اس ملک کے باشندوں کی ہدایت تم پر فرض کی گئی ہے، وہ تمھارے منتظر ہیں۔"

حضرت زکریا ملتانی سے ذرا فاصلے پر شہاب الدین سہروردیؒ کے بھانجے شیخ ابراہیم عراقی بیٹھے ہوئے تھے۔ عراقی اپنے سوز دروں کا اظہار شاعری کے ذریعے کیا کرتے تھے۔ حضرت زکریا ملتانیؒ اُن کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ عراقی بھی صوفیوں کی وضع قطع میں شہاب الدین سہروردی کی مجلس میں موجود رہا کرتے تھے۔ حضرت زکریا ملتانی کی خواہش تھی کہ عراقی بھی اُن کے شریک سفر ہوں لیکن زبان سے حرف مدعا عرض نہ کر سکے اور عراقی کو بغداد ہی میں چھوڑا خود ملتان روانہ ہوگئے

کسی نے حضرت شہاب الدین سہروردی سے شکایت کی کہ "حضرت! آپ کا بھانجا عراقی ایک نعل بند کے لڑکے پر عاشق ہو گیا ہے اور وقت کا بیشتر حصہ اس کے روبرو بیٹھ کر گزار دیتا ہے!"

حضرت سہروردی نے عراقی کو اپنے روبرو طلب کیا اور ڈانٹتے ہوئے کہا "عراقی! تو کس حال میں ہے کیا تو نہیں جانتا کہ اہل نظر تجھ پر حرف زن ہیں۔ کیا تجھے دوئی بہت زیادہ پسند ہے؟"

عراقی نے انکسار سے عرض کیا۔ "حضرت! وہ دوسرا کہاں ہے جس کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں؟"

حضرت سہروردی دل میں شرمندہ سے ہو گئے اور اپنی زبان بند کر لی مدرسے میں طلبہ کا ہجوم تھا۔ عراقی انھیں پڑھا رہے تھے۔ باری باری طالب علم اُٹھتے اور عراقی سے کچھ پوچھ کر اپنی جگہ پر واپس چلے جاتے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ چند آزاد رو اور قلندرانہ مزاج آدمی اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کے چہرے داڑھی مونچھ اور ابرو کے بالوں سے پاک تھے، ان کی عجیب وضع قطع تھی، انھی میں ایک نہایت خوبصورت جوان بھی تھا۔ عراقی اسے دیکھتے ہی تلملا گئے، درس و تدریس کا سلسلہ تو موقوف ہوا اور عراقی ان کی خاطر تواضع میں لگ گئے۔ یہ آزاد منش کئی دن عراقی کے مہمان رہے۔ آخر ایک دن انھوں نے اجازت چاہی اور خراسان روانہ ہو گئے۔ عراقی نے جیسے تیسے تین دن اس حسین جوان کی مفارقت میں گزار دیے لیکن جب جُدائی ناقابل برداشت ہو گئی تو خود بھی ان قلندروں کی تلاش میں بغداد سے نکل کھڑے ہوئے اور آخر انھیں پا بھی لیا اور ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ خود بھی ان کے ساتھ ساتھ رہنا اور گھومنا پھرنا چاہتے ہیں۔

کسی قلندر نے عرض کیا۔ "جناب! آپ ٹھیرے مرد بزرگ۔ آپ کی لوگ بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ ہم قلندر لوگ چار ابرو کا صفایا کرنے والے، ہمارا آپ کا ساتھ کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہم میں تو وہ شامل ہو سکتا ہے جو ہماری ہی طرح داڑھی مونچھ اور ابروؤں کا صفایا کرا سکے

عراقی نے بے پس و پیش جواب دیا۔ "جناب! آپ کیوں فکر کرتے ہیں، ہم چار ابرو کی صفائی پر بھی راضی ہیں۔"

اس کے بعد عراقی نے وہی کیا، جس کا قلندروں کی جانب سے اظہار ہوا تھا۔ داڑھی مونچھ اور ابروؤں کا صفایا کرا دیا اور قلندروں جیسی شکل بنا کر اُن کے ہمسفر ہو گئے۔ اتفاق کی بات یہ لوگ سیر و تفریح کرتے ہوئے ملتان میں داخل ہو گئے اور یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ یہ سب سے پہلے حضرت بہاء الدین زکریا کی خانقاہ میں پہنچے۔ عراقی کا خیال تھا کہ حضرت زکریا ملتانی اس حلیے اور لباس میں پہچان نہیں سکیں گے لیکن حضرت زکریا نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا اور اس حال میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان قلندروں میں کسی حسین و جمیل قلندر پر عراقی عاشق ہو گئے ہیں تو انھیں بہت دُکھ ہوا اور انھوں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ عراقی کے دل سے یہ کثافت نکال پھینکیں گے۔

حضرت زکریا ملتانیؒ ابھی گمراہ عراقی سے کوئی بات بھی نہ کر سکے تھے کہ پتہ چلا عراقی قلندروں کی جماعت میں شامل ہو کر ملتان چھوڑ گئے۔

حضرت زکریا ملتانی کو اس خبر سے دُکھ پہنچا اور انھوں نے خدا سے دعا کی۔ "بارِ الٰہا! تو عراقی کو اس عاجز کے پاس واپس فرما۔"

ابھی یہ دعا ختم ہی ہوئی تھی کہ آسمان گرد و غبار میں چھپ گیا، دن میں اتنی تاریکی پھیلی کہ لوگ سمجھے شاید قیامت آگئی ہے۔ عراقی کے ساتھی قلندروں نے معلوم نہیں کیوں یہ سوچا کہ ملتان واپس چلا جائے۔ یہ لوگ افتاں و خیزاں حضرت زکریا ملتانیؒ کی بارگاہ میں داخل ہوئے۔ انھی میں عراقی بھی شامل تھے۔

حضرت زکریا ملتانی نے اس خوبصورت قلندر کو دیکھا جس پر عراقی سو جان سے فدا ہو چکے تھے۔ تنہائی میں عراقی کو لے جا کر سوال کیا۔ "عراقی یہ تجھے کیا ہو گیا ہے، کیا تیری شرم بالکل جاتی رہی؟"

عراقی نے ادب سے عرض کیا۔ "حضرت آپ تو دل کی اصل کیفیت سے واقف ہیں پھر بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں واقعی اس قلندر کے حسن و جمال میں کھو گیا ہوں؟ ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے لیکن اب تو تُو ہوش میں آجا۔"

عراقی نے جواب دیا۔ "حضرت! آپ بلاوجہ لوگوں کو شک میں مبتلا نہ کریں جو حقیقت ہے اس کا اظہار فرما دیں۔"

زکریا ملتانی نے کچھ سوچتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "عراقی ہم نے تو تجھے کسی نہ کسی طرح یہاں تک کھینچ بلایا۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو یہاں تک اپنے ارادوں سے پہنچا ہے؟ ہرگز نہیں، تجھے تو ہم نے کسی بہانے سے

یہاں تک بُلایا ہے !"

اس کے بعد حضرت زکریا نے عراقی کو سینے سے لگا لیا، سینے کا سینے سے ملنا تھا کہ عراقی کا سینہ پاک صاف ہو گیا، دوئی مٹ گئی اور اللہ کی محبّت نے جگہ بنالی۔

عراقی مستقلاً یہیں رہ پڑے۔ یہیں انھیں ایک حجرہ رہنے کے لیے بھی عطا ہوا۔ حضرت زکریا ملتانی اُن کی روحانی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے لگے۔ پھر عراقی کے حال پر حضرت زکریا مُلتانی کی نوازشیں یہاں تک بڑھیں کہ حضرت زکریا نے اپنی ایک لڑکی کی شادی عراقی سے کر دی۔

عراقی شاعری کرتے اور اطاعت و ریاضت میں لگے رہتے۔

لاہور میں ہندوستان کا فرماں روا قطب الدین ایبک چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سمیت زمین پر گرا اور انتقال کر گیا۔ اس کی وصیت کے بموجب شمس الدین التمش ہندوستان کا فرماں روا بن گیا۔ مُلتان میں مرحوم بادشاہ قطب الدین ایبک کا داماد ناصر الدین قباچہ خود کو اس منصب کا سب سے بڑا حقدار سمجھتا تھا۔ اُس نے التمش کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مُلتان کا قاضی شرف الدین اصفہانی اور حضرت زکریا ملتانی دونوں ہی ناصر الدین قباچہ کے مخالف تھے۔ دونوں نے التمش کو علیحدہ علیحدہ خط لکھے اور اس میں اس بات کا بطورِ خاص ذکر کر دیا کہ قباچہ کو جلد از جلد اس کی حُکم عدولی اور بغاوت کی سزا ملنی چاہیے۔

اتفاق کی بات کہ یہ دونوں خطوط پکڑے گئے اور قباچہ نے دونوں خطوں کے لکھنے والوں کو اپنے دربار میں طلب کر لیا۔ اُس نے زکریا مُلتانی کو تو اپنے پہلو میں بٹھایا اور قاضی اصفہانی کو برابر بٹھا لیا۔ اُس وقت مارے غصّے کے اُس کا بُرا حال تھا۔ اُس نے دونوں خطوط نکالے اور حضرت زکریا کا خط اُن کے حوالے کیا اور قاضی اصفہانی کا خط اُن کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر قاضی صاحب کو رعب دار آواز میں حکم دیا۔ "خط بآوازِ بلند پڑھا جائے۔"

قباچہ کے سامنے دُور تک درباری کھڑے ہوئے تھے اور اُس کے دائیں بائیں شمشیر زن اور تلوار باز تلواریں سونتے تیار تھے۔

قباچہ نے قاضی اصفہانی کو دوبارہ حکم دیا۔ "خط سنایا جائے۔"

قاضی اصفہانی نے خوفزدہ اور کپکپائی آواز میں اپنا خط پڑھنا شروع کیا۔

"سلطان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ملتان کا حاکم ناصر الدین قباچہ، اُن کے خلاف سازشیں کر رہا ہے اور فوجی قوت میں محض اس لیے اضافہ کر رہا ہے کہ سُلطان پر حملہ آور ہو کر اسے تختِ دہلی سے دستبردار کر دے۔ قباچہ خود کو قطب الدین ایبک مرحوم سلطان کا داماد ہونے کے سبب ہند کی حکومت کا جائز مستحق سمجھتا ہے۔ قباچہ ملتان میں نیکیوں کے نفوذ اور برائیوں کے سدِّباب میں نہ صرف ناکام رہا ہے بلکہ اس کے زیرِ سایہ برائیاں پرورش پا رہی ہیں اور نیکیاں دم توڑ رہی ہیں۔"

قباچہ نے مشتعل ہو کر ڈانٹ دیا۔ "بس کر نمک حرام قاضی! اور اب اپنے انجام کے لیے تیار ہو جا!"

قاضی نے جلاّدوں کی طرف دیکھا جو ناصر الدین قباچہ پر کنکھیوں سے نظریں جمائے کسی حکم کے منتظر تھے۔ قباچہ نے سیاہ کپڑے والے، چھوٹی داڑھی اور سانولی رنگت جلاّد کو حکم دیا۔ "تعمیل برائے کیفر کردار!"

جلاّد کا شمشیر والا ہاتھ بلند ہوا، قاضی نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور تلوار کی ضرب سے بچنے کے لیے اعضا کے خودکار نظام کے ماتحت، مدافعت کے انداز میں اُن کی گردن ایک طرف جُھک گئی لیکن اُسی لمحے جلاّد کی تلوار گدّی سے گزر کر حلق سے پار ہو گئی، دھم کی آواز سے جسم فرش پر گر کر پھڑکنے لگا اور سر لڑھک کر اس کے پھڑکتے جسم سے ٹکرا کر دُور جا گرا۔ خون کے فوّارے نے فرش رنگین کر دیا۔

چاپلوس درباریوں نے بیک آواز شور کیا۔ "فنا فی النار سقر!"

اب حضرت زکریا ملتانی کی باری تھی۔ قاضی کی طرف سے فارغ ہو کر قباچہ اُن کی طرف متوجہ ہوا اور پہلے جیسے دُرشت لہجے میں انھیں مخاطب کیا۔ "اور تم نے بھی قطب الدین ایبک کے غلام اور ہند کے تاج و تخت کے غاصب شمس الدین التمش کو اسی قسم کا ایک خط اپنی تحریر میں روانہ کیا تھا؟"

حضرت زکریاؒ نے بے خوف آواز میں جواب دیا۔ "ہاں ہم نے بھی لکھا تھا۔"

قباچہ نے حضرت زکریاؒ کا خط ان کی طرف بڑھا دیا اور حکم دیا۔ "اسے بآوازِ بلند پڑھ کر سب کو سناؤ!"

حضرت زکریا ملتانیؒ نے قلندرانہ شان سے جواب دیا۔ "تو اسے کیوں اپنے درباریوں کے روبرو پڑھوانا چاہتا ہے۔ کیا تجھے اپنے انجام کا علم نہیں، کیا تو چاہتا ہے کہ ہم تجھے تیرے عبرت ناک انجام سے ابھی وقت مطلع کر دیں۔" پھر آپ نے درباریوں اور جلاّدوں کی طرف دیکھا، وہ بھی اس عظیم ہستی کے پیرو یا معتقد تھے اور اُن کے دلوں میں ناصر الدین قباچہ کے خلاف نفرت کی مشعلیں جل اٹھی تھیں۔ حضرت زکریا مُلتانی نے فرمایا۔ "لوگو! قباچہ کہتا ہے کہ ہم اپنا وہ خط جو ہندوستان کے ولی بادشاہ شمس الدین التمش کو قباچہ کے خلاف لکھا تھا، پڑھ کر سُنا دیں، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اس

خط کے سنانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ خط ہم نے ہی لکھا تھا اور قباچہ کے خلاف لکھا تھا اور اس میں قاضی اصفہانی کے خط سے زیادہ تلخ اور ناقابلِ برداشت باتیں لکھی گئی ہیں، قباچہ میں اگر ہمت ہے تو وہی حکم جو قاضی مظلوم کے حق میں چند لمحے پہلے صادر ہوا تھا، ہمارے لیے بھی صادر کر دے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ ایسا نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر قباچہ خواہش کرے تو ہم ابھی اسی وقت اس کے بھیانک انجام کا نوشتۂ تقدیر پڑھ کر سُنا سکتے ہیں!"

قباچہ خوفزدہ ہو کر حضرت زکریا ملتانی کو دیکھنے لگا۔ اُس نے مرتعش آواز میں دریافت کیا۔ "حضرت! کیا آپ کو ہمارے مستقبل کا علم ہے؟"

"ہاں ہے!" حضرت زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ "اگر تو اُس سے واقف ہونا چاہتا ہے تو ہم بحکمِ ایزدی اس کا اظہار بھی کرسکتے ہیں!"

قباچہ نے کمزور آواز میں دریافت کیا۔ "حضرت! آپ کا بڑا کرم ہوگا، ہم اپنے انجام سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔!"

حضرت زکریا ملتانی نے پُررعب آواز میں کہنا شروع کیا۔ "قاضی اصفہانی کا خونِ ناحق رائیگاں نہیں جائے گا، تو نے قاضی کو خاک و خون میں لٹایا ہے تو پروردگارِ عالم تجھے تند و سرکش امواج کے حوالے کر دے گا۔ قضائے مبرم تیرے تعاقب میں ہے تو گور و کفن سے بھی محروم رہے گا۔"

دربار پر سناٹا طاری تھا، قباچہ نے خوفزدہ آواز میں زکریا ملتانیؒ سے عرض کیا "حضرت! کیا اس سزا میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن ہے؟"

حضرت زکریا نے جواب دیا۔ "نہیں جو دوسروں پر رحم نہیں کرتے، اُن پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا!"

دربار برخاست ہوگیا۔ حضرت زکریا مُلتانی اپنی خانقاہ میں واپس آگئے۔

کچھ دنوں بعد شمس الدین التمش کی فوجیں قباچہ کی سرکوبی کو حرکت میں آگئیں۔ فوج کی قیادت التمش کا وزیر قوام الدین محمد کر رہا تھا، اُس وقت قباچہ اُچ میں مقیم تھا، خود التمش نے اُچ کا محاصرہ کرلیا۔ قباچہ یہاں سے فرار ہو کر بھکر پہنچا، بھکر کا قوام الدین نے محاصرہ کرلیا۔ اسی دوران قباچہ کو یہ خبر مل گئی کہ اُچ کو التمش نے فتح کرلیا۔ قباچہ نے مایوس اور افسُردہ ہو کر زر و جواہر کا جو ذخیرہ اُس کے پاس موجود تھا، اپنے بیٹے بہرام شاہ کے ہاتھ التمش کی خدمت میں روانہ کر کے معافی کا طالب ہوا اور خود دریائے سندھ میں کشتیوں کے ذریعے پناہ گاہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، اُس کے ساتھ خاندان کے دُوسرے لوگ بھی تھے۔ اُن کی کشتیاں تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھیں، ایک گرداب قباچہ کا منتظر تھا، جب اس کی کشتی گرداب کے قریب پہنچی تو بھنور نے اسے نچا دیا اور کشتی لہرا کر ذرا دُور ہٹ گئی۔ لیکن دُوسرے ہی لمحے تند و سرکش موجوں نے اُسے کھینچ کر پھر بھنور کے دہانے پر پہنچا دیا موجوں کے مدو جزر بلکہ پرے کشتی والوں کو دہشت زدہ کر رہے تھے۔

قباچہ کے کانوں میں حضرت زکریا ملتانی کی آواز گونج رہی تھی۔

"قضائے مبرم تیرے تعاقب میں ہے پروردگارِ عالم تجھے تند و سرکش موجوں کے حوالے کر دے گا۔ اُن پر رحم نہیں کیا جائے گا جو دوسروں پر رحم نہیں کرتے۔!"

بے تاب بھنور نے کشتی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور قباچہ کی کشتی تنکے کی طرح اس میں چکر کھانے لگی۔ کشتی والوں کی چیخیں فضا میں بلند ہوئیں۔ "بچاؤ، بچاؤ، مدد، مدد!"

قباچہ نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن کشتی کے تند و تیز چکروں نے اسے گرا دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ کشتی دریا کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔ اور پھر ذرا دیر بعد نہ وہاں کشتی تھی نہ بھنور۔ بھنور نے مشیتِ ایزدی پوری کر دی تھی۔ اس کے بعد قباچہ کی لاش تک کا پتہ نہ چلا۔



عبداللہ نامی قوال روم سے مُلتان پہنچا۔ اُسے اپنی آواز اور فن پر ناز تھا۔ اُس نے حضرت زکریا ملتانی کے شیخ حضرت شہاب الدین سہروردی کو بھی اپنی آواز اور فن سے متاثر کیا تھا۔ یہ حضرت زکریا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ "حضرت! میری آواز اور فن سے حضرت شیخ سہروردی تک لطف اندوز ہوچکے ہیں۔ اب یہ خاکسار آپ کی خدمت میں باریاب ہے، اگر اجازت ہو تو کچھ آپ کو بھی سنائیے۔"

حضرت زکریا ملتانی نے انکسار سے جواب دیا۔ "جب تجھے حضرت شیخ الشیوخ نے سُنا ہے تو یہ عاجز بھی سُنے گا۔"

رات گئے حجرے میں محفلِ سماع منعقد ہوئی۔ عبداللہ قوال نے جب یہ شعر پڑھا کہ

مستاں کہ شراب ناب خوردند
از پہلوئے خود کباب کردند

تو حضرت زکریا کی حالت غیر ہوگئی۔ محفل میں روشن شمع کو اپنی آستین سے بجھا دیا اور پھر تاریکی میں حضرت زکریا ملتانی پر جو وجدانی کیفیت طاری ہوئی ہے اس کا تفصیلی علم کسی کو بھی نہ ہوسکا۔

خود قوال کا یہ بیان تھا کہ وہ حالتِ وجد میں کئی بار میت کے قریب آئے لیکن میں اُن کا جسم نہ دیکھ سکا، بس دامن کی جھلک سی دیکھ سکا اور کچھ پتہ نہ تھا کہ حضرت زکریا اُس وقت بہ نفسِ نفیس محفلِ سماع میں موجود بھی تھے یا نہیں۔

دوسرے دن قوال کو بہت کچھ دے کر رخصت کیا۔ یہاں سے رُخصت ہو کر بابا فرید گنج شکرؒ کے پاس اجودھن چلا گیا اور اجودھن سے فیض یاب ہو کر دہلی روانہ ہو گیا۔ واپسی میں پھر اجودھن آیا اور کچھ دن بابا فرید کی خدمت میں رہ کر ملتان جانے کی اجازت چاہی۔ قوال اب تک جتنا کما چکا تھا اُس کی فکر دامن گیر تھی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں راہ میں لُٹ نہ جاؤں۔ اُس نے اپنے اس اندیشے کا بابا فرید پر اظہار کیا۔ "بابا! راستہ پُرخطر ہے یہ غلام آپ کی دعاؤں کا اُمیدوار ہے!"

بابا فرید نے جواب دیا "چند میل کے فاصلے پر تجھے ایک تالاب ملے گا، بس وہ تالاب ہی ہمارے علاقے کی حد ہے۔ ہم وہاں تک تو تیری ذمّے داری قبول کر لیں گے، اُس کے بعد تو جانے اور بابا زکریا ملتانی جانیں کیونکہ اس تالاب کے بعد ان کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔"

عبداللہ قوال نے جھک کر زمین کو بوسہ دیا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جب وہ مذکورہ بالا تالاب کے کنارے پہنچا، رہزنوں کی ایک جماعت نے نمودار ہو کر قوال کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اُن کی برہنہ تلواریں قوال کا خون چاٹنے کے لیے بے قرار نظر آ رہی تھیں۔ اُسے یاد آیا کہ یہ حدود زکریا ملتانی کی ہیں۔ اُس نے انتہائی دُکھ اور افسوس سے سوچا کہ یہاں تو حضرت زکریا ملتانی بھی موجود نہیں، پھر اُن سے مدد کس طرح طلب کی جا سکتی ہے!"

اُس نے آنکھیں بند کر کے خود کو رہزنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا لیکن جب دیر تک رہزنوں نے اُس پر حملہ نہیں کیا تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں تو میدان ہی صاف تھا، نہ رہزن تھے نہ کوئی اور، یہ سب کہاں چلے گئے۔ قوال کو کچھ پتہ نہ تھا۔

یہ قوال ملتان پہنچا، اور حضرت زکریا سے ملنے کا خواہشمند ہوا۔ اُس وقت قوال نے بالکل سُرخ لباس پہن رکھا تھا جو حضرت زکریا کو سخت ناپسند تھا۔ جب قوال نے حضرت زکریا کو سلام کیا تو آپ نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور کہا "عبداللہ! تو نے یہ کیسا شیطانی لباس زیبِ تن کر رکھا ہے!"

عبداللہ قوال کو یہ بات ناگوار گزری اور ترش لہجے میں بولا "حضرت! یہ عجیب بات ہے کہ آپ انھیں کچھ نہیں کہتے جن کے خزانے بھرے ہیں اور جن سے حاجت مند ایک پائی بھی نہیں پا سکتے، میرے معمولی لباس کو خواہ مخواہ ہدفِ ملامت بنا رہے ہیں!"

زکریا ملتانی نے غصّے میں جواب دیا۔ "عبداللہ! کیا تو یہ سب کچھ اپنے ہوش میں کہہ رہا ہے؟ ہمیں تیرے لباس کی کم قیمتی یا گرانمایگی سے کوئی بحث نہیں، ہم تو اس رنگ کی بات کہہ رہے تھے کہ یہ صالح انسانوں اور مردوں کا رنگ نہیں ہے۔" پھر رہزنوں والے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تو اس بے چارگی اور اضطراب کو بھول گیا جو ہماری حدود میں داخل ہو جانے کے بعد رہزنوں کے حملہ آور ہونے سے تجھ پر طاری ہو گیا تھا۔ ناشکرے انسان! آخر تیری عقل کہاں چلی گئی حرص و ہوا کے پتلے! کیا تو نہیں جانتا کہ ناشکروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیسا سلوک کرتا ہے!!"

عبداللہ قوال گڑگڑا کر قدموں میں گر گیا اور دیر تک رو رو کر معافی مانگتا رہا۔ حضرت زکریا نے اُسے معاف کر دیا اور حلم و انکسار کی تلقین کر کے رخصت کر دیا۔



ایک بحری جہاز عدن کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اُس کے سارے مسافر تاجر تھے، اور جہاز میں نہایت قیمتی سامان اور مال و دولت کا انبار تھا۔ ابھی عدن کافی دُور تھا کہ طوفان کی سرکش ہواؤں نے جہاز کو اِدھر اُدھر پھینکنا شروع کر دیا۔ جہاز کے عملے نے طوفان سے بچنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ جہاز کے مستول پر جو بادبان لہرا رہے تھے، مستول کے ٹوٹ جانے سے جہاز میں آ گرے اور ہر وہ تدبیر ناکام ہو گئی جو جہاز کو تباہی یا غرقابی سے بچا سکتی تھی۔ اس جہاز میں خواجہ کمال الدین شیروانی بھی موجود تھے۔ یہ حضرت بہاءالدین زکریا کے مخلص ترین ارادتمندوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ خواجہ کمال الدین کی آنکھیں بھر آئیں اور رو کر کہنے لگے "بابا زکریا! تم ملتان میں ہو اور تمہارا یہ ارادتمند ذرا دیر بعد سمندر کی تہہ میں چلا جائے گا جہاں آدم خور مچھلیاں اُسے اپنی غذا بنا لیں گی اور افسوس کہ تمہیں اپنے ارادتمند کی اس عبرت ناک موت کا علم بھی نہ ہو سکے گا۔"

اس ہنگامۂ شور و پکار میں خواجہ کمال الدین نے دیکھا کہ ایک طرف سے حضرت زکریا ملتانی خواجہ مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ خواجہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بار بار بابا زکریا کو دیکھا وہ بہ نفس نفیس خواجہ کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ بولے خواجہ! ابھی تو کیا کہہ رہا تھا کہ تیرا جہاز سمندر میں غرق ہو جائے گا اور تو سمندر کی تہہ میں موجود آدم خور مچھلیوں کی غذا بن جائے گا۔" پھر سنجیدگی سے فرمایا "لاتقنطو من الرحمۃ اللہ (اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو)"

جب خواجہ کمال الدین سے حضرت زکریا ملتانی مخاطب تھے۔ جہاز کے دوسرے لوگ بھی اُن کے قریب آ گئے۔ کسی نے خواجہ سے پوچھا۔ "جناب! یہ کون بزرگ ہیں۔؟"

خواجہ نے جواب دیا۔ "حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی!"

ایک بدحواس بوڑھے تاجر نے پوچھا۔ "یہ کیا کہتے ہیں؟"

خواجہ نے جواب دیا۔ "یہ فرماتے ہیں کہ تمھارا جہاز نہیں ڈوبے گا۔ تم سب اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو!"

اس بوڑھے نے مزید استفسار کیا۔ بولا۔ "یہ اب تک کہاں تھے۔ ہمارے ساتھ تو جہاز میں بیٹھے نہ تھے۔ یہ اس وقت کہاں سے آ گئے؟"

خواجہ نے جواب دیا۔ "یہ تم انہی سے پوچھ لو!"

بوڑھے تاجر نے حضرت زکریا سے پوچھا۔ "حضرت! اب تک آپ کہاں تھے؟"

حضرت زکریا نے جواب دیا۔ "یہیں تمھارے آس پاس۔ ہم کثافتوں سے پاک لوگ جب اور جہاں چاہیں آ جا سکتے ہیں۔ زمان و مکان اور بُعد و فصل ہمارے یہاں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

پھر لوگوں نے حضرت زکریا ملتانی کو ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھا۔ لوگ حیرت زدہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور جب انہیں ہوش آیا تو پتہ چلا کہ تند و تیز ہوائیں تھم چکی تھیں اور بغیر بادبان کا جہاز رواں دواں عدن کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔

جب یہ قافلہ عدن میں بخیر و عافیت اُتر گیا تو تاجروں نے نہایت خلوص و عقیدت سے باتفاق یہ طے کیا کہ سبھی اپنے اپنے مال و دولت کا تہائی حصہ حضرت زکریا ملتانی کی خدمت میں ملتان روانہ کر دیں گے۔

لوگوں نے حضرت زکریا کا حصہ الگ کیا اور فخرالدین گیلانی نامی بزرگ کے ذریعے اُسے ملتان روانہ کر دیا۔ فخرالدین گیلانی جب حضرت زکریا کی خدمت میں باریاب ہوئے تو یہ دیکھ کر اور زیادہ حیران ہوئے کہ بابا زکریا اس وقت بھی اُسی لباس میں تھے جس لباس میں اُنہیں طوفان میں پھنسے جہاز میں دیکھا گیا تھا۔

حضرت زکریا ملتانی نے اس مال اور دولت کو مستحقین اور حاجت مندوں میں تین دن کے اندر تقسیم کر کے ختم کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی مجموعی قیمت تقریباً ستر لاکھ تنکہ تھی۔ فخرالدین گیلانی حضرت زکریا ملتانی سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنا سب کچھ راہِ خدا میں دے دیا اور بابا زکریا کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے یہاں پانچ سال رہ کر مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔ آج بھی فخرالدین گیلانی کے مزار پر لوگ جاتے ہیں اور سکونِ قلب حاصل کرتے ہیں۔



حضرت زکریا ملتانیؒ فجر کی نماز مولانا قطب الدین کاشانی کی اقتدا میں ادا کیا کرتے تھے۔ مولانا کاشانی ماوراالنہر سے آئے تھے اور اپنے وقت کے علامۂ زماں تھے۔ مولانا نماز فجر پڑھ کر درس و تدریس میں لگ جاتے تھے۔ حضرت زکریا ملتانی کا مرتبہ بھی اُن پر عیاں تھا۔ ایک دن مولانا نے حضرت زکریا سے پوچھا۔ "حضرت! ہم تو صرف عالم ہی ہیں اور آپ کو جو مرتبہ خدا نے عطا کیا ہے اُس میں آپ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر آپ ہماری اقتدا میں نماز کیوں ادا فرماتے ہیں؟"

حضرت زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ "رسولِ مقبولؐ نے فرمایا تھا کہ علماء نائبِ رسولؐ ہیں۔ ہم اِسی قول کے احترام میں تمھاری اقتدا کرتے ہیں!"

ایک دِن حضرت زکریا ملتانی جب نماز کے لئے مسجد میں پہنچے تو مولانا ایک رکعت نماز ادا کر چکے تھے۔ حضرت زکریا دوسری رکعت میں شریک ہو گئے۔ جب مولانا نے دوسری رکعت میں بیٹھ کر التحیات شروع کی تو حضرت زکریا سلام سے پیشتر ہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بقیہ نماز پوری کی۔ نماز کے بعد مولانا نے تلخی سے پوچھا۔ "حضرت! آپ میرے سلام سے پیشتر ہی اُٹھ کر کیوں کھڑے ہو گئے؟"

حضرت زکریا نے جواب دیا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ جس وقت ہم نے امام کی اقتدا توڑی تھی اُس وقت امام وسوسۂ دینوی کا

شکار ہو چکا تھا !"

مولانا نے پوچھا۔ "یہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا ؟"

حضرت زکریا نے جواب دیا۔ "نورِ باطن سے !"

مولانا نے درشتی اور عالمانہ غرور سے کہا۔ "جو روش، نورِ شریعت کے مطابق نہ ہو وہ ظلمت ہے۔"

حضرت زکریا نے جواب دیا۔ "حضرت رسولِ مقبول ؐ کا فرمان ہے کہ کسی متکبر کے غرور کا جواب غرور سے دینا عبادت میں داخل ہے، اب ہم بھی تمھارے عالمانہ غرور کے جواب میں، تمھاری اقتدا میں نماز نہیں پڑھیں گے !"

اُس کے بعد حضرت زکریا نے مولانا کاشانی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی۔

حضرت زکریا ملتانی نے اپنی عمر کے آخری حصے میں بھوک اور روزے کی ریاضت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ان کے باورچی خانے میں قسم قسم کا کھانا پکتا تھا اور مسافروں اور مہمانوں کو کھلا کر یا اُن کے ساتھ کھا کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ انسان کو چاہیئے کہ عام دنیاداروں کی طرح کھائے پیئے لذائذِ دنیوی سے فائدہ اُٹھائے مگر خدا کو نہ بھولے۔

ایک بار حضرت زکریا ملتانی نے بابا فرید کو کسی شخص کے لئے معذرت کرتے ہوئے کہا:۔

میانِ ما و شما عشق بازی ست

بابا فرید نے اس معذرت کا جواب یوں دیا:۔

میانِ ما و شما عشق ست، بازی نیست

حضرت زکریا ملتانی بلا کے پُرجوش انسان تھے، انھوں نے جس جوش سے اسلام کی تبلیغ کی اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ چند سالوں میں مُلتان کی حالت بدل کر رکھ دی۔ ہر طرف مدرسے اور مسجدیں نظر آنے لگیں۔ مُلتان پورے ہندوستان کے لئے فیوض و برکاتِ رُوحانی کا منبع بن گیا۔ ملتان کا مدرسۂ اسلام کا مرکزی دارالعلوم قرار پایا۔ یہاں دینی اور دنیوی علوم اور فنون کی تعلیم مُفت دی جاتی تھی۔ حضرت زکریا ملتانی اس دارالعلوم کے مہتمم اعلیٰ تھے، یہاں اس برصغیر کے علاوہ عراق، شام اور حجاز تک سے لوگ علم حاصل کرنے آتے تھے اور یہ ہزاروں کی تعداد میں ہوا کرتے تھے۔ مُفت تعلیم، مُفت رہائش، کتابیں، سیاہی، قلم، کاغذ اور درس و تدریس کی جملہ اشیاء مُفت فراہم کی جاتی تھیں۔

حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی اندر مکان میں آرام فرما رہے تھے۔ اُن کے صاحبزادے صدرالدین عارف باہر کھڑے تھے، ایک شخص آیا اور صدرالدین عارف کی طرف ایک لفافہ بڑھا دیا، بولا۔ "صاحبزادے ! یہ خط بہاءالدین زکریا کو پہنچا دو۔"

بیٹے نے یہ لفافہ باپ کے حوالے کر دیا اور خود باہر آگیا، وہاں وہ اجنبی شخص اب موجود نہیں تھا۔ صدرالدین عارف ابھی اس اجنبی کو تلاش ہی کر رہے تھے کہ مکان کے چاروں گوشوں سے آوازیں بلند ہوئیں۔ "دوست بہ دوست رسید۔"

صدرالدین گھبرا کر اندر پہنچے اور باپ کے سرہانے پہنچ گئے نامہ کھلا ہوا سینے پر رکھا تھا اور حضرت بہاءالدین زکریا رحلت فرما چکے تھے۔ بیٹے نے اس نامے کو پڑھنا چاہا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں کس نے، کس کو، کیا لکھا تھا۔

ٹھیک اس وقت جب حضرت بہاءالدین زکریا نے وفات پائی تھی، بابا فرید گنج شکر اجودھن میں لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ "بھائی بہاءالدین زکریا اس بیابانِ فنا سے شہرستانِ بقا کو رخصت ہو چکے۔"

اتنا کہہ کر بابا فرید بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آنے پر بابا فرید نے اپنے مریدوں کی صفیں درست کیں اور خود امام بن کر حضرت بہاءالدین زکریا کی نماز غائبانہ ادا فرمائی۔ داراشکوہ کی سفینۃالاولیا کے مطابق آپ کی عمر سو سال سے زائد تھی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ بدن کی سلامتی طعام میں، رُوح کی سلامتی ترکِ گناہ میں اور دین کی سلامتی رسولِ مقبول ؐ پر درود بھیجنے میں ہے۔

آپ کے جن مریدوں نے بڑی شہرت حاصل کی اُن میں آپ کے بیٹے صدرالدین عارف ؒ، پوتے رکن الدین ابوالفتح کے علاوہ سید جلال الدین منیر شاہ سرخ بخاری اور سندھ کے لعل شہباز قلندر بہت مشہور ہیں۔

آج بھی قلعے کی اونچی سطح پر، صفر المظفر کو مُلتان میں حضرت بہاءالدین زکریا کا عُرس بڑی شان سے منایا جاتا ہے جس میں برصغیر کے دونوں حصّوں سے آ آ کر اُن کے عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔ عُرس کے علاوہ عام دنوں میں بھی زائرین کی بڑی تعداد یہاں حاضر رہتی ہے۔



شیخ نظام الدین

ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ کی مصلحتوں کو اگر انسان سمجھنے بیٹھے تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ایک بچے کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک ایک ایک پل کی تقدیر تحریر کرتا ہے کہ اس کا کون سا وقت اور کتنا وقت کس عمل میں صرف ہوگا... اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور بعداز مرگ اس کی واپسی کے سفر میں تمام اعمال اس کا زاد سفر کس طرح ٹھہریں گے۔ اللہ کے نیک بندے اسی غور و فکر میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کرتے اور لوگوں کو سکھاتے اور واپسی کا سفر اختیار کرلیتے ہیں۔ آپ کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

ربِ کائنات کا قرب حاصل کرنے والے ایک ولی کا قصہ



لکھنؤ کے قریب کاکوری کے ایک گاؤں نگراواں میں ایک ایسا خاندان اقامت گزیں تھا جس کا شجرۂ نسب سہروردیہ سلسلے کے بانی حضرت شہاب الدین سے تعلق رکھتا تھا اور اگر شہاب الدین سہروردی سے آگے نظر ڈالی جائے تو پھر یہ سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی تک پہنچتا تھا۔ اس خاندان کے صدق و ایمان پر سبھی متفق تھے۔ لوگ ان کی مثالیں دیتے تھے لیکن ان میں کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا تھا جس نے اپنے علم، زہد اور غیر معمولی کارناموں سے... نسلوں پر گہرے اور یادگار اثرات چھوڑے ہوں۔

اس خاندان میں 1160ھ میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ والدین نے بچے کا نام نظام الدین رکھا۔ اس کی پرورش و پرداخت نہایت نازونعم میں ہوئی۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو اسے پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ کاکوری میں علمی خاندانوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ یہ اپنے وقت کے جیدترین علماء سے تعلیم حاصل کرتا رہا۔ گھر والے بہت خوش تھے کہ نظام الدین نے اپنے معاملات میں خود ہی دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ انہیں اپنی تعلیم کے سلسلے میں بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ لوگوں سے یہ پوچھتے رہتے تھے کہ بڑے بڑے عالم کہاں ملیں گے اور انہیں علم حاصل کرنے کے لیے کن عالموں سے رجوع کرنا چاہیے۔

ایک دن ایک عالم کاکوری پہنچا۔ ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ بستی کے لوگ اس سے ملنے اور ہم کلام ہونے کو باعثِ عزت سمجھتے۔ نظام الدین کو علم کی طلب تو تھی ہی، یہ بھی اس عالم کے پاس جا پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت انہیں دے دیں۔ عالم نے پوچھا۔ ”میاں صاحبزادے! تم مجھ سے کیا پڑھو گے؟ میں آج یہاں ہوں کل کہیں اور چلا جاؤں گا اور پڑھنے پڑھانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد برابر کا وقت دیں۔ جو ظاہر ہے کہ میں نہیں دے سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کس طرح پڑھا سکتا ہوں۔“

نظام الدین نے مایوسی سے کہا۔ ”حضرت! اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں ہمیشہ تشنہ ہی رہوں گا!“

عالم نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے تو تم لکھنؤ چلو، وہاں کہیں رہنے کا انتظام کرلو، پڑھا میں دیا کروں گا۔“

نظام الدین نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”افسوس کہ میں لکھنؤ نہیں جاسکوں گا حالانکہ جی بہت چاہتا ہے جانے اور پڑھنے کو۔“

عالم نے کہا۔ ”اگر تم لکھنؤ نہیں جاسکتے تو اور کہاں جاسکتے ہو۔ علم کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ یہ سفر کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے سیکڑوں اور ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرکے علم حاصل کیا تھا اور تم چند میل کا سفر بھی نہیں کرسکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں طلب صادق نہیں، ورنہ ایسی بات نہ کرتے۔“

نظام الدین کے دل پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ وہ کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے، آخر پوچھا۔ ”اس وقت علم کے گہوارے کون کون سے ہیں؟ کیا آپ اس سلسلے میں میری راہنمائی فرمائیں گے؟“

عالم نے جواب دیا۔ ”لکھنؤ اور دہلی..... مشہور یہی دونوں ہیں ورنہ ان دو کے علاوہ بھی کئی شہر ہیں۔“

نظام الدین اس وقت تو خاموش رہے، کچھ بھی نہیں بولے مگر کئی دن تک کشمکش و پیچ میں مبتلا رہے۔ وہ کوئی اہم اور بڑا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ گھر کے بزرگوں نے انہیں فکر میں ڈوبے دیکھا تو پوچھا۔ ”نظام الدین! آخر کس سوچ میں ہو؟ خیریت تو ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”لکھنؤ سے آنے والے عالم نے مجھے یہ عجیب و غریب بات بتائی ہے کہ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے تحصیلِ علم کے لیے سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے طے کیے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو میں کتنا بدنصیب ہوں۔ اس عظیم مقصد کے لیے چند میل کا فاصلہ بھی طے نہ کرسکا۔“

ایک بزرگ نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ بات درست ہے کیونکہ ہزاروں میل کا سفر کرنے والے بزرگ اس نکتے سے واقف تھے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے لیکن جب ہمارے ذہن سے یہ بات نکل گئی، ہم کچھ بھی نہ کرسکے۔ کسی ایک جگہ لوگ پیدا ہوئے اور وہیں مرکھپ گئے اور ان کے بارے میں دنیا یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ پیدا بھی ہوئے تھے یا نہیں۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”تب پھر میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں علم کی خاطر سفر کروں گا۔ میں لکھنؤ نہیں دہلی جاؤں گا کیونکہ اس بڑے مقصد کے لیے اتنا مختصر سفر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

گھر والے سناٹے میں آگئے۔ وہ نظام الدین کو منع بھی نہیں کرسکتے تھے، پھر بھی ایک بزرگ نے کہا۔ ”لیکن اپنے اس سفر سے پہلے اس کی اونچ نیچ پر ضرور غور کرلینا۔ اس راہ میں دشواریاں بھی بہت پیش آتی ہیں۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ کسی بھی عظیم مقصد کی حصولیابی کی راہ میں مشکلات اور دشواریاں بھی عظیم ہی پیش آتی ہیں۔ میں ہر صعوبت اور ہر مشکل پر قابو پانے کا تہیہ کرچکا ہوں۔“

نظام الدین کے جواب میں بڑی استقامت تھی۔ ان کے ایک، ایک لفظ میں قوتِ ارادی کا پرتو موجود تھا۔

اس گفتگو کے کئی دن بعد نظام الدین نے اپنے گاؤں کو چھوڑ دیا۔ سیدھے لکھنؤ پہنچے۔ وہاں دہلی جانے والے ایک قافلے میں شامل ہوگئے۔ اس قافلے میں وہ لوگ بھی تھے جو اکثر و بیشتر سفر کرتے رہتے تھے۔ ان سے انہوں نے یہ معلوم کیا کہ دہلی میں وہ کون لوگ ہیں جن کی علمیت کا چرچا ہے اور جو درس و تدریس میں مرجع خلائق ہیں۔ ان کے اس سوال کا تقریباً ہر ایک کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ”حضرت کلیم اللہ جہان آبادی۔ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ اور عالم بے بدل کلیم اللہ جہان آبادی۔“

نظام الدین نے دہلی پہنچتے پہنچتے فیصلہ کرلیا تھا کہ انہیں سلسلۂ چشتیہ کے اس آستانے پر دستک دینی ہے۔ وہ کلیم اللہ کے بارے میں

معلوم نہیں کیا کچھ سوچتے رہے۔ انہیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید یہ دوران کے لیے نہ کھلے کیونکہ کلیم اللہ کے آستانے پر ان جیسے معلوم نہیں کتنے لوگ حاضریاں دیتے ہوں گے اور ان میں ہر شخص اس لائق نہیں ہوتا ہوگا کہ کلیم اللہ کا شرف شاگردی حاصل کرلے۔

نظام الدین دہلی پہنچ کر قافلے سے جدا ہوگئے اور کلیم اللہ کے آستانے کا پتا پوچھتے ہوئے پہنچ گئے۔ رات کا وقت تھا اور آستانے میں محفل سماع گرم تھی۔ یہ در پر دستک دینا چاہتے تھے کہ شیخ کے کسی مرید نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ نظام الدین نے پوچھا۔ ”میں شیخ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا شیخ نے ملاقاتیوں پر کوئی پابندی عائد کر رکھی ہے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”اس وقت اندر محفلِ سماع گرم ہے اور شیخ کا یہ عام حکم ہے کہ وہ اپنی اس محفل میں کسی اجنبی یا عام شخص کو نہیں داخل ہونے دیتے۔ اس لیے اگر تم نے دستک بھی دی تو اندر سے یہی جواب ملے گا کہ صبح حاضری دینا۔“

نظام الدین کا دل ٹوٹ گیا۔ مرید سے عالمِ یاس میں پوچھا۔ ”شیخ کو یہ کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا اجنبی یا کوئی عالم شخص ہے؟“

مرید نے حیرت سے انہیں دیکھا اور سوال کیا۔ ”تم ہمارے شیخ کی بابت کیا کچھ جانتے ہو؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ سنا ہے کہ شیخ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔“

مرید نے پوچھا۔ ”بس یا اور کچھ بھی؟“

نظام الدین نے کہا۔ ”بس، اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟“

مرید نے کہا۔ ”تب پھر اے اجنبی...... تجھ کو رات کہیں اور بسر کرنا چاہیے۔ صبح آجانا، ممکن ہے شیخ کی نظرِ کرم ہوجائے ورنہ میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ تمہیں اپنے حلقۂ درس میں نہیں بٹھائیں گے۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”یہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ میں ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنا چاہتا ہوں؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”تم اپنی وضع قطع اور صورت شکل سے طالبِ علم نظر آتے ہو اور شیخ چونکہ روشن ضمیر ہیں اس لیے وہ آنے والے کے ارادے، نیت اور خصوصیت سے اسے دیکھے بغیر ہی واقف ہوجاتے ہیں۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں تمہارے شیخ کا اس وقت امتحان کیوں نہ لے لوں۔ میں دروازے پر دستک ضرور دوں گا، خواہ یہ دروازہ کھلے یا نہ کھلے۔“

مرید نے مزاحمت کی۔ ”میں دروازے پر دستک نہیں دینے دوں گا۔“

لیکن نظام الدین نے مرید کی مزاحمت سے پہلے ہی دستک دے دی۔ مرید دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے، بولا۔ ”اجنبی! تم نے یہ بہت برا کیا۔ بہرحال تم نے جو غلطی کی، اس کا اعادہ نہیں ہونے دوں گا۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”بہتر ہے، میں دستک تو دے ہی چکا ہوں اور میں اپنی طلبِ صادق سے واقف ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے پیرومرشد اپنی روشن ضمیری سے یہ سب جانتے ہیں یا نہیں۔“

کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ مرید نے مڑ کر اندر کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی کہا۔ ”میں نے بڑی کوشش کی کہ دروازے پر دستک نہ ہونے دوں لیکن یہ ضدی شخص دھوکا دے کر دستک دینے میں کامیاب ہوگیا۔“ پھر پوچھا۔ ”شیخ نے یہی کہا ہوگا کہ اس شخص کو رخصت کردیا جائے؟“

آنے والے نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ شیخ نے پوچھا ہے کہ دستک دینے والے کا نام کیا ہے؟“

مرید حیران و پریشان نظام الدین کی صورت دیکھنے لگا۔

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”اپنے پیرومرشد سے عرض کردو کہ نظام الدین شرفِ باریابی چاہتا ہے۔“

وہ شخص واپس چلا گیا تو مرید نے نظام الدین کا مذاق اڑایا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس وقت ذلت اور خواری تیرا مقدر بن چکی ہے ابھی تک میں نے تم اور تمہیں سے مخاطب کیا لیکن جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ تو ضدی اور خودسر انسان ہے تو میں تُو اور تجھے پر اتر آیا۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”تم جن لفظوں میں بھی چاہو، مجھے مخاطب کرو۔ میں ہر حال میں نظام الدین ہی رہوں گا۔ تم نہ تو میرا مرتبہ بڑھا سکتے ہو اور نہ گھٹا سکتے ہو۔ میں جو ہوں وہی رہوں گا۔“

اس دوران وہ شخص واپس آگیا۔ بولا۔ ”اے اجنبی! تجھے پیرومرشد یاد فرما رہے ہیں، وہ تجھ سے اسی وقت ملنا چاہتے ہیں۔“

نظام الدین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ انہیں واقعی طلب کرلیا جائے گا، پوچھا۔ ”کیا واقعی؟ کیا مجھے اندر طلب کیا گیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں، تجھ کو اسی وقت بلایا گیا ہے۔ پیرومرشد نے فرمایا کہ جاؤ نظام الدین کو بلاؤ۔“

اب تو نظام الدین کی حالت ہی غیر ہوگئی۔ وہ بوجھل قدموں سے اندر داخل ہوگئے اور اضطراب، بے چینی سے شیخ کی طرف بڑھتے

رہے۔ کچھ دیر بعد یہ شیخ کلیم اللہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس وقت شیخ کے آس پاس جو لوگ موجود تھے، انہیں حیرت تھی کہ یہ شیخ کو آج ہو کیا گیا ہے جو ایک اجنبی کو محفلِ سماع میں بلا لیا۔

ایک ارادت مند نے پوچھا۔ ”حضرت! دخل اجنبی در مجلسِ سماع دستورِ حضور نیست“ (حضرت! اجنبی کو مجلسِ سماع میں داخل کرنا حضور کا دستور نہیں ہے)

شیخ نے جواب دیا۔ ”ایں مرد عزیز است اجنبی نیست“ (یہ شخص عزیز و آشنا ہے، اجنبی نہیں)

نظام الدین نے شیخ کو سلام کیا۔ شیخ نے سلام کا جواب دے کر دریافت فرمایا۔ ”کہو، کیونکر آنا ہوا؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں تحصیلِ علم کی خاطر حاضر ہوا تھا، آپ کی نظرِ کرم کا طالب ہوں۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”بس یا اس کے علاوہ بھی کچھ؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں آیا تو اسی غرض سے ہوں، اس کے علاوہ اور کیا یہاں سے مل سکتا ہے، میں نہیں جانتا۔ حضور جو کچھ دیں گے، لے لوں گا۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”تم رہتے کہاں ہو؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے شہر میں نووارد ہوں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اگر آپ نے مجھ کو اپنے حلقۂ درس میں شامل کرلیا تو رہنے کا کوئی ٹھکانا بھی کرلوں گا۔“

شیخ نے کہا۔ ”میں نے تجھے اپنے حلقۂ درس میں شامل کیا اور تجھے رہنے کا ٹھکانا بھی دیا، تو یہیں میرے آستانے میں رہے گا، میں تیری طلبِ صادق کی قدر کرتا ہوں۔“

حاضرین رشک سے اس نووارد کو دیکھنے لگے۔ شیخ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ نظام الدین کو اس کے رہنے کی جگہ دکھا دی جائے۔ چنانچہ نظام الدین کو ایک چھوٹا سا حجرہ دے دیا گیا۔

اب تک جو کچھ اور جس انداز میں ہوا تھا، نظام الدین کو اس پر یقین نہیں آتا تھا لیکن جب اس حجرے میں ایک رات بھی بسر کرلی تو انہیں یقین آگیا کہ وہ اپنا گوہرِ مقصود پا چکے ہیں لیکن انہیں شیخ کے مریدوں کی کیفیت دیکھ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ مریدین میں اکثر سکر و وجد میں مبتلا نظر آتے۔ نظام الدین سوچتے، ان لوگوں کی یہ حالت کیونکر ہوجاتی ہے۔ انہیں تو بس ایک ہی بات معلوم تھی، وہ یہ کہ شیخ کے آس پاس جو لوگ موجود ہیں، وہ سب ان کی طرح طالب علم ہیں پھر یہ وجد و جذب کی کیفیت کیوں طاری ہوجاتی ہے اور اگر ان پر طاری ہوجاتی ہے تو پھر خود نظام الدین پر یہ کیفیت کیوں نہیں طاری ہوتی؟ سوچتے سوچتے سر میں درد ہونے لگا مگر ان سوالوں کا کوئی معقول جواب نہیں مل سکا۔

دوپہر کا وقت تھا، نظام الدین اپنے استاد سے درس لے رہے تھے۔ یکایک ایک ہلکا سا شور اٹھا اور لوگ زور زور سے باتیں کرنے لگے پھر یہ لوگ کھڑے ہوکر ایک طرف بھاگے۔ نظام الدین نے کسی سے پوچھا۔ ”بھائی! آخر بات کیا ہے؟ یہ لوگوں میں خاموش ہلچل سی کیوں مچی ہوئی ہے؟“

ایک نے جواب دیا۔ ”میاں صاحبزادے! شاید تم یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”اگر میں یہاں کے بارے میں کچھ جانتا ہوتا تو ایسا سوال نہ کرتا۔“

اس شخص نے کہا۔ ”میاں سادہ لوح صاحب! یہاں ظاہری تعلیم بھی دی جاتی ہے اور باطنی تعلیم بھی۔ تم نے شیخ سے کہا کہ تم ان سے ظاہری اور دنیاوی علوم حاصل کرنا چاہتے ہو، اس لیے باطنی علوم کے بارے میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا گیا اور تم جب جذب و کیف میں مبتلا لوگوں کو دیکھتے ہو تو حیران اور پریشان اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگتے ہو اور اس کا سبب جاننے کی کوشش کرتے ہو۔“

نظام الدین نے آنے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بھائی! یہ کون صاحب ہیں اور انہیں ہاتھوں ہاتھ کیوں لیا جارہا ہے؟“

ایک مرید نے جواب دیا۔ ”ہمارے پیرو مرشد۔ شیخ کلیم اللہ کے مرشد شیخ یحییٰ مدنی ان دنوں مدینہ میں اقامت گزیں ہیں۔ یہ آنے والا شخص شیخ مدنی کا مرید ہے اور اپنے پیر بھائی شیخ کلیم اللہ سے ملاقات کرنے آیا ہے۔ یہاں والے اس کی زیارت اور ملاقات کی خاطر بھاگ دوڑ رہے ہیں۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”آنے والا اس کے سوا تو کچھ نہیں کہ ہمارے شیخ کا پیر بھائی ہے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”نظام الدین! افسوس کہ تم ہمارے شیخ کے مرتبے اور مقام سے واقف نہیں ہو۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”کیوں واقف نہیں، ہمارے شیخ اس عہد کے نامی گرامی بلکہ بے نظیر و بے عدیل عالم ہیں۔“

مرید نے کہا۔ ”افسوس کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے۔“ اس کے بعد مرید نے نظام الدین کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ بولا۔ ”تم

میرے ساتھ آؤ اور جو کچھ دیکھو اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

مدینے سے آیا ہوا شخص اس وقت شیخ کے حجرے میں داخل ہو رہا تھا۔ نظام الدین اس کے ساتھ شیخ کے حجرے کی طرف بڑھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی حجرے میں داخل ہو گئے۔ ان داخل ہونے والوں میں نظام الدین بھی شامل تھے۔

مہمان نے اندر داخل ہوتے ہی السلام وعلیکم یا شیخ، کہہ کر شیخ کلیم اللہ کو مخاطب کیا۔

شیخ نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کہہ کر جواب دیا اور اپنے پیر بھائی پر ہوش و خرد سوز نظر ڈالی۔ آنے والا مہمان ان نظروں کی تاب نہ لا سکا اور چیخ مار کر گر گیا۔ شیخ کے مریدوں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا کہ مہمان زمین پر گر چکا تھا۔

نظام الدین کی حیرت اور پریشانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا، اپنے مرید ساتھی سے پوچھا۔ "کیا یہ شخص کچھ بیمار ہے... یہ بے ہوش کیوں ہو گیا؟"

مرید نے بڑے افسوس سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم اپنے شیخ کی بابت کچھ بھی نہیں جانتے تو تمہیں یہاں سے چلا جانا چاہیے اور کسی ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جو محض عالم ہو اور کچھ نہیں۔"

نظام الدین نے بڑے دکھ سے کہا۔ "بھائی! میں جو نہیں جانتا اگر اس کی بابت کچھ جاننا چاہتا ہوں تو تم مجھے شرمندہ کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

مرید نے کہا۔ "بھائی! تو بات ہی ایسی کر رہا ہے۔ اپنے شیخ کلیم اللہ عالم باعمل کے ساتھ ہی یگانہ روزگار صوفی بھی ہیں۔ ان کا ظاہر بھی روشن ہے اور باطن بھی روشن ہے۔ ان کی باتوں میں اثر اور نظروں میں سحر ہے۔ مدینے سے آنے والے پیر بھائی کی نظریں شیخ کی پُرسوز نظروں کی متحمل نہ ہو سکیں اور یہ شخص بے ہوش ہو کر گر گیا۔"

اب نظام الدین کے اندر حرکت سی ہوئی اور کچھ مدوجزر سا پیدا ہو گیا، پوچھا۔ "شیخ میں یہ اثر کمال کیونکر پیدا ہو گیا؟"

مرید نے جواب دیا۔ "ریاضت اور مجاہدے سے، تزکیۂ نفس اور چلہ کشی سے۔"

نظام الدین نے پوچھا۔ "اگر میں بھی یہ بات حاصل کرنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

جواب ملا۔ "نفس کشی، مجاہدہ، ریاضت!"

نظام الدین نے پوچھا۔ "کتنے دنوں تک؟"

جواب ملا۔ "اپنے پیر و مرشد استاد سے رجوع کرو اور پوچھو کہ ان جیسا مقام تم کتنے دنوں میں حاصل کر لو گے؟"

نظام الدین کو شرم سی آ گئی، سر جھکا کر پوچھا۔ "میں یہ باتیں تم سے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ انہیں اپنے استادِ محترم سے نہیں پوچھ سکتا۔"

مرید نے کہا۔ "بھائی! اپنے شیخ کی مردم شناسی اور عرفان کا یہ حال ہے کہ بات ابھی تمہارے ہونٹوں تک بھی نہیں آئی کہ یہ سب کچھ سمجھ گئے، ان کے پاس پست ہمت اور......"

نظام الدین نے بات کاٹ دی، بولے۔ "ہاں ... میں اپنے پیر و مرشد جیسا بننا چاہتا ہوں، کیونکہ مادی ترقیاں وقتی ہوتی ہیں اور میں پائیدار اور ناقابل شکست ترقی کرنا چاہتا ہوں۔"

مرید کو ان کی کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ نظام الدین مریدوں کو چیرتے اور دونوں ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے شیخ کے قریب پہنچ گئے اور انہیں جی بھر کے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے دل کو ٹٹول رہے تھے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ شیخ کی نظروں کا ان کے دل پر اثر ہوتا ہے یا نہیں؟

شیخ نے انہیں سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے نظام؟ خیریت تو ہے؟"

نظام الدین کو ایک جھٹکا سا محسوس ہوا، بولے۔ "کوئی خاص بات نہیں استادِ محترم!"

شیخ نے کہا۔ "نہیں، کوئی خاص بات ہے۔ مجھے تم پریشان نظر آ رہے ہو۔"

نظام الدین کا دل بھر آیا، بولے۔ "استادِ محترم! میں اپنی مجبوری اور بے بسی پر پریشان ہوں۔ آپ کی نظروں نے آپ کے پیر بھائی کو بے ہوش کر دیا مگر یہی نظریں مجھ پر کوئی اثر نہیں کر رہیں۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "نظام! یہ دنیا ہی دوسری ہے، اس کی بابت دور کے لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔"

نظام الدین نے پوچھا۔ "کیا میں اس دوری کو ختم کر سکتا ہوں؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، اگر تم چاہتے ہو کہ یہ دوری دور ہو جائے تو اس کے لیے تیاری کرو، اس طرح جس طرح ایک طالبِ علم امتحان کی تیاری کرتا ہے۔"

کچھ لوگوں نے شیخ کو بتایا کہ بے ہوش ہونے والا پیر بھائی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، آپ نے اس کو ڈانٹ دیا۔ "یہ کیا بات ہے کہ تو کم ظرفوں کی طرح ایک چلو میں الو ہوا جا رہا ہے، ظرف پیدا کر۔ تحمل اور صبر سے کام لے۔"

شیخ کا پیر بھائی آنسو بہا رہا تھا، بولا۔ "شیخ! جب میں مدینے سے چلا تھا تو پیر و مرشد نے مجھ سے بطورِ خاص کہا تھا کہ شیخ کلیم اللہ سے نظریں نہ ملانا، ورنہ نقصان اٹھا جاؤ گے۔ چنانچہ آج جب غلطی سے میں نظریں ملا بیٹھا تو میں نے اپنے اندر ایک زلزلہ سا محسوس کیا اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔"

شیخ نے کہا۔ "بہرحال اتنی قوت پیدا کرو کہ آنکھیں ملا سکو۔" پھر نظام الدین سے پوچھا۔ "اور تم نے بھی کچھ محسوس کیا یا نہیں؟"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں محسوس کی جو دوسروں کو بتا کر حیرت زدہ کر دوں۔"

شیخ نے کہا۔ "یہ بات بھی نہیں ہونا چاہیے۔ تم بالکل کورے ہو، اس پر کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ کچھ نقش و نگار بنائے جا سکتے ہیں۔" پھر کچھ توقف اختیار کیا، پوچھا۔ "علوم دو قسم کے ہوتے ہیں، ظاہری اور باطنی۔ کیا تمہیں ان دونوں سے دلچسپی ہے؟"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "ابھی تک تو میں ظاہری علوم حاصل کرتا رہا ہوں۔"

شیخ نے کہا۔ "لیکن اگر تم چاہو تو باطنی علوم بھی حاصل کر سکتے ہو۔"

نظام الدین نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "محنت سے...... بہت جدوجہد کرنا پڑے گی۔"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

شیخ نے سکوت اختیار کیا، ایسا سکوت جو مہینوں قائم رہا۔

نظام الدین کو شبہ ہوا کہ شیخ بے التفاتی برت رہے ہیں، انہیں بڑا دکھ ہوا مگر شیخ سے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ خود بھی خاموش ہو گئے اور کسی موقع کا انتظار کرنے لگے۔

ایک دن ظہر کی نماز کے بعد جب شیخ نے اٹھ کر اپنے جوتے تلاش کیے تو دیکھا نظام الدین انہیں ہاتھوں میں لیے مؤدب کھڑے ہوئے ہیں۔ پھر یہ جوتے شیخ کے قدموں میں رکھ دیے۔ شیخ نے نظام الدین کو بغور دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "توجہ بکسب علوم باطنی اولیٰ و احسن است (علوم باطنی حاصل کرنے کی توجہ کرنا اوّل و احسن ہے)"

نظام الدین نے جواب میں شعر پڑھا۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

اس شعر نے شیخ کی حالت غیر کر دی، وہ تڑپ گئے اور کہا۔ "نظام الدین! یہ تو نے کیسا شعر پڑھ دیا؟"

نظام الدین گھبرا گئے، وہ سمجھے شاید اس شعر نے شیخ کو کسی وجہ سے آزردہ کر دیا ہے۔

شیخ نے کہا۔ "تو پریشان نہ ہو جب میں مدینے سے چلا تھا تو میرے پیر و مرشد شیخ یحییٰ مدنی نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک شخص جس کا نام نظام الدین ہوگا، تیرے پاس آئے گا۔ وہ کچھ عرصہ تجھ سے علوم ظاہری حاصل کرے گا پھر اچانک اس کی توجہ علوم باطنی کی طرف ہو جائے گی۔ جب وہ تجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرے گا تو یہ شعر (مندرجہ بالا شعر) پڑھے گا۔ جب اور جو شخص یہ شعر پڑھے گا، اس کی طلب صادق ہوگی اور اس پر خصوصی توجہ دینا لازم ہو جائے گا۔"

نظام الدین بے حد خوش ہوئے مگر اس خوشی میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں شامل ہوئی۔

شیخ کی خدمت میں ایک اور مرید آ گیا۔ یہ شخص بھی مدینہ منورہ سے آیا تھا۔ شیخ نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "کسی کے آنے سے اتنا اداس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟"

آنے والے نے شیخ کی طرف دیکھا اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ نظام الدین نے دوسری بار یہ منظر دیکھا تھا۔ پوچھا۔ "حضرت! یہ کیا ہے؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "نظام! یہ بھی ایک علم ہے جو تمہیں بھی تعلیم کیا جائے گا۔"

نظام الدین نے ایک سوال اور کیا۔ "معلوم نہیں کیوں، میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ آنے والا بے ہوش شخص کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے۔ کون سی خاص خبر؟ مجھے پتا نہیں لیکن کیا شیخ کو بھی اس کا کوئی علم نہیں؟"

شیخ نے نظام الدین سے نظریں ملاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں، یہ شخص مدینہ منورہ سے بڑی اندوہناک خبر لایا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس سے کہوں کہ تو جو خبر لایا ہے اسے سنا دے لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں اپنے پیر و مرشد کی بابت کوئی اندوہناک خبر سنوں، اس لیے میں اس سے کوئی سوال بھی نہیں کر سکا۔"

مریدوں نے بے ہوش شخص کو کوشش کرکے ٹھیک کرلیا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی شیخ نے اس سے پوچھا۔ "میرے نووارد مہمان! میرے پیرومرشد کا کیا حال ہے، وہ خیریت سے تو ہیں؟"

آنے والا زاروقطار رونے لگا، اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ روتے روتے ہوئے جواب دیا۔ "شیخ! آپ کے پیرومرشد کا وصال ہو چکا ہے۔"

شیخ نے ایک آہ بھری اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اس دن شیخ ہمیشہ سے زیادہ ملول اور افسردہ رہے۔ انہیں کچھ اچھا ہی نہ لگتا تھا۔ آخر اسی عالم میں انہوں نے نظام الدین سے کہا۔ "نظام! کئی دن کے غوروفکر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ تمہیں باطنی علوم بھی سکھائے جائیں چنانچہ کل سے یہ کام شروع ہو جائے گا۔"

نظام الدین پر خوشی کا ایسا دورہ پڑا کہ گر گئے اور دیر تک نیم مدہوشی کی کیفیت میں مبتلا رہے۔

حسب وعدہ نظام الدین کو درس دیا جانے لگا۔ نظام الدین نے بھی اپنا سب کچھ بھلا دیا۔ انہیں بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ شیخ کا خلیفہ کون ہوگا؟ کیونکہ مریدوں نے نظام الدین کو بتا دیا تھا کہ درویش میں مراتب ہوتے ہیں اور یہ باقاعدہ ایک نظام ہے۔

نظام الدین کی محنت اور لگن نے شیخ کو بہت خوش کردیا۔ ایک عرصے بعد جب نظام الدین کو ایک مقام مل گیا تو شیخ نے انہیں طلب کیا۔ نظام الدین پیرومرشد کے روبرو ادب سے کھڑے ہو گئے۔

شیخ نے پھر سوال کیا۔ "کچھ جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "پیرومرشد خود ہی ارشاد فرمائیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

شیخ نے پھر سوال کیا۔ "یہاں تمہیں کیسا لگتا ہے؟"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "بہت اچھا۔ میں نے یہاں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے جہان آباد سے بہتر کوئی اور سرزمین نہیں۔"

شیخ نے پوچھا۔ "اگر میں تجھ کو یہ حکم دوں کہ تو جہان آباد کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین پر چلا جا تو تجھے کیسا لگے گا؟"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "پیرومرشد کا حکم سر آنکھوں پر...... آپ کے حکم کی تعمیل میں جہاں کہیں بھی جاؤں گا، خوش و خرم رہوں گا۔"

شیخ نے حکم دیا۔ "تب پھر تم دکن چلے جاؤ۔ میں نے دکن کی ولایت تمہارے حوالے کی۔ دکن کے شہر اورنگ آباد میں تم قیام کرو گے۔"

نظام الدین دم بخود پیرومرشد کو دیکھتے رہ گئے۔

شیخ نے پوچھا۔ "میری صورت کیا دیکھتے ہو؟ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

نظام الدین نے اپنے پیرومرشد کے قدموں میں سر رکھ دیا، کہا۔ "میں اعتراض کروں گا، یہ آپ نے کس طرح سوچ لیا؟ میں شیخ کے حکم کی تعمیل میں کل ہی اورنگ آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ میں تو اس لیے پیرومرشد کی شکل دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی اور حکم دیا جائے۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "نہیں، کوئی اور حکم نہیں ہے۔ تم فوراً ہی دکن چلے جاؤ۔"

نظام الدین نے پوچھا۔ "کیا ابھی؟ کیا اسی وقت؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "ہاں ابھی...... اسی وقت!"

نظام الدین اسی وقت دکن روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

اورنگ آباد پہنچ کر نظام الدین نے رشد و ہدایت کا کام شروع کردیا۔ خواجہ گیسودراز کی رشتے دار خاتون سے آپ نے شادی کرلی۔ خود کو ذکر وفکر میں مشغول کردیا۔ آپ کا شہرہ ہوا تو آپ کے در پر لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ آپ ان میں شیروشکر ہو گئے۔ آپ لوگوں کو ہدایتیں بھی فرماتے اور ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے۔

چشتیہ سلسلے میں چونکہ قوالی جائز ہے اس لیے نظام الدین کو بھی اس کا بہت شوق تھا، ملک کے دور دراز خطوں کے لوگ آپ کے پاس پیاس بجھانے آتے اور شاداں و فرحاں واپس جاتے۔

محفلِ سماع برپا تھی اور لوگ مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔ جامی کا کلام سنایا جارہا تھا۔ آپ پر حالت وجد طاری تھی۔ اسی دوران ایک شخص محفل میں داخل ہوا اور آپ کے قریب بیٹھ گیا۔ محفل میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اس شخص سے واقف ہوتا۔ وہ بے باکی سے محفل میں آیا تھا اور بدتمیزی سے آپ کے شانے سے اپنا شانہ بھڑا کر بیٹھ گیا۔

قوالی زور و شور سے جاری تھی۔ اس شخص نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوسرے شخص سے کہا۔ ”جناب! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ قوالی سے ہمیں کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ کیا اس طرح ہمیں لہو و لعب میں نہیں مبتلا کر دیا گیا؟“

مخاطب نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پیرومرشد نظام الدین پاس ہی بیٹھے ہیں اور وہ سماع کے دوران بات چیت پسند نہیں کرتے۔

اجنبی نے جواب نہ پا کر پھر چھیڑ چھاڑ کی، بولا۔ ”قوالی کے جواز میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھجن کی متبادل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کے بعض صوفیا اور خاص کر خواجہ معین الدین چشتی نے برصغیر کے ہندوؤں میں جب یہ دیکھا کہ وہ بھجن سے بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں اور ان کے دل و دماغ پر بھجن اور بھجن گانے والے کی خوش الحانی کا خاص اثر ہوتا ہے تو اس کی جگہ قوالی کو رائج کیا گیا اور جب قوال حقائق یا معرفت کا کلام اپنے مخصوص انداز اور آواز میں سناتے ہیں تو سامع پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ غلط ہے کیونکہ قوالی کے رواج کا محض ہندوستان سے ہی تعلق نہیں، یہ ایران اور عراق عرب میں بھی رواج پا چکی ہے۔“

کسی نے اس اجنبی کی بات کا پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر وہ عاجز ہو گیا، بولا۔ ”کیا تم سب گونگے ہو گئے ہو، میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے...... یا پھر تمہاری خاموشی کا یہ مطلب لوں کہ تم لوگ میری بات کی صداقت تسلیم کر چکے ہو۔“

نظام الدین کو اس شخص کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! یہ محفل سماع ہے۔ تو خاموش کیوں نہیں رہتا؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”اگر آپ کے پاس میری باتوں کا کوئی جواب ہے تو مرحمت فرما دیں، میں خاموش ہو جاؤں گا۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”میرے پاس تیرے ہر سوال اور ہر اعتراض کا جواب ہے لیکن یہ وقت سوالوں اور اعتراضوں کے جواب کا نہیں ہے۔ پھر کسی وقت آ جانا، میں تمہیں مطمئن کر دوں گا۔“ پھر پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”عبدالغنی!“

آپ نے فرمایا۔ ”تو غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ تیرا نام عبدالغنی نہیں ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”پھر کیا ہے میرا نام؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نام تیرا ہے تو تو ہی بتائے گا بھی!“

اس شخص نے کہا۔ ”میرا نام جو تھا، بتا دیا، میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں کب یہ کہہ رہا ہوں کہ جھوٹ بول۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے باتیں کر کے تو اپنی ذمے داریوں کو پورا کر، ورنہ خواہ مخواہ کی لن ترانیاں فضول ہیں۔“

وہ شخص جز بز ہو کر چلا گیا، آپ نے حاضرین سے پوچھا۔ ”اس اجنبی کو اس محفل میں کون لایا تھا؟“

کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ”کوئی بھی نہیں، یہ شخص اپنے طور پر آیا تھا۔“

کافی دنوں بعد وہی شخص دوبارہ آ گیا لیکن اس دن قوالی نہیں ہو رہی تھی، آپ نے اس سے پوچھا۔ ”تو نے اس روز اپنا کیا نام بتایا تھا...... عبدالغنی؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں عبدالغنی بتایا تھا، کیوں کیا آپ کو میرے نام پر کسی قسم کا اعتراض ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”مجھے اعتراض کا کوئی حق نہیں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ فقیروں سے جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں، تیرا نام عبدالغنی ہرگز نہیں ہو سکتا، کچھ اور ہے۔“

اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ نے بجا فرمایا۔ واقعی میرا نام عبدالغنی نہیں، عبداللہ ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جہاں تک میں جانتا ہوں تیرا یہ نام بھی نہیں، تو مسلسل جھوٹ بولے جا رہا ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، اب میں تو آپ سے بات کر نہیں سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، اس طرح نہیں سوچتے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دن جو باتیں تو کر رہا تھا انہیں ایک دن میرے سامنے بھی بیان کر دے کہ میں اس کا مدلل جواب دے سکوں۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! میں نے کہہ جو دیا، اب میں یہاں ایک بات بھی نہیں کروں گا کیونکہ میرے دل و دماغ میرے اس خیال کو تکذیب میں ڈال رہے ہیں۔ اب میں کس منہ سے آپ سے بات کروں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تیرے سوالوں کے جواب میں دوں گا تاکہ تو مطمئن ہو جائے۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں تو اسی دن مطمئن ہو گیا تھا، آج اس لیے آیا ہوں کہ اس دن کی گستاخی کی آپ سے معافی مانگ لوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں نے تجھے معاف کردیا۔ اب تو میرا پیچھا چھوڑ دے۔“
اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! یوں کام نہیں چلے گا۔“
آپ نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میری باتیں غور سے سن، تو نے پہلی بار اپنا نام عبدالغنی بتایا تھا مگر اس کے بعد تو عبداللہ ہو گیا۔ افسوس کہ تو نے جھوٹ سے توبہ نہیں کی۔ تیرا نام نہ تو عبدالغنی ہے اور نہ عبداللہ۔ تیرا نام تو عبدالحیٔ ہے، فقیروں سے کیا پردہ۔“
وہ شخص شرمندہ ہو کر آپ کے قدموں میں گر گیا اور اپنے جھوٹ کی معافی مانگنے لگا۔
آپ نے فرمایا۔ ”جا، میں نے تو تجھ کو معاف کردیا مگر آئندہ تو جھوٹ نہیں بولے گا۔ میری ایک بات یاد رکھنا، جس چیز کے بارے میں تجھے علم حاصل نہ ہو، اس پر زبان نہ کھولنا۔ جن لوگوں نے تصوف میں اپنی زندگیاں گزار دیں، اس بارے میں ان کا علم زیادہ ہوگا یا وہ جنہیں اس کی ابجد کا بھی علم نہیں۔“
وہ شخص شرمندگی اور ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلیاں دیں۔ تب کہیں عبدالحیٔ کے ہوش و حواس قابو میں آئے۔

☆☆☆

ان دنوں دہلی میں بڑی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ امراء اور سردار آپس ہی میں جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ ان حالات میں ایک تورانی امیر قمرالدین علی خان کو دکن کی تسخیر کا خیال آیا۔ یہ امیر دکن میں ایک طاقت ور حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں فقراء کی دعائیں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ نظام الدین کے پیرومرشد کلیم اللہ جہان آبادی کی خدمت میں گیا اور مدعا بیان کیا، بولا۔ ”حضرت! دہلی اور اس کے مضافات میں جو انتشار اور بدامنی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالات ابھی اور زیادہ خراب ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں مغلیہ سلطنت کی بوسیدہ دیواروں کے مقابل دکن میں ایک مضبوط حصار کھڑا کردیا جائے جہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو پناہ مل جائے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ وہاں ایک اسلامی حکومت قائم کی جائے۔“
شیخ نے پوچھا۔ ”پھر یہ حکومت کس طرح قائم کی جاسکتی ہے؟“
قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں نے انسانوں کی فوج تو تیار کرلی ہے، آپ کے پاس دعاؤں کا لشکر لینے آیا ہوں۔ اگر آپ کی دعائیں اور میری فوج مل کر دکن پر حملہ آور ہوں گی تو میری فتح یقینی ہو جائے گی۔“
شیخ سوچ میں پڑ گئے، وہ سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگے۔ قمرالدین علی خان کو شبہ ہوا کہ شاید انہیں ٹال دیا جائے گا۔ فوراً شیخ کے دونوں ہاتھ فرطِ عقیدت سے پکڑ لیے اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں جو کچھ چاہتا ہوں، اس سے مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود مقصود ہے۔ امید ہے آپ اس عاجز کو مایوس نہیں کریں گے۔“
شیخ نے فرمایا۔ ”دکن کی ولایت تو نظام الدین کے حوالے کی جاچکی ہے، وہی کچھ کرسکتا ہے۔“
قمرالدین علی خان نے کہا۔ ”وہ بھی آپ ہی کے ایما اور سفارش پر کچھ کریں گے۔ میں تو آپ کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا، کچھ نہ کچھ لے کر ہی جاؤں گا۔“
شیخ نے فرمایا۔ ”میں نظام الدین سے تیری سفارش کردوں گا، کام وہی کرے گا۔“
قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”آپ جو مناسب سمجھیں کریں، میں نہیں جانتا۔“
شیخ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ ”ایک ٹھیکری تو دینا۔“
شیخ کو ٹھیکری دے دی، آپ نے اس پر سیاہ روشنائی سے لکھ دیا۔ ”نظام الدین! کتا آرہا ہے ہڈی ڈال دو۔“
قمرالدین علی خان نے اپنی فوج اور سفارش کے ساتھ دکن پر چڑھائی کردی۔ اس عالم میں اورنگ آباد پہنچے اور نظام الدین کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ شیخ نظام الدین کے در پر ایک خادم نے قمرالدین علی خان کو روک لیا اور پوچھا۔ ”آپ کا ان سے کیا کام ہے؟“
قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں دہلی کے شیخ کلیم اللہ کے پاس سے آرہا ہوں۔ میں تمہارے شیخ کے نام ایک سفارشی ٹھیکری لے کر آیا ہوں۔“
خادم نے کہا۔ ”اس وقت پیرومرشد کھانا تناول فرما رہے ہیں، آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔“
قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں انتظار کرلوں گا مگر تم یہ خبر اندر تو پہنچادو۔“
خادم اندر چلا گیا۔ اس وقت تک آپ نے چند لقمے ہی کھائے تھے، خادم نے کہا۔ ”حضرت! ایک شخص حضرت کلیم اللہ کی سفارشی ٹھیکری لے کر آیا ہے اور باریابی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے۔“
آپ نے فوراً حکم دیا۔ ”اسے فوراً اندر لاؤ۔ اس کو دروازے پر روکا ہی کیوں۔ فوراً اندر بلالو۔“

خادم نے اسی وقت قمرالدین علی خان کو نظام الدین کے روبرو پہنچا دیا۔ شیخ نظام نے پوچھا۔ ”کہو، کیسے آنا ہوا؟“

قمرالدین علی خان نے ٹھیکری ان کی طرف بڑھا دی۔ شیخ نظام نے ٹھیکری کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور خوشی سے پوچھا۔ ”ہاں تو تم میرے پیرو مرشد کے پاس سے آرہے ہو؟“

قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہیں سے آرہا ہوں۔“

شیخ نظام نے دسترخوان پر سے سات روٹیاں لے کر اس پر ایک ہڈی رکھ دی اور قمرالدین علی خان کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے کھانا کھالو، اس کے بعد بات کروں گا۔“

قمرالدین علی خان نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور چپ چاپ مؤدب بیٹھ گئے۔

شیخ نظام نے پوچھا۔ ”اور کچھ یا بس؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”بس۔ اب حاجت نہیں رہی۔“

شیخ نظام نے پوچھا۔ ”ہاں تو اب اپنا مطلب بیان کرو۔“

انہوں نے کہا۔ ”حضرت! ہندوستان میں ایک افراتفری مچی ہوئی ہے۔ مغلیہ سلطنت روبہ زوال ہے۔ میں چاہتا ہوں دکن میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کروں۔ فوج میرے پاس ہے دعاؤں کی ضرورت ہے جو آپ سے ملے گی۔ پیرو مرشد شیخ کلیم اللہ نے یہ کام آپ کے سپرد فرما دیا ہے۔ نظرِ کرم کا امیدوار ہوں، بس اسی لیے حاضری دی ہے۔“

شیخ نظام نے اپنے زرد پیراہن کا ایک حصہ پھاڑ کر قمرالدین علی خان کے سر پر باندھ دیا اور کہا۔ ”آج سے تو نظام ہے، اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دے۔“

قمرالدین وہاں سے خوشی خوشی اٹھ کر اپنی فوج میں گئے اور دکن پر لشکر کشی شروع کر دی۔ گھمسان کا رن پڑا اور قمرالدین نے فتح پائی اور انہوں نے نظام الملک آصف جاہ کا لقب اختیار کیا اور شاہی لباس میں زرد رنگ کی دستار کو اپنا طرۂ امتیاز بنا لیا۔

کچھ عرصے بعد مبارز خان نے آصف جاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ آصف جاہ نے پریشانی میں ایک بار پھر شیخ نظام سے رجوع کیا اور پورا واقعہ بتا کے درخواست کی۔ ”حضرت! میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، مسلمانوں کے لیے کر رہا ہوں لیکن افسوس کہ مسلمان ہی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟“

آپ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ”تم مبارز خان کا مقابلہ کرو۔ وہ ناکام رہے گا، کامیابی تمہاری قسمت میں لکھی گئی ہے۔“

آصف جاہ نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں چاہتا ہوں مجھے کوئی ایسی بین علامت فتح مل جائے جس سے میں مطمئن ہو جاؤں اور پریشان خاطری دور ہو جائے۔“

شیخ نظام کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ”نظام! کل جمعرات ہے، تم اپنے ڈیرے پر غور کرنا۔ ایک صندلی پنجہ ظاہر ہوگا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ فتح تمہاری ہے۔“

آصف جاہ اپنی فوج میں واپس چلا گیا، وہ کسی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔ دوسرے دن جمعرات تھی۔ آصف جاہ اپنے خیمے میں جم کر بیٹھ گیا، اس کی نظریں خیمے کی دیواروں پر جمی ہوئی تھیں۔ دوپہر تک اسی صندلی پنجے کی جستجو میں رہا۔ آخر ظہر کے وقت یہ پنجہ خیمے کی دیوار پر سائے کی طرح نمودار ہوا۔ آصف جاہ مارے خوشی کے سجدے میں گر گیا۔ جو لوگ اس وقت خیمے میں تھے وہ آصف جاہ کی اس حرکت سے پریشان ہو رہے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ ”حضرت! یہ سجدہ کس خوشی میں ہو رہا ہے؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”کیا تم لوگ خیمے کی اس دیوار پر کچھ دیکھ رہے ہو؟“

اب بھی اس پنجے کی طرف دیکھنے لگے اور سبھی نے متفقہ آواز میں کہا۔ ”ہاں، ہم سب دیوار پر ایک پنجے کا سایہ سا دیکھ رہے ہیں مگر یہ پنجہ ہے کس کا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”یہ میری فتح کا پنجہ ہے، میری کامیابی کی علامت ہے۔“

آصف جاہ کی باتیں کسی پاگل کی بڑ لگ رہی تھیں مگر وہ بے حد خوش تھا۔ اس کے بعد آصف جاہ اور مبارز خان کی فوجیں ٹکرائیں، لاشیں گرنے لگیں، خون برسنے لگا، زخمیوں کی چیخ و پکار نے میدانِ کارزار کو عرصۂ حشر بنا دیا۔ شام تک مبارز خان کی فوجیں پسپا ہو کر راہِ فرار اختیار کر رہی تھیں اور آصف جاہ کی سپاہ ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب فتح مکمل ہو گئی تو نظام الملک آصف جاہ نے شیخ کے دربار میں حاضری دی اور ان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔

پھر آصف جاہ دکن کے نظم و نسق میں مشغول ہو گیا۔ کافی عرصے بعد وہ اس حال میں شیخ کی خدمت میں پہنچا کہ گاڑیوں پر روپے لدے ہوئے تھے اور مویشیوں کی پشت پر کپڑے کے تھان رکھے تھے۔ آصف جاہ نے انہیں شیخ نظام کی بارگاہ کے باہر کھڑا کر دیا اور خود

اندر شیخ کی خدمت میں پہنچا۔
شیخ نظام نے مسکرا کر اس دنیادار کو دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے..... کوئی اور حاجت؟“
آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! آج میں آپ سے یہ اجازت لینے آیا ہوں کہ اس جگہ جہاں آپ سکونت پذیر ہیں، آپ کے لیے ایک شان دار محل تعمیر کرادوں۔“
شیخ نے پوچھا۔ ”اگر تم محل کی تعمیر کا کام آج ہی سے شروع کرادو تو اس میں کتنا وقت صرف ہوگا؟“
آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”تقریباً دو سال مگر آپ کو اس کی کیا فکر؟“
شیخ نے پوچھا۔ ”اور اس میں کتنا روپیا صرف ہوگا؟“
آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں مگر میں نے تو یہ تہیہ کرلیا ہے کہ جتنا بھی روپیا صرف ہوگا میں خرچ کروں گا اور حضرت کی شایانِ شان آستانہ تعمیر کرادوں گا۔“
شیخ نے فرمایا۔ ”آصف جاہ! اگر تو چاہتا ہے کہ میں خوش ہوجاؤں تو وہ سارا روپیا میری خانقاہ کے باہر اس کے چبوترے پر ڈھیر کردے، میں اس سے خوش ہوجاؤں گا۔“
نظام الملک نے باہر نکل کر گاڑیوں پر سے روپیا اتروا کر چبوترے پر ڈھیر کرادیا۔ سورج کی روشنی میں روپوں کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ آصف جاہ اندر گیا اور شیخ کو مطلع کیا۔ ”حضرت! آپ کے حکم کے بموجب روپے کا ڈھیر چبوترے پر لگادیا گیا ہے، ایک نظر ملاحظہ بھی فرمالیں۔“
شیخ نظام اپنی جگہ سے اٹھے اور خانقاہ کے باہر تشریف لے گئے۔ وہاں چبوترے پر بہت سارا روپیا دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مریدوں کو حکم دیا۔ ”جاؤ اور بازاروں اور گلی کوچوں میں جا کر یہ اعلان کردو کہ شیخ نظام فقرا اور مساکین کو کچھ دینا چاہتا ہے، وہ میری خانقاہ کے در پر آجائیں اور اپنا حصہ لے جائیں۔“
مریدوں نے شیخ کا یہ پیغام گلی گلی اور بازار بازار پہنچادیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فقراء اور مساکین کا جم غفیر خانقاہ کے در پر اکٹھا ہوگیا۔ شیخ نے سارے روپے اسی وقت تقسیم کرنا شروع کردیے، آصف جاہ اس منظر کو بڑی دلچسپی اور عقیدت سے دیکھتا رہا۔ جب سارا روپیا تقسیم ہوگیا تو پوچھا۔ ”حضرت! یہ آپ نے کیا کیا؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ جو کچھ کیا آپ کی نظروں کے سامنے کیا، پھر یہ سوال کیسا؟“
آصف جاہ نے کہا۔ ”میری خواہش تھی کہ میں آپ کے لیے ایک شاندار محل تعمیر کراؤں مگر آپ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ پتا نہیں کیوں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”تو اتنی ساری رقم کو دو سال تک خرچ کرتا رہتا اور پھر کہیں ایک محل تعمیر کراتا لیکن تو نے دیکھا میں نے ذرا سی دیر میں کئی شاندار محل تعمیر کرا ڈالے۔ بابا! ہم درویش لوگ اپنی کٹیوں ہی میں اچھے لگتے ہیں، محل تو نوابوں اور بادشاہوں کے لیے ہوتے ہیں۔“
آصف جاہ کا دل بھر آیا، وہ رونے لگا۔ آہستہ سے کہا۔ ”قربان جایئے اس سادگی اور سخاوت کے..... حرص اور طمع کو آپ نے زیر کر کے پوری دنیا کو اپنا مطیع و منقاد کرلیا ہے، سبحان اللہ۔“
اس کے بعد آصف جاہی خاندان میں یہ دستور ہوگیا کہ جب خانقاہ میں عرس ہوتا تو خانقاہ کی طرف سے حکمراں نواب کو جو تبرک بھیجی جاتی، اس میں سات روٹیاں اور ان پر ایک ہڈی رکھی ہوتی۔ یہ دونوں چیزیں ایک زرد رنگ کے کپڑے میں رکھ کر باندھ دی جاتیں۔ اس کے بعد جو حکمراں نواب آپ کی خانقاہ میں آتا تو اس کے سر پر زرد رنگ کا کپڑا بندھا ہوتا۔

☆☆☆

آپ کے مریدوں میں ایک صاحب تھے سعید بیگ۔ آپ سعید بیگ پر بے حد مہربان تھے اور بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ صاحب ہر روز بڑی پابندی سے آیا کرتے تھے لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ سعید بیگ غائب رہنے لگے۔
جب سعید بیگ کی غیر حاضری کو ایک ہفتہ گزر گیا تو شیخ نے دوسرے مریدوں سے پوچھا۔ ”لوگو! کیا بات ہے؟ یہ سعید بیگ کہاں غائب ہوگیا، کچھ اس کا بھی کسی کو پتا ہے؟“
کئی مریدوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”سعید بیگ معلوم نہیں کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اگر شیخ کا حکم ہو تو اس کے گھر جا کر اس کی خیر خبر لے آئیں!“
آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، میرا خیال ہے تم میں اس وقت بھی کوئی ایسا شخص موجود ہے جو سعید بیگ کی پریشانیوں سے واقف ہے۔“
ایک مرید نے عرض کیا۔ ”پیر و مرشد بجا فرماتے ہیں۔ میں سعید بیگ کی پریشانیوں سے واقف ہوں اگر حکم ہو تو بیان کردوں۔“
شیخ نے حکم دیا۔ ”بیان کرتا کہ اس کا علاج کیا جائے۔“

مرید نے عرض کیا۔ ''پیرومرشد! سعید بیگ جس محلے میں رہتے ہیں، اس کے متصل ایک دوسرے محلے میں ایک جوگن رہتی ہے۔ یہ نہایت حسین مگر سنگ دل عورت ہے۔ سعید بیگ نے اس کو معلوم نہیں کہاں دیکھا تھا کہ دل دے بیٹھے۔ کئی بار اس کے در پر حاضری بھی دی اور جوگن سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی مگر وہ اتنی سخت دل اور بے نیاز ہے کہ سعید بیگ پر کوئی توجہ ہی نہیں دیتی۔ اس کی بے التفاتی اور بے نیازی سعید بیگ کے لیے جان لیوا ہورہی ہے۔ شاید اسی لیے سعید بیگ یہاں بھی نہیں آرہے۔''

شیخ نے اسی مرید کو حکم دیا۔ ''اچھا اب تو سعید بیگ کے گھر چلا جا اور اس کو بتادے کہ میں نے اس کو طلب کیا ہے۔''

مرید نے پوچھا۔ ''اسی وقت یا کسی بھی وقت؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اسی وقت کیونکہ اس نازک وقت میں فوری دستگیری درکار ہے۔''

مرید بھاگا بھاگا سعید بیگ کے گھر پہنچا اور بہ آوازِ بلند اعلان کیا۔ ''سعید بیگ! تم اسی وقت میرے ساتھ شیخ کے پاس چلو، وہ تمہیں یاد فرمارہے ہیں۔''

سعید بیگ نے پوچھا۔ ''مجھ سے شیخ کا کوئی خاص کام؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''شیخ کو تیرے معاشقے کا علم ہوچکا ہے، شاید وہ اس سلسلے میں تیری مدد کریں۔''

سعید بیگ اسی وقت مرید کے ساتھ ہولیا۔ شیخ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ یہ جیسے ہی شیخ کے سامنے پہنچے، شیخ نے پوچھا۔ ''ارے سعید بیگ! تیرا کیا حال ہے؟ میں تیری بابت کیا سن رہا ہوں؟''

سعید بیگ کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے، جواب دیا۔ ''حضور! ہنگام دستگیری وقت عنایت است'' (حضور! یہ مدد کا وقت ہے، کچھ وقت عنایت ہوا ہے)

آپ نے پوچھا۔ ''اس جوگن میں تجھ کو کیا نظر آگیا ہے؟''

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں کیا نظر آگیا۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔ میرے دل ودماغ پر اس کا قبضہ ہے۔ سوتے جاگتے اسی کا خیال اور اسی کا تصور طاری رہتا ہے۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''اور اس کا کیا حال ہے؟''

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ''جو میرا حال ہے، وہ اس کا نہیں ہے۔ اگر میں اس کے پاس چلا جاؤں تو شاید وہ مجھ پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرے۔ وہ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''تو گویا یہ یک طرفہ عشق ہے؟''

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ''جی پیرومرشد! یہ یک طرفہ عشق ہے۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم اس کے عشق سے بازآجاؤ؟''

سعید بیگ نے رو، رو کر عرض کیا۔ ''جو اس کے عشق میں مزہ ہے اور دل کو جو لذت اور سرور حاصل ہورہا ہے، میں اس سے دستبردار ہونے کے بجائے موت سے ہم آغوش ہوجانا بخوشی گوارا کرلوں گا۔''

شیخ نے کہا۔ ''بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ تمہیں ایسی بات نہیں کرنا چاہیے۔''

سعید بیگ کے زخم خوردہ دل پر اور چوٹ لگی، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''حضرت! میرے حق میں دعا کیجیے کہ مجھے موت آجائے۔ میں اپنی زندگی سے ذرا بھی خوش نہیں۔ ناکام اور نامراد رہ کر زندگی گزارنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''زندگی خدا کا عطیہ ہے، اس کو ختم کرنے کی خواہش کفرانِ نعمت ہے۔ اس سلسلے میں میں تیری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

سعید بیگ نے مایوسی سے کہا۔ ''حضرت! میں تو آپ کے پاس استعانت کی آرزو لے کر حاضر ہوا تھا اور آپ ہی مجھے مایوس کردینا چاہتے ہیں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں تیری کیا مدد کرسکتا ہوں، خدا سے مدد کی دعا کر، ضرور کامیاب ہوجائے گا۔''

سعید بیگ نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال یہ تھا کہ اگر آپ میرے حق میں دعا فرمادیں گے تو میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''مگر وہ جوگن کہتی کیا ہے؟''

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ''وہ کہتی تو کچھ بھی نہیں، وہ نہ تو میری طرف دیکھتی ہے اور نہ ہی مجھ سے بات کرتی ہے، حالانکہ دوسرے کئی جو اس کی چاہت میں آتے ہیں، ان سے باتیں بھی کرتی ہے اور ان کی طرف دیکھتی بھی ہے۔''

شیخ نے خلافِ معمول حکم دیا۔ ''اچھا اب تو جاسکتا ہے، پھر کسی دن آجانا۔''

اس کے بعد سعید بیگ چلا گیا۔ حاضرین پر سناٹا طاری ہوچکا تھا۔ شیخ نے مریدوں سے کہا۔ ''میں تو لوگوں کو عشقِ حقیقی کی

طرف دعوت دیتا ہوں اور سعید بیگ یہ چاہتا ہے کہ میں عشقِ مجازی میں اس کی مدد کروں، بھلا یہ کیونکر...... زمانہ کیا کہے گا، دنیا کیا کہے گی۔''

جب چار مرید اکٹھا ہوئے اور شیخ نظام اپنے حجرے میں چلے گئے تو ایک نے دوسرے مریدوں سے سرگوشی میں کہا۔ ''پیرومرشد نے سعید بیگ کو مایوس کر کے اس کا دل توڑ دیا، اس پر رحم آتا ہے۔ سوچو، اس کی کس طرح مدد کی جاسکتی ہے۔''

ایک دوسرے مرید نے جواب دیا۔ ''پیرومرشد کو بہلا پھسلا کر اس جوگن کے گھر لے جایا جائے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ سعید بیگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو۔''

تیسرا مرید بولا۔ ''لیکن پیرومرشد کو وہاں تک کس طرح لے جایا جائے؟''

جس نے یہ مشورہ دیا تھا، بولا۔ ''میرا دماغ اپنا کام کر رہا ہے، شاید میں پیرومرشد کو وہاں تک لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

کئی مریدوں نے فرطِ خوشی میں نعرہ لگایا۔ ''پیرومرشد زندہ باد۔''

کئی دن بعد ایک مرید شیخ نظام کے تخلیہ میں گیا اور رو رو کر عرض کیا۔ ''حضرت! اب تو سعید بیگ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ کیجیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس کے حق میں مستقلاً دعا کرتا رہتا ہوں۔''

مرید نے درخواست کی۔ ''اگر مرشد جوگن کے گھر تک تشریف لے چلیں تو یہ بڑا کارنامہ ہوگا اور میرا دل کہتا ہے کہ سعید بیگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کیا سعید بیگ نے یہ خواہش کی ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''نہیں یہ ہماری خواہش ہے، ہم سب کی خواہش ہے۔''

آپ کچھ سوچنے لگے، پھر فرمایا۔ ''سعید بیگ بھی آخر کیا کرے، عشق تو آخر عشق ہے اور عشق ایک ایسی آگ ہے جس میں بہت کچھ جل جاتا ہے۔ میں سعید بیگ کی ضرور مدد کروں گا۔''

شیخ کے اس جواب نے مریدوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی، ان سب نے موقع غنیمت جانا اور اسی وقت شیخ کو تیار کرا کر جوگن کے پاس چلے۔ راستے میں کہا۔ ''بھائی! میری سمجھ میں یہ بات تو آتی نہیں کہ ایک تیسرے درجے کی عورت نے آخر وہ کونسا جادو کر دیا ہے کہ سعید بیگ کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔''

ایک مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں تو اس کو اسی حال میں دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ اس عشق کے طفیل اس میں جو جذب و کیف پیدا ہو گیا ہے، وہ بہت کام کی چیز ہے۔''

شیخ نے کہا۔ ''ابھی تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ سعید بیگ نے اس تیسرے درجے کی عورت سے عشق کیوں کیا؟''

ایک مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! یہ وقت میرے خیال میں کیوں اور کیا کا نہیں ہے۔''

شیخ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد لوگ جوگن کے در پر پہنچ گئے۔ اندر جوگن کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ دیوانہ وار باہر آ گئی اور شیخ کے قدموں کو بوسہ دیا۔

شیخ نے اس حسین عورت کو بڑے غور سے دیکھا اور دل ہی دل میں اس کے حسن کا اعتراف کر لیا پھر جوگن سے پوچھا۔ ''اے عورت! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تجھ میں یہ گھمنڈ کیوں ہے اور کیا تو غرور اور گھمنڈ کے انجام سے بھی واقف ہے؟''

جوگن نے جواب دیا۔ ''حضرت! بات یہ ہے کہ اس زمین پر جو بھی آیا، بالآخر زمین کے اندر چلا گیا۔ مجھے اپنی کسی چیز پر بھی کوئی غرور نہیں۔ میں اپنے اور اپنے حسن کے فانی ہونے کا اقرار کرتی ہوں۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''کیا تو میرے مرید سعید بیگ سے واقف ہے؟''

جوگن نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں واقف ہوں یا نہیں۔ اگر وہ صاحب میرے سامنے لائے جائیں تو شاید میں کوئی جواب دے سکوں۔''

کسی مرید نے کہا۔ ''جوگن! تو نے پیرومرشد کو بٹھایا نہیں، یہ کھڑے کھڑے باتیں کرنے کا سبب؟''

جوگن گھبرا گئی، بولی۔ ''معاف کیجیے گا، یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔'' اس کے بعد وہ شیخ کو اندر لے گئی اور بڑے احترام سے بٹھا کر خود سامنے کھڑی ہو گئی۔

مریدوں کا خیال تھا پیرومرشد سعید بیگ کی بابت کچھ اور باتیں بھی کریں گے مگر آپ نے پھر کوئی بات نہیں کی اور کچھ دیر بعد یوں ہی واپس چلے آئے۔ آپ کے اس طرزِ عمل سے دوسروں کو بڑی مایوسی ہوئی۔

دوسرے دن سعید بیگ نے شیخ کی خدمت میں حاضری دی، آپ نے سعید بیگ کو حکم دیا۔ ''سعید بیگ! اپنی جوگن سے آج ضرور

مل لینا، اس نے تمہیں بلایا ہے۔"

سعید بیگ نے شیخ سے تو کچھ بھی نہیں پوچھا، مریدوں سے ضرور سوال کیا۔ "کیا پیر و مرشد نے جوگن سے کسی قسم کا وعدہ لے لیا ہے؟"

ایک مرید نے جواب دیا۔ "میں تو جوگن کے پاس ہی موجود رہا۔ میرا خیال ہے وہاں تو ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ جوگن نے شیخ سے کب یہ کہہ دیا تھا کہ سعید بیگ کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔"

سعید بیگ نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "اگر میں شیخ کے حکم کے بموجب وہاں چلا بھی جاؤں تو پتا نہیں وہ جوگن مجھ سے کیا سلوک کرے اور یہ کہ مجھ سے بات بھی کرے یا فوراً ہی نکال باہر کرے۔"

ایک دوسرے مرید نے کہا۔ "جب پیر و مرشد نے وہاں جانے کا حکم دے ہی دیا ہے تو تمہیں ضرور جانا چاہیے۔"

سعید بیگ اسی وقت جوگن کے پاس روانہ ہو گئے۔ جب یہ جوگن کے گھر پہنچے تو وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ سعید بیگ کو دیکھتے ہی بولی۔ "میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی، دیر کہاں کر دی؟"

سعید بیگ نے ایسا محسوس کیا گویا جوگن سے ان کی بڑی بے تکلفی ہے اور وہ سالوں سے ملتے جلتے چلے آرہے ہیں۔ سعید بیگ نے جواب دیا۔ "میں پیر و مرشد کے پاس گیا ہوا تھا اور وہیں سے تمہارے پاس آرہا ہوں۔"

جوگن نے کہا۔ "تب پھر مجھے بھی اپنے پیر و مرشد کے پاس لے چلو۔"

سعید بیگ نے پوچھا۔ "کب؟"

جوگن نے جواب دیا۔ "ابھی۔"

سعید بیگ جوگن کو لے کر پیر و مرشد کے پاس چلے گئے۔ شیخ نظام نے ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔ "کہو، کیسے آنا ہوا؟"

جوگن نے عرض کیا۔ "حضرت! مجھ کو بیعت کر لیجیے اور یہ کہ میں اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری اس مشکل کو آسان کر دیں۔"

شیخ نے اسی وقت جوگن کو بیعت کر لیا اور سعید بیگ سے اس کا نکاح پڑھا دیا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً اور اچانک ہوا تھا، کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

آپ نے سعید بیگ سے پوچھا۔ "سعید بیگ! تجھ کو تیرا گوہر مقصود مل گیا لیکن اب میرے پاس آنا جانا نہ چھوڑ دینا۔" پھر جوگن سے کہا۔ "اور تو بھی اس نیک اور شریف مرد کی مطیع و فرماں بردار رہے گی۔ اس کا بڑا خیال رکھنا۔"

جوگن نے جواب دیا۔ "میں تو انہیں نعمت سمجھ کر قبول کر رہی ہوں، پھر کفرانِ نعمت کا ارتکاب کیوں کروں گی۔"

سعید بیگ جوگن کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ شیخ کے مریدوں کو بڑی حیرت تھی لیکن اس ملاپ سے خوشی بھی بے حد ہوئی تھی۔

آپ نے ایک عرصے تک لوگوں کی خدمت کی، آپ نے جو انگوٹھی پہن رکھی تھی، اس کے نگینے پر کندہ تھا۔

ذکرِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ

آپ مصنف بھی تھے اور آپ کی کتاب نظام القلوب نے بڑی شہرت حاصل کی۔ آپ کی خوراک بہت معمولی تھی، جو لباس پہنتے تھے، وہ معمولی اور پیوند لگا ہوا ہوتا تھا۔ آپ کے پاس جو کچھ بھی آتا، آپ اسے دوسروں میں تقسیم فرما دیتے۔

آپ عشق کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ بار بار فرمایا۔ "اے عزیز! کمال عشق چاہیے تاکہ تو اس مقام تک پہنچ جائے جس سے اونچا کوئی اور مقام نہیں۔ یہ عاشقوں کا مقام ہے اور کمال عشق کے بغیر یہ مقام نہیں حاصل ہوتا۔"

آپ یہ بھی فرماتے تھے۔ "عبادت کے لیے خلوِ معدہ ضروری ہے اور خاص کر وہ لوگ جو مبتدی ہوں، انہیں اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔"

آپ کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بیاسی سال تک اس عالمِ رنگ و بو کو اپنے فیوض سے نوازتے رہے۔ آخر 12 ذیقعد 1242ھ کو بعد نمازِ عشا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون



تاریخ مبارک شاہی	آثار الصنادید	تاریخ فرشتہ	عہد سلاطین دہلی	تاریخ فیروز شاہی	طبقات اکبری
یحییٰ بن احمد سرہندی	سر سید احمد خان	محمد قاسم فرشتہ	صلاح الدین ناسک	شمس سراج عفیف	نظام الدین احمد

شمسِ عرفان

ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ اپنے خاص بندوں کی آمد کی پہلے سے ہی خبر کردیتا ہے۔ اسی تناظر میں آپ کی پیدائش کا بھی بہت سے لوگوں کو انتظار تھا۔ اس بات سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کے یہاں آپ کا کتنا بلند مقام تھا... یہ رفعت و بلندی جس کے مقدر میں لکھ دی جائے سمجھو اسے زندگی کے پل پل کا کھرا حساب دینا پڑتا ہے۔ قدم قدم پر آپ کو بھی آزمائشوں نے گھیرا لیکن... آپ کا حوصلہ آپ کی ڈھال بن گیا... پھر کیسے وہ ارفع مقام آپ سے دور رہتا۔

ایک عام انسان کے روپ میں اللہ کے ایک ولی کا منفرد داستان



غزنی کے قصبے کلال گو میں مصری خان نامی ایک سردار کو اس لیے خصوصی شہرت حاصل تھی کہ اسے بیک وقت دین اور دنیا کی سعادت حاصل تھی۔ مصری خان کا بیٹا موکل خان افغانستان کے مشہور فاتح احمد شاہ درانی کے دربار میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ ان دنوں مہمند زئی قبیلے کے بزرگ اور باکمال درویش گلزار محمد خان کے کشف و کرامات کا بڑا شہرہ تھا۔ موکل خان دنیا میں رہتے ہوئے بھی دین کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ وہ گلزار محمد خان کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی کہ انہیں مرید کرلیا جائے۔

درویش گلزار محمد خان نے مراقبے میں دیکھا کہ ارادت مند ایک اعلیٰ منصب دار ہے تو آنکھیں کھول دیں اور پوچھا۔ ''کیا دنیا سے جی بھر گیا؟''

موکل خان نے جواب دیا۔ ''حضرت بابا، دنیا سے جی تو نہیں بھرا لیکن اب میں اپنے رب سے بھی جی لگانا چاہتا ہوں اور یہ

آپ کی توجہ کے بغیر ناممکن ہے۔''

درویش نے کسی قدر تامل سے کہا۔ ''لیکن موکل خان! مرید ہو جانے کے بعد میں تمہیں یہاں اپنے آس پاس نہیں رکھوں گا کیونکہ یہاں تمہاری کوئی ضرورت نہیں، تمہیں ہندوستان جانا پڑے گا۔''

موکل خان نے بلا تامل جواب دیا۔ ''میں ہر وقت حاضر ہوں پیرومرشد...... آپ موقع تو دیں۔''

درویش نے کہا۔ ''سادہ لوح نوجوان! کیا میں جھوٹا ہوں، اگر تو ہندوستان جانا پسند کرتا ہے تو میں تجھ کو مرید کرلوں گا۔''

موکل خان نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور اپنے پیرومرشد کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد موکل خان کو مرید کرلیا گیا۔ شیرینی تقسیم ہوئی، پیرومرشد گلزار محمد خان نے اپنے مرید موکل خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مریدوں سے کہا۔ ''آج میں نے ایک مضبوط اور جاندار شخص کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرلیا ہے۔ موکل خان احمد شاہ درانی کے دربار میں ایک اعلیٰ منصب دار ہے۔ ایک اتنے بڑے دنیادار کا اپنے مرشد کی رضا کی خاطر اپنے منصب کو چھوڑ دینا قابلِ داد اور قابلِ تحسین ہے کیونکہ یہ احمد شاہ درانی کے دربار میں رہ کر میرے حکم کی تعمیل نہیں کرسکتا تھا۔''

کافی دیر بعد جب تخلیہ ہوگیا اور آہستہ آہستہ کرکے سارے مرید چلے گئے تو موکل خان نے اپنے پیرومرشد سے عرض کیا۔

''حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ایک سوال کرلوں؟''

پیر نے جواب دیا۔ ''اپنے دل میں کوئی بات نہ رکھ، جو پوچھنا ہے پوچھ لے۔''

موکل خان نے سوال کیا۔ ''کیا میرے ہندوستان چلے جانے میں کوئی خاص راز ہے؟ اور یہ کہ میں وہاں جاکر کروں گا کیا؟''

درویش گلزار محمد نے جواب دیا۔ ''وہاں کئی نسلوں بعد تیرے نسب سے ایک ایسا بیٹا پیدا ہوگا جو تیرے خاندان کے لیے باعثِ افتخار ہوگا۔ یہ تیرے اور تیرے نسب و نام کا مقدر ہے۔''

موکل خان نے پیرومرشد کی بات کو گرہ میں باندھ لیا اور انہوں نے احمد شاہ درانی کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کی راہ لی۔ روشن ضمیر پیر نے موکل خان کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے دو خلیفہ شیر خان غازی اور حاجی مڈکی کو ان کے ساتھ کردیا۔ موکل خان پنجاب میں داخل ہوئے اور ضلع ہوشیارپور میں جہاں خیلیوں کی زمین پر آباد ہوگئے۔

موکل خان سے سلسلہ چل نکلا۔ موکل خان کا وصال ہوا تو حمریز خان کو اپنا جانشین چھوڑا۔ حمریز خان کی جگہ ان کے بیٹے غلام محمد نے سنبھال لی اور غلام محمد اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے بیٹے شیر محمد خان نے اپنے کنبے کی کفالت کی۔ انہوں نے ریاست منڈی میں ملازمت اختیار کرلی۔ شیر محمد خان کی عمر بتیس سال چھ ماہ کی ہوئی تو ان کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ 1204ھ کا واقعہ ہے۔ بچہ اتنا حسین تھا کہ دیکھنے والوں کی بچے کے چہرے پر نظر نہیں ٹکتی تھی۔ ماں باپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ وہ ہر وقت بچے کو دیکھتے ہی رہیں۔ باپ کو بچے کے نام کی فکر تھی۔ آخر ایک دن نام القا ہوگیا اور نومولود کا نام دیدار بخش رکھ دیا گیا۔ پہلی بار نام رکھنے میں خاندانی روایت کو یکسر نظرانداز کردیا گیا تھا۔ اصل نام میں ... ہر نام کے ساتھ خان ضرور لگتا تھا لیکن اب خان کی جگہ بخش نے لے لی تھی۔

دیدار بخش دل کا سرور اور آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا کہ پانی کی طرح بہتے ہوئے پُرسکون تالاب میں قدرت نے ایک پتھر مارا اور شیر محمد خان رحلت فرما گئے۔ اس وقت دیدار بخش کی عمر صرف ڈھائی سال تھی۔ بیوی کو اپنے شوہر کی موت کا بڑا غم تھا۔ ابھی لوگ ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ معلوم ہوا ننھے دیدار بخش بہ عارضہ چیچک بسترِ مرگ پر پڑے ہیں۔ عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ علاج معالجہ بھی ہوتا رہا لیکن ہر وہ شخص جو دیدار کی حالت قریب سے دیکھ چکا تھا، ناامیدی ہی ظاہر کرتا تھا۔ آخرکار یہ ننھا پودا دیکھتے ہی دیکھتے مرجھا گیا اور دیدار بخش کا انتقال ہوگیا۔ گھر میں ایک کہرام سابرپا ہوگیا۔ لوگوں نے دیدار بخش کو چھپانے کی کوشش کی مگر یہ راز، راز نہیں رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر دیدار بخش کی ماں نے اپنے لاڈلے کی لاش دیکھ لی تو یہ صدمہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجائے گا اور بہت ممکن ہے کہ ماں پر بھی دل کا دورہ پڑ جائے اور وہ چل بسیں۔ دیدار بخش کی لاش ان سے چھپادی گئی۔ ماں اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے کے لیے اتنی بے چین تھی کہ ایک ایک کی خوشامد کرتی پھرتی تھی کہ خدارا آخری بار اس کا دیدار تو کرادو ورنہ یہ حسرت زندگی بھر کے لیے رہ جائے گی۔

غم گساروں نے کہا۔ ''بی بی! جو ہونا تھا ہو چکا۔ مشیتِ ایزدی میں کس کو دخل ہے۔ صبر کرو کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

عزیز رشتے دار بچے کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ ماں نے کہا۔ ''میں یہ چاہتی ہوں کہ تدفین سے پہلے میرے بچے کی

شکل دکھا دی جائے۔"

لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا اور بالاتفاق یہ طے پا گیا کہ بچے کی شکل ضرور دکھا دینی چاہیے۔ کفن میں لپٹا ہوا بچہ ماں کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ماں نے حاضرین سے درخواست کی کہ کچھ دیر کے لیے سب باہر چلے جائیں تاکہ وہ اپنے بچے کو جی بھر کر دیکھ سکیں۔ لوگ باہر چلے گئے۔ ماں نے اٹھ کر پہلے تو دروازے کو اندر سے بند کر لیا اس کے بعد بچے کو گود میں لے کر دوسرے دروازے سے نکل گئی اور سجادہ درویش نادر علی شاہ کے پاس چلی گئی۔ یہ بزرگ اپنے غیر معمولی تصرفات اور کرامات میں غیر معمولی شہرہ رکھتے تھے۔ اس وقت شاہ صاحب آنکھیں بند کیے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ انہماک اور خود فراموشی کا یہ عالم تھا کہ کون آیا اور کون گیا، خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ ماں نے کفن اتار کر برہنہ بچہ نادر علی شاہ کے زانو پر رکھ دیا اور سامنے سے ہٹ گئیں۔ شاہ صاحب کے خادم نے انہیں اس حرکت سے منع کرنا چاہا لیکن اس خیال سے چپ رہا کہ اس کے بولنے سے شاہ صاحب کے مراقبے میں فتور پیدا ہو جائے گا لیکن وہ جیسے ہی وہاں سے ہٹیں، خادم نے ان کا راستہ روک لیا، پوچھا۔ "بی بی! یہ کسے شاہ صاحب کے زانو پر رکھ آئیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میں شیر محمد خان کی بیوہ اور اس بچے کی ماں ہوں۔ شوہر کے بعد بیٹا بھی چھین لیا گیا۔ اب میں اپنے دیدار بخش کو شاہ صاحب کے حوالے کیے جا رہی ہوں۔ وہ اس کا جو چاہیں کریں۔ دفن کرا دیں، گھوڑے پر پھنکوا دیں، اپنے پاس رکھیں، جو جی چاہیں کریں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔"

خادم نے کہا۔ "بی بی! یہ آپ نے کیا غضب کر دیا کہ مردہ بچے کو شاہ صاحب کے زانو پر رکھ آئیں۔"

اتنے میں شاہ صاحب نے خادم کو آواز دی۔ خادم نے خاتون سے کہا۔ "بی بی! ابھی جانا مت، میں ذرا شاہ صاحب کی بات سن لوں کیا فرماتے ہیں؟"

خادم شاہ صاحب کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ خادم نے پوچھا۔ "جی شاہ صاحب! فرمائیے میں حاضر ہوں۔"

شاہ صاحب نے پوچھا۔ "یہ میرے زانو پر گیلی گیلی کیا چیز رکھی ہے؟"

غلام نے ڈرتے ڈرتے سب کچھ بتا دیا۔ آپ نے بے پروائی سے کہا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔ مرحوم بچہ دیدار بخش ہے نا؟ یہ اس کو کیا ہو گیا؟"

خادم نے جواب دیا۔ "شاہ صاحب! میں نے عرض جو کیا کہ شیر محمد کی بیوہ کا یہ اکلوتا بیٹا تھا جو چیچک میں رخصت ہو گیا۔"

شاہ صاحب نے فرمایا۔ "اچھا تو یہ بات ہے مگر دیدار بخش تو ایک بزرگ ہستی کا باپ ہے۔ یہ مر کس طرح گیا؟" پھر خود ہی فرمایا۔ "یہ مرا نہیں ہے سکتہ ہو گیا ہوگا، اگر یہ مر گیا تو مشیتِ ایزدی کس طرح پوری ہوگی؟" پھر سوال کیا۔ "دیکھو، یہاں آس پاس کوئی گڑھا ہے جس میں پانی بھی ہو۔"

خادم نے جواب دیا۔ "جی شاہ صاحب! چھوٹا سا گڑھا ہے تو سہی، اس میں کچھ پانی بھی بھرا ہوا ہے۔"

شاہ صاحب نے حکم دیا۔ "تو پھر ایسا کرو کہ دیدار بخش کو پانی میں ڈال دو اور اس سے کہہ دو کہ اس سے کام نہیں چلے گا۔ بہت زیادہ سو لیے۔ اب جاگ بھی جاؤ۔"

خادم نے بچے کو اٹھا کر پانی میں ڈال دیا اور خاموشی سے پاس کھڑے ہو کر اس کا مشاہدہ کرنے لگا۔

دوسری طرف شاہ صاحب سجدے میں گر گئے اور رو رو کر فرمایا۔ "میرے مولا! میں نے لوحِ محفوظ میں دیدار بخش کو زندہ اور صاحبِ اولاد دیکھا ہے پھر یہ سب میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ دیدار بخش تو ایک عظیم شخص کا باپ ہے۔ اگر یہ دم ساد ھے قبر میں اتر گیا تو پھر وہ عظیم اور بزرگ شخص کس طرح آئے گا؟"

شاہ صاحب گڑگڑا رہے تھے اور خادم دیدار بخش کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے اچانک محسوس کیا کہ دیدار بخش کا ایک انگوٹھا حرکت میں ہے پھر پورے ہاتھ کو حرکت ہوئی۔ اس کے بعد دونوں پاؤں سکیڑ لیے اور آخر میں آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

خادم نے دیدار بخش کو گود میں لے لیا اور شاہ صاحب کے زانو پر بٹھا دیا۔ شاہ صاحب مسکرائے لیکن ان کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ پوچھا۔ "اس کی ماں کہاں ہے؟"

خادم نے جواب دیا۔ "باہر موجود ہے۔"

شاہ صاحب نے فرمایا۔ "اس کو بلاؤ۔"

خادم دیدار بخش کی ماں کو بلا لایا۔ انہوں نے اپنے زندہ بیٹے کو شاہ صاحب کے زانو پر بیٹھے پایا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

پوچھا۔ ”کیا یہ دیدار بخش ہے، میرا بیٹا، میرا لاڈلا؟“
شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”بی بی! زیادہ باتیں نہ کر اور اس کو اپنے گھر لے جا۔“
ماں نے جواب دیا۔ ”شاہ صاحب! اب یہ آپ کا بھی بیٹا ہے۔ اس کو آپ اپنے پاس ہی رکھ لیجیے۔ میں اپنے گھر لے جا کر کیا کروں گی؟“
شاہ صاحب نے سکوت اختیار فرمایا۔ اس کے بعد کہا۔ ”اچھا اگر یہ بات ہے تو مجھ کو یہ بات بھی منظور ہے۔ میں ہی اس کی پرورش کرلوں گا۔“
جہاں خیلیوں میں جب نادر علی شاہ کی اس کرامت کا چرچا ہوا تو ہر کوئی ان کی زیارت کو پہنچنے لگا۔ شاہ صاحب دیدار بخش کی پرورش خود ہی کرنے لگے۔

☆☆☆

دیدار بخش کی پرورش اور تعلیم و تربیت نادر علی شاہ فرمانے لگے۔ یہاں تک کہ جب یہ چوبیس سال کے ہو گئے تو شاہ صاحب سے خرقۂ خلافت اور دستارِ فضیلت سے سرفراز فرمائے گئے۔ نادر علی شاہ ایک سو پچیس سال کی عمر میں وصال فرما گئے۔ دیدار بخش غمگین اور دل برداشتہ کشمیر چلے گئے اور وہیں ملازمت کرلی تینتیس سال کی عمر میں ان کی ملاقات ایک مجذوب سے ہوگئی۔ ان مجذوب کا نام احمد شاہ تھا۔ دیدار بخش کو جب بھی چھٹی ملتی، مجذوب احمد شاہ کی خدمت میں چلے جاتے۔
ایک دن احمد شاہ نے آنکھیں کھول کر دیدار بخش کی طرف دیکھا اور خوش ہو کر فرمایا۔ ”دیدار بخش! کیا تو نے شادی کرلی؟“
دیدار بخش نے جواب دیا۔ ”ابھی تو شادی نہیں کی میں نے۔“
احمد شاہ نے فرمایا۔ ”پھر اپنے وطن واپس جا اور شادی کرلے کیونکہ جس قطب کو آنا ہے، وہ ضرور آئے گا اور اس کے لیے شادی بہت ضروری ہے۔“
دیدار بخش نے جواب دیا۔ ”حضرت! شادی کرنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ جو وقت خدا کی یاد میں بسر ہو جائے بہت غنیمت ہے۔ شادی کے بعد انسان بیوی بچوں میں پھنس کر خدا کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے۔“
احمد شاہ نے اصرار کیا۔ ”کچھ بھی سہی، شادی تجھ کو کرنا ہی پڑے گی۔“
دیدار بخش مجبور ہو گئے اور کشمیر کے راجا سے رخصت لے کر وطن روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر دینا نگر نامی گاؤں میں ان کی ملاقات ایک اور درویش سے ہوئی۔ انہوں نے دیدار بخش کو دیکھتے ہی فرمایا۔ ”کیا تو شادی کرنے جا رہا ہے؟“
دیدار بخش نے جواب دیا۔ ”ارادہ تو یہی ہے لیکن پتا نہیں شادی ہوگی بھی یا نہیں اور پھر یہ کہ مجھ سے شادی کون کرے گی؟“
درویش نے کہا۔ ”میاں جو تم نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ ضلع ہوشیار پور جا رہے ہو نا؟“
دیدار بخش نے جواب دیا۔ ”ہاں! وہیں جا رہا ہوں۔“
درویش نے انہیں سمجھایا۔ ”ہوشیار پور کے موضع میانی سے پرے جلال خان نامی ایک بستی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں تمہاری شادی ہوگی۔ تیری بیوی کا نام زہرہ خاتون ہوگا۔ اس کے بطن سے وہ ولی پیدا ہوگا جس کی کئی درویش بشارتیں دے چکے ہیں۔“
دیدار بخش سیدھے بستی جلال خان پہنچ گئے۔ اس بستی میں وہ لوگ آباد تھے جن کی رشتے داریاں جہاں خیلاں والوں سے چلی آ رہی تھیں۔ یہاں پر دیدار بخش کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گامن خان نامی ایک معزز شخص نے دیدار بخش کی بڑی خاطر مدارات کی اور خود ہی اپنی بیٹی زہرہ خاتون کا رشتہ پیش کیا۔ دیدار بخش سناٹے میں رہ گئے۔ انہوں نے گامن خان سے کہا۔ ”جناب! مجھے آپ سے اتفاق ہے اور میں آپ کی فرزندی میں آنے کو تیار ہوں لیکن یہ تمام باتیں بڑوں کی طرف سے طے پائیں گی۔ میں اپنے خاندان میں واپس جا رہا ہوں، وہ لوگ رشتہ مانگنے آئیں گے۔“
گامن خان کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، راضی ہو گئے۔ دیدار بخش جہاں خیلاں واپس آ گئے اور اپنے بزرگوں کو رشتہ مانگنے کی غرض سے بستی جلال خان بھیج دیا۔ رشتہ منظور ہوا اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ آخر دیدار بخش جہاں خیلاں والوں کے ساتھ مقررہ تاریخ پر بستی جلال خان پہنچ گئے۔ یہ بستی جہاں خیلاں سے تیس میل کے فاصلے پر آباد تھی۔ شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔
انہی خاتون سے بروز دوشنبہ 17 شوال 1237ھ (1822ء) ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچے کا نام قادر بخش رکھا گیا۔ دیدار بخش اس بچے میں وہ ساری باتیں محسوس کر رہے تھے جو انہیں مختلف درویشوں کی پیش گوئیوں سے معلوم ہوتی رہی تھیں۔
قادر بخش پانچ سال کے ہوئے تو انہیں قرآن پاک کی تعلیم دی جانے لگی۔ دیدار بخش اپنی ملازمت پر واپس کشمیر چلے گئے

لیکن جانے سے پہلے اپنی بیوی کو بطورِ خاص نصیحت کی کہ ان کی عدم موجودگی میں بھی قادر بخش کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی جائے۔ قادر بخش نے دوسال کی مدت میں قرآن پاک کو ختم کیا۔ اب یہ سات سال کے تھے۔ دیدار بخش نے کشمیر سے آکر بیٹے کی کامیابی پر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ انہیں اپنے بیٹے میں وہ تمام آثار نظر آرہے تھے، جن کا ایک عرصے سے تذکرہ ہوتا آرہا تھا۔ انہوں نے کشمیر واپس جانے سے پہلے اپنے سات سالہ بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے قادر بخش! میں اپنی ملازمت پر واپس کشمیر جارہا ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ بہرحال میں تم سے یہی کہوں گا کہ اپنی تعلیم پر خاص توجہ دینا اور میری روح کو شرمندہ نہ ہونے دینا۔''

دیدار بخش واپس کشمیر چلے گئے اور کچھ دنوں بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین بھی کشمیر ہی میں ہوئی اور وہاں یہ پنجابی پیر کے نام سے مشہور ہوئے۔ قادر بخش پر اپنے باپ کی وفات کا بڑا اثر ہوا مگر تعلیم کی حصول یابی میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ اردو، فارسی اور دینی تعلیم میں خاص ملکہ حاصل کر چکے تھے۔ پھر وہ کھیتی باڑی میں مصروف ہو گئے۔

جب چودہ سال کے ہوئے تو معلوم نہیں کس بات پر ان کا دل اپنے آبائی گاؤں سے اکتا گیا اور وہ جہاں خیلاں کی سکونت ترک کرکے تن تنہا لدھیانہ میں جا بسے اور انگریز فوج میں ملازم ہو گئے۔ انہی دنوں انگریزوں اور افغانوں میں جنگ چھڑ گئی اور انگریزوں نے کابل پر چڑھائی کر دی۔ قادر بخش کو بھی کابل جانا پڑا۔ جنگ ختم ہوئی۔ انگریز فوجیں واپس ہوئیں لیکن قادر بخش انگریزوں کی ملازمت چھوڑ کر کابل ہی میں رہ گئے۔ یہ پانچ سال تک کابل میں رہے۔ ان کا دل دنیا سے اکتا چکا تھا۔ یہ اکثر روتے رہتے۔ ان کا دل بے حد گداز تھا۔ ان دنوں کابل میں قادری سلسلے کے شاہ عنایت اللہ کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ ان کے پاس پہنچے اور ان کی مریدی اختیار کر لی۔ شاہ عنایت اللہ نے انہیں اپنا خلیفہ بنا کر رخصت کر دیا۔ یہ پشاور کی راہ سے واپس آئے اور کچھ عرصہ لاہور میں قیام کیا۔ لاہور سے سنگھڑ شریف پہنچے اور اپنے عہد کے یگانۂ روزگار صوفی شاہ سلیمان تونسوی کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ سلسلہ چشتیہ کے بزرگ تھے۔ قادر بخش ان کی نسبت اور خلافت لے کر کشمیر چلے گئے۔ باپ کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھی اور گڑگڑا کر عرض کیا۔ ''بابا جان! آپ اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں ورنہ آپ خود ملاحظہ فرماتے کہ میں نے آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دیا۔''

یہاں سے فارغ ہوئے تو سید احمد نامی درویش کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ سہروردیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ قادر بخش نے ان سے بھی خلافت حاصل کر لی۔ یہاں سے جالندھر پہنچے۔ ان دنوں جالندھر اور اس کے آس پاس دور دور تک حاجی محمود کا بڑا چرچا تھا۔ قادر بخش بھی ان سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست محمد بخش سے پوچھا۔ ''بھائی میرے! کسی ایسے شخص کا نام بتا جس کی مریدی پر میں فخر کر سکوں۔''

محمد بخش نے جواب دیا۔ ''بھائی قادر بخش! یہاں تو حاجی محمود ہی ایک ایسے بزرگ ہیں جو خدا کا نام لینا سکھا دیتے ہیں۔ اگر چاہو تو ان سے ملاقات کر لو۔''

قادر بخش نے کہا۔ ''تب تو پھر تو مجھ کو ان کے پاس لے چل۔ میں ان سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہوں۔''

محمد بخش انہیں ساتھ لے کر حاجی محمود کی خدمت میں پہنچ گیا۔ قادر بخش کی حاجی محمود پر جیسے ہی نظر پڑی، ان کے دل کی دنیا زیروزبر ہو کر رہ گئی۔ دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

کچھ دیر بعد حاجی محمود نے مراقبے سے اپنا سر اٹھایا اور پوچھا۔ ''یہ تو کیوں رو رہا ہے؟ تجھے یہ ہو کیا گیا ہے؟''

قادر بخش نے روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! میں نے یہاں آتے ہی اپنے آپ میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوتے محسوس کر لی ہیں۔ میں آپ کی صحبت میں رہنا اور کچھ وقت دینا چاہتا ہوں لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ میں ملازم ہوں اور ملازم ہونے کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضری دینا مشکل ہے مگر اب جبکہ میں آ گیا ہوں تو خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔''

حاجی محمود نے جواب دیا۔ ''بچے تو گھبراتا کیوں ہے۔ تیرا ہر کام ہو جائے گا، کوئی کام رکے گا نہیں۔ ادھر تو نیت کرے گا، دوسری طرف تیرے کام بنیں گے۔''

قادر بخش نے عرض کیا۔ ''حضرت! تسلیوں سے کام نہیں چلے گا۔ میں تو آپ سے کچھ لے کر رہوں گا۔''

حاجی محمود نے فرمایا۔ ''اچھا، پہلے اللہ کا نام تو سیکھ لے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔''

قادر بخش حاجی محمود کی خدمت میں رہنے لگے۔ یہاں پیر و مرشد نے اپنے ارادت مند کی تربیت شروع کر دی اور کچھ ہی دنوں میں وہ اثر ظاہر ہوا کہ خود حاجی محمود کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے قادر بخش سے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، تجھ کو اپنے پیر و مرشد مولوی محمد شریف کے پاس لے چلوں۔''

قادر بخش نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں آپ کا بندۂ بے دام ہوں۔ جہاں فرمائیں گے، آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''
حاجی محمود، قادر بخش کو اپنے پیرومرشد کے پاس لے گئے اور استدعا کی۔ ''قادر بخش کو اپنا مرید فرمالیں۔''
مولوی محمد شریف نے قادر بخش کو بڑی توجہ کی نظر سے دیکھا۔ ''لیکن حاجی محمود! میں تو اس میں کچھ اور ہی دیکھ رہا ہوں۔''
حاجی محمود نے دوبارہ درخواست کی۔ ''حضرت! میری استدعا ہے کہ قادر بخش کو آپ مرید کرلیں۔''
مولوی صاحب نے فرمایا۔ ''لیکن اس میں تو پہلے ہی سے بزرگی کے آثار ہیں اور اس بزرگی میں تیرے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس کو میں کیا مرید کروں، یہ تو تیرا پہلے ہی مرید ہو چکا ہے۔''
حاجی محمود نے لجاجت سے کہا۔ ''حضرت! آپ کی موجودگی میں بھلا......''
مولوی شریف نے سختی سے حکم دیا۔ ''بھلا و لا کچھ نہیں۔ تو مرید کر، میرے سامنے مرید کر۔ میں اسی میں خوش ہوں۔''
حاجی محمود نے اپنے پیرومرشد کے حکم پر قادر بخش کو مرید کرلیا۔ اب مرید نے اپنے پیرومرشد کی چوکھٹ کو مستقلاً پکڑلیا۔ دنیاداری سب چھوٹ گئی۔ حاجی محمود نے پوچھا۔ ''کیا تو اپنے کام پر واپس نہیں جائے گا؟''
قادر بخش نے جواب دیا۔ ''اب میں اس در کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔''
حاجی صاحب نے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے تو بین بہت اچھی بجاتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟''
قادر بخش نے جواب دیا۔ ''کبھی بین بجایا کرتا تھا پیرومرشد۔ لیکن اب آپ کی صحبت اور تربیت کے طفیل ایک اور ہی بین بجانے لگا ہوں۔''
حاجی صاحب نے اصرار کیا۔ ''ذرا مجھ کو تو سنا بین۔''
مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! مجھ کو شرمندہ نہ کیجیے۔''
حاجی صاحب نے مزید اصرار نہیں کیا، فرمایا۔ ''اچھا تیری مرضی۔''
اب قادر بخش کا یہ حال ہو چکا تھا کہ کسی وقت بھی اپنے پیرومرشد سے جدا ہونے کو تیار نہ ہوتے۔ ان کی ماں ابھی بقید حیات تھیں اور بیٹے کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا کرتیں۔ کچھ دنوں تک تو بیٹے کی غیر حاضری کا کوئی خاص سبب نہیں معلوم ہوسکا لیکن جب تجسس بڑھا تو یہ بات بھی ان کے علم میں آگئی کہ بیٹے نے حاجی محمود کے ہاتھ پر بیعت کر کے درویشی اختیار کرلی ہے۔ یہ دل ہی دل میں مشتعل اور آگ بگولا حاجی محمود کی خدمت میں پہنچ گئیں، اپنے بیٹے کو حاجی محمود کی خدمت میں مؤدبانہ بیٹھا دیکھ کر وہ گرم ہوگئیں۔ بیٹے سے پوچھا۔ ''بیٹے قادر بخش! تو نے کیا حال بنایا ہے۔''
قادر بخش نے پوچھا۔ ''ماں! کیا میرا حال برا نظر آرہا ہے آپ کو؟''
ماں نے کہا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں ہے بیٹے۔ میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کہ تو نے درویشی کیوں اختیار کرلی؟ اس میں کیا راز ہے؟''
قادر بخش نے جواب دیا۔ ''ماں! یہ دنیا مسافر خانہ ہے پھر میں اس سے دل لگا کر کیا کروں؟''
ماں نے عاجزی سے کہا۔ ''لیکن بیٹے میرے تو بڑے ارمان ہیں۔ وہ کس طرح پورے ہوں گے؟''
قادر بخش نے جواب دیا۔ ''ماں! دنیا کے جال میں مت پھنسیے۔ جو اس جال میں پھنسا، اس کا برا حال کر دیتی ہے دنیا۔ فکر وہاں کی کیجیے گا جہاں مستقل رہنا ہے۔''
ماں، بیٹے کی باتوں سے زچ ہو کر حاجی محمود کی خدمت میں پہنچ گئیں اور کہا۔ ''بھائی صاحب! یہ آپ نے کیا کر دیا؟''
حاجی محمود نے پوچھا۔ ''میں نے کیا کر دیا؟''
ماں نے جواب دیا۔ ''آپ نے میرے بیٹے کو درویش بنالیا۔ آخر کیوں؟''
حاجی صاحب نے فرمایا۔ ''تیرے بیٹے کو میں نے درویش نہیں بنایا۔ اس کو تو اللہ نے پہلے ہی سے درویش بنا رکھا تھا۔ میں نے تو بس ذرا سی جلا دے دی ہے اس کی درویشی میں۔''
ماں کو رونا آگیا۔ بولیں۔ ''لیکن میں اب کیا کروں؟''
حاجی صاحب نے جواب دیا۔ ''بیٹے کی اختیار کردہ راہ پر تو بھی چل پڑ۔ بس اسی میں نجات ہے۔''
ماں پر مایوسی کا اتنا غلبہ تھا کہ اس کے زیرِ اثر بولیں۔ ''میں آپ کی مریدی کا حلقہ اپنے گلے میں ڈالنا چاہتی ہوں۔''
حاجی محمود نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا اور قادر بخش کی ماں بھی حاجی صاحب کے مریدوں میں داخل ہوگئیں۔ قادر بخش کو جب یہ خبر ملی تو وہ دیوانہ وار ماں کی خدمت میں پہنچے اور انہیں سینے سے لگا کر رونا شروع کر دیا۔ قادر بخش کے گریہ نے ماں کو بھی متاثر

کیا اور وہ بھی رونے لگیں۔

ایک دن حاجی محمود نے قادر بخش کو طلب کیا اور انہیں حکم دیا ”اب کہیں ملازمت کرلو۔“

قادر بخش نے جواب دیا۔ ”حضرت! اگر میں ملازمت کروں گا تو اس سے میری عبادت اور ریاضت میں فرق آجائے گا۔“

حاجی صاحب نے سختی سے فرمایا۔ ”یہ میری ہی نہیں، تیری ماں کی بھی خواہش ہے۔“

قادر بخش نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ لوگ مجھے دنیاداری میں پھنسانا چاہتے ہیں۔“

حاجی صاحب نے نرمی سے سمجھایا۔ ”قادر بخش! میں تجھ کو ایک ایسی ملازمت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جہاں لوگوں کی خدمت کا موقع ملے گا اور اگر تو اس جگہ اپنے زہد اور تقویٰ پر قائم رہا تو تیرے درجات بلند ہوں گے اور وہاں کا تیرا ہر نیک عمل ثواب اور بزرگی میں اضافے کا سبب بنے گا۔“

قادر بخش نے پوچھا۔ ”ایسی کون سی ملازمت ہے پیر و مرشد؟“

حاجی صاحب نے جواب دیا۔ ”پولیس کی ملازمت۔ پولیس کی ملازمت تیرے لیے آزمائش ثابت ہوگی۔ اگر تو نے اس ملازمت میں خود کو سنبھالے رکھا تو تجھے وہ مقام حاصل ہوجائے گا کہ دوسرے ایک عمر کی ریاضتِ شاقہ کے بعد بھی وہ مقام حاصل نہیں کرسکتے۔“

مرشد کا حکم اور ماں کی خواہش پر قادر بخش مجبور ہوگئے۔ انہوں نے محکمۂ پولیس میں ملازمت کرلی اور راہوں نامی ایک قصبے میں تعینات ہوگئے۔ ان کی عادات اور اطوار پولیس والوں سے مختلف تھیں۔ محکمے کے لوگ ان کی ایمان داری، خداترسی اور خدمتِ خلق سے تنگ آگئے۔ قادر بخش ہمیشہ مجرموں اور بے گناہوں سے ایک جیسا سلوک نہیں کرتے تھے۔ جب تک کسی کا جرم ثابت نہیں ہوجاتا، اس کے خلاف کوئی ضابطے کی کارروائی نہ کی جاتی۔ کسی بے گناہ کو ستایا نہ جاتا۔ رشوت نام کی کسی چیز کا آپ کو گویا علم ہی نہ تھا اور زندگی بڑی عسرت میں بسر ہو رہی تھی۔

انگریز ان کی دیانت داری اور ایمان داری سے اتنے خوش ہوئے کہ وہ ڈپٹی انسپکٹر بنادیے گئے اور کچھ عرصے بعد انسپکٹر بن گئے۔

راتوں کو تہجد گزاری اور شب بیداری کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کے روحانی تصرفات نے ارادت مندوں کو ان کے اردگرد جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ محکمۂ پولیس کے لوگوں کو بھی آپ کے مقام کا کسی حد تک اندازہ ہوگیا تھا۔ ایک رات تقریباً ایک بجے انہوں نے اپنے مرید امیر خان کو آواز دی، پوچھا۔ ”امیر خان! کیا سوگئے؟“

امیر خان فوراً ہی ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ بولے۔ ”جی میں بیدار ہوں، کوئی حکم؟“

آپ نے فرمایا۔ ”سلیمان خان جمعدار کو بلاؤ۔ ابھی ابھی میرے حلقے سلیم پور میں ایک قتل ہوگیا ہے۔“

امیر خان نے پوچھا۔ ”حضرت! کیا کوئی بلانے آیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی ابھی میں مراقبے میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ یاسین اور اکرم اپنے چچا کے بیٹے قربان علی کو قتل کررہے ہیں۔ ان دونوں نے مقتول کو دریا کے کنارے ایک جھاڑی میں ڈال دیا اور اپنے گھر میں جاکر سوگئے۔“

امیر خان نے سلیمان خان کو بلادیا۔ آپ نے سلیمان خان کو ہدایت کی۔ ”سلیمان خان! تم چند سپاہیوں کو لے کر دریا کے کنارے اس جھاڑی کے پاس پہنچ جاؤ جو شیشم کے ایک پیڑ تلے ہے۔ اس جھاڑی میں قربان علی کی لاش پڑی ہے۔ اس کو اپنے قبضے میں کرو اور پھر مقتول کے چچازاد بھائی اکرم اور یاسین کے پاس جاؤ اور انہیں گرفتار کرکے میرے پاس لے آؤ۔“

سلیمان خان کو حکم ماننے میں تامل ہوا، پوچھا۔ ”حضرت! کیا کسی نے پرچہ چاک کرایا تھا اس قتل میں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں جو کہہ رہا ہوں۔ پرچہ بعد میں چاک کردیا جائے گا۔“

سلیمان خان اپنے ساتھ چند سپاہیوں کو لے کر مذکورہ جھاڑی میں پہنچا تو وہاں قربان علی کی لاش مل گئی۔ ان سب کو بڑی حیرت ہوئی مگر ابھی قاتلوں کی گرفتاری باقی تھی۔ سلیمان مقتول کے چچازاد بھائی اکرم اور یاسین کے پاس پہنچا اور دونوں کو گرفتار کرکے قادر بخش کے پاس لے آیا۔ اس عجیب وغریب واقعے نے ہر کسی کو ششدر اور حیرت زدہ کردیا۔ انہوں نے قاتلوں سے پوچھا۔ ”مقتول نے تم دونوں کا کیا بگاڑا تھا؟ اس کو کیوں قتل کیا؟“

اکرم نے جواب دیا۔ ”میں نے اس کو قتل نہیں کیا۔ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا جارہا ہے۔“

یاسین نے کہا۔ ”میں بھی اپنی بے گناہی کا اعلان کرتا ہوں۔ میں تو مقتول کا چچازاد بھائی ہوں پھر میں اس کو کیسے قتل کرسکتا تھا؟“

آپ نے دونوں سے کہا۔ ”دیکھو جھوٹ بولنے سے کچھ حاصل نہیں۔ تم دونوں مقتول کی زمین ہتھیانا چاہتے تھے اس لیے اس کو

قتل کر دیا اور اب زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ تم دونوں اپنے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف قتل کے منصوبے بنا رہے ہو۔"
اکرم کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ گھبرا کر بولا۔ "نہیں حضرت! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں۔"
یاسین نے اکرم کو جھڑک دیا۔ "تو غلط کہہ رہا ہے۔ تو نے ایسا ضرور سوچا ہوگا لیکن وہ تو خیریت یہ گزری کہ خواجہ قادر بخش انسپکٹر نے اس کا انکشاف کر دیا۔"
اکرم نے کہا۔ "اب زبان نہ کھلواؤ۔ قربان علی کے قتل کا منصوبہ بھی تم ہی نے بنایا تھا۔ مجھ کو تو اس میں مجبوراً شریک ہونا پڑا ہے اور اب میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔"
یاسین نے زیادہ گرمی دکھائی، غصے میں بولا۔ "اب زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ قربان علی کی پشت سے اس کی گدی پر گنڈاسے کا بھرپور ہاتھ کس نے رسید کیا تھا؟"
اکرم نے اشتعال میں بکنا شروع کر دیا۔ "بے شک میں نے گنڈاسے سے اس کی گدی پر حملہ کیا تھا لیکن میرا وار اوچھا پڑا تھا۔ قربان علی کا پیٹ تو تم نے چاک کیا تھا۔"
خواجہ قادر کا مرید امیر خان اور پولیس کے سلیمان خان اور سپاہی حیرت زدہ تھے کہ دونوں کتنی آسانی سے اقبالِ جرم کر رہے ہیں۔ ان کے اس یقین میں زیادہ مضبوطی آ گئی کہ خواجہ قادر صاحب کمال روحانی شخص ہیں۔
دونوں قاتلوں پر مقدمہ چلا اور انہیں موت کی سزا سنا دی گئی۔ لیکن محکمۂ پولیس کا ایک ایک فرد خواجہ قادر کا قائل ہو چکا تھا۔ محکمے میں ایسے بھی لوگ تھے جو ان کے روحانی تصرفات کے قائل نہیں تھے۔ وہ آپس میں باتیں کرتے تو خواجہ قادر کا مذاق اڑاتے اور کہتے۔ "جناب! انسپکٹر صاحب کو اس قتل کے بارے میں کسی نے سب کچھ ضرور بتا دیا ہوگا۔ ورنہ انہیں اتنی بہت ساری باتیں کشف سے نہیں معلوم ہو سکتیں۔"
کوئی دوسرا کہتا۔ "ہاں، کسی نہ کسی نے مخبری ضرور کی ہوگی۔"
اس واقعے کو گزرے ایک سال کا عرصہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایک رات وہ مراقبے سے نکل کر باہر آ گئے اور سلیمان خان کو حکم دیا۔
"گھوڑا تیار کرو میرے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔"
سلیمان خان نے پوچھا۔ "حضرت جی، جانا کہاں ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "ساہوکار اللہ دتہ کے گھر۔"
سلیمان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیا آج ساہوکار کو بھی کسی نے قتل کر دیا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "نہیں بلکہ ساہوکار کے گھر چوری ہو گئی ہے۔ بہت بڑی چوری ہوئی ہے اور میں نے چوروں کو پہچان لیا ہے۔"
سلیمان خان نے کہا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہے تو وہاں آپ کیوں جائیں، ہمیں حکم دیجیے۔ چوروں کے نام اور پتے بتا دیجیے، ہم ساہوکار سے چوری کی تصدیق کر کے چوروں کو پکڑ لائیں گے۔"
آپ نے فرمایا۔ "اچھا چلو، یوں ہی سہی۔ ذرا جمعدار غلام محمد کو بھی بلوا لو کیونکہ وہ ساہوکار سے بھی واقف ہے اور چوروں کو بھی پہچانتا ہے۔"
سلیمان نے اسی وقت غلام محمد جمعدار کو بلوا لیا۔ آپ نے غلام محمد کو حکم دیا۔ "غلام محمد! تو سلیمان خان اور چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر ساہوکار اللہ دتہ کے گھر چلا جا اور اس سے پوچھ کہ تیرا کیا کیا سامان چوری ہوا ہے۔ سامان کی فہرست تیار کر کے سکندر، رحمت اور نتھا کے گھروں پر چلا جا، یہ تینوں راج ہیں۔ مکان بناتے ہیں۔ یہی تینوں چور ہیں۔ سکندر کے گھر کے باہر بھوسے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ تینوں نے چوری کا مال اسی بھوسے کے انبار میں چھپایا ہے۔ وہاں سے سامان برآمد کر کے ساہوکار کی فہرست سے ملا لو اور تینوں چوروں کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔"
سلیمان خان اور غلام محمد جو کچھ سن رہے تھے، اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن ان کے کمالات اور تصرفات ثابت ہو چکے تھے۔ اس لیے مجبوراً ساہوکار اللہ دتہ کے گھر پہنچ گئے۔ ساہوکار نے پولیس کو اپنے در پر دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ "تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟"
غلام محمد نے جواب دیا۔ "انسپکٹر خواجہ قادر بخش نے۔"
ساہوکار نے پوچھا۔ "مگر کس لیے؟"
غلام محمد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "وہ فرماتے تھے کہ انہوں نے مراقبے میں دیکھا ہے کہ تمہارے گھر میں چوری ہو گئی ہے،

بہت بڑی چوری۔“
ساہوکار رونے لگا۔ ”مگر اس چوری کی خبر انہیں کس نے دی؟ میں تو برباد ہو گیا، تباہ ہو گیا، لٹ گیا۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔“
غلام محمد نے کہا۔ ”تم اپنے مسروقہ مال کی ایک فہرست تیار کرا دو، چور ابھی پکڑے جائیں گے اور تمہارا سامان بھی برآمد ہو جائے گا۔“
ساہوکار نے مسروقہ مال کی فہرست تیار کر دی۔ اس کے بعد غلام محمد اور سلیمان خان سپاہیوں کے ساتھ دریاپور نامی بستی میں گئے کیونکہ سکندر، رحمت اور نتھا راج اس بستی میں رہتے تھے۔ تینوں اپنے اپنے گھروں میں سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے دروازوں پر پولیس دیکھی تو پریشان بھی ہوئے اور خوفزدہ بھی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ان کی مخبری کس نے کر دی۔ غلام محمد اور سلیمان خان نے ان تینوں کو گرفتار کر لیا اور سکندر کے دروازے پر بھوسے کے انبار میں سے چوری کا مال برآمد کر لیا۔ چوروں کو سامان سمیت انسپکٹر خواجہ قادر بخش کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ یہ لوگ صبح تک حوالات میں رہے۔
صبح کو ساہوکار اللہ دتہ کو بھی بلوا لیا گیا۔ تینوں چور آپس میں شک و شبہ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہی میں سے کسی نے مخبری کر کے پکڑا دیا ہے۔ تینوں آپس میں جھگڑنے لگے اور ایک دوسرے کو الزام دینے لگے۔
غلام محمد نے ان تینوں سے کہا۔ ”ارے احمقو! تم آپس میں بلاوجہ جھگڑ رہے ہو۔ جب تک ہمارے درمیان انسپکٹر خواجہ قادر بخش موجود ہیں، ہمیں کسی کی مخبری کی ضرورت ہی نہیں۔“
چور ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ غلام محمد نے کہا۔ ”ایک دوسرے کی شکل کیا دیکھتے ہو۔ تم لوگ اندھے ہو کہ اپنے علاقے کے باکمال روحانی شخص کو نہیں جانتے۔“
اتنے میں ان کے درمیان خواجہ قادر بخش بھی پہنچ گئے۔ ساہوکار انہیں دیکھتے ہی ادب سے کھڑا ہو گیا۔ آپ نے چوروں سے پوچھا۔ ”تم چوریاں کیوں کرتے ہو؟“
ایک نے جواب دیا۔ ”حضرت! عادت سی پڑ گئی ہے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”یہ عادت چھوڑ دو کیونکہ اس عادت سے دین اور دنیا دونوں برباد ہو رہے ہیں۔“
دوسرے نے جواب دیا۔ ”کوشش تو بہت کی مگر کامیابی نہیں ہوتی۔“
آپ نے تیسرے سے پوچھا۔ ”اور تم کیا کہتے ہو؟“
اس نے جواب دیا۔ ”اب ان دونوں کے بعد میں کیا کہوں؟ اپنا بھی وہی حال ہے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”دیکھو، میں اس وقت یہاں کا انسپکٹر پولیس ہی نہیں، مصلح بھی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ سدھر جاؤ کیونکہ جس طرح میں اپنے محکمے کے افسران کے روبرو جواب دہ ہوں، اسی طرح دوسری دنیا میں اپنے رب کے سامنے بھی جواب دہ ہوں۔ اگر میں تم لوگوں کی اصلاح میں کامیاب ہو گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں دین اور دنیا میں سرخروئی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“
آپ کی تقریر کا تینوں پر بڑا اثر ہوا، ایک نے کہا۔ ”اس چوری کے مقدمے میں ہمیں سزا تو ہو ہی جائے گی۔ ہمیں سزا کاٹ لینے دیجیے۔ اس کے بعد ہم اپنی اصلاح کی کوشش کریں گے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”اگر تم تینوں اسی وقت توبہ کر لو تو میں اس مقدمے کو آگے نہیں جانے دوں گا۔ یہیں رفع دفع کر دوں گا۔“
ایک چور نے ساہوکار کی طرف دیکھا۔ ”آپ اگر معاف بھی کر دیں گے تو یہ ساہوکار ہمیں کیوں معاف کرنے لگا۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”میں اس سے بھی معافی دلوا دوں گا۔“
تینوں چوروں کے چہروں پر بشاشت دوڑ گئی۔ تقریباً ایک ساتھ جواب دیا۔ ”اگر ایسا ہو گیا تو ہم بھی وعدہ کرتے ہیں کہ چوری سے توبہ کر لیں گے۔“
آپ نے ساہوکار کی طرف دیکھا۔ ”بول! تو کیا کہتا ہے؟“
ساہوکار نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں کیا کہوں گا۔ میں تو آپ کی منشا اور حکم کا تابع ہوں۔ جو فرمائیں گے، اس پر عمل کروں گا۔ میرا سارا سامان تو مل ہی چکا ہے۔ اس کے سوا مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔“
آپ نے ان تینوں کو رہا کر دیا۔ فرمایا۔ ”اب تم جا سکتے ہو مگر یاد رکھو۔ تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے، اس سے منحرف ہرگز نہ ہونا۔“
سپاہیوں نے آپ کے حکم پر انہیں رہا کر دیا۔ ساہوکار نے اپنا سامان سمیٹا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ تینوں چور وہیں بیٹھے رہے۔

اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔
آپ نے ان سے کہا۔ ''اب تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ جاؤ، اپنے اپنے گھر جاؤ اور اپنے وعدے پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔''
ایک نے عرض کیا۔ ''حضرت! ہم تینوں نے ابھی ابھی یہاں یہ مشورہ کیا ہے کہ آپ کے حکم پر عمل کس طرح کیا جائے۔ آخر یہی طے پایا کہ اس در کو چھوڑ کر کہیں اور جانا فضول ہے۔ اب آپ ہمیں اپنا بنا لیجیے تاکہ ہماری آخرت سدھر جائے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''جیسی تمہاری مرضی، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''
چنانچہ تینوں چور توبہ کر کے آپ ہی کے پاس رہ گئے اور انہوں نے اتنی عبادت و ریاضت کی کہ بعد میں ان کا شمار بھی اہلِ اللہ میں ہونے لگا۔

☆☆☆

آپ تھانہ راہوں کے باہر کھڑے تھے کہ ایک طرف سے شور و غل بلند ہوا۔ سامنے سے ایک گھوڑا سرپٹ بھاگا چلا آ رہا تھا اور لوگ چیخ چیخ کر راہ گیروں کو خبردار کر رہے تھے کہ ہوشیار خبردار گھوڑا سرکش ہے لوگوں کو زخمی کر رہا ہے۔
آپ گھوڑے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اپنی انگشت شہادت اس کی طرف اٹھا کر فرمانے لگے۔ ''گھوڑے، یہ کیسی سرکشی ہے کہ بے گناہوں کو زخمی کر رہا ہے۔ بہت بھاگ دوڑ کر لی۔ اب رک جا اور آرام کر، ذرا سستا لے۔''
گھوڑا آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگوں نے چاروں طرف ہجوم کیا اور اس حیران کن منظر کو دیکھنے لگے۔ آپ گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور گھوڑا نہایت فرماں برداری سے اپنی دم کو بار بار ہلا رہا تھا۔ آپ نے مزید فرمایا۔ ''میری بات سمجھ لی؟ اب تو سرکشی نہیں کرے گا۔ کبھی بھی نہیں۔''
اور اس کے بعد واقعی کسی نے بھی اس گھوڑے کو سرکشی اختیار کرتے نہیں دیکھا۔
ایک مولوی پیر محمد چوبیس میل دور سے مدرسے میں بچوں کو پڑھانے آیا کرتے تھے۔ صبح فجر کے بعد وہ اپنے گھر سے چل دیتے تھے اور شام کو مغرب کے وقت اپنے گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔ سواری کے لیے ان کے پاس ایک تیز رفتار گھوڑی تھی۔
ایک دن دوپہر کو اپنے گھر جو جانے لگے تو آپ نے فرمایا۔ ''پیر محمد! ذرا ہوشیاری سے سفر کیا کر۔ سنتا ہوں، راہ میں درندے گھومتے دیکھے گئے ہیں۔''
پیر محمد نے جواب دیا۔ ''آج تک تو کوئی درندہ دیکھنے میں آیا نہیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''ٹھیک ہے، پھر بھی ذرا ہوشیاری سے سفر کیا کر، احتیاط بڑی اچھی چیز ہے۔''
پیر محمد نے جواب دیا۔ ''آپ فرماتے ہیں تو میں ضرور احتیاط کروں گا۔''
اس دن پیر محمد نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے سفر کیا۔ وہ اپنی گھوڑی کو بھگا رہے تھے اور اپنے گرد و پیش بھی دیکھتے جاتے تھے۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ مولوی پیر محمد جب اس ندی کے قریب پہنچے تو انہوں نے ایک چیتے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ مولوی پیر محمد چیتے کو دیکھتے ہی بدحواس ہو گئے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ سمجھ میں ہی کچھ نہ آتا تھا کہ گھوڑی کو بھگا کر کس طرف لے جائیں۔ آخر بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ ''خواجہ قادر بخش پیر و مرشد! جب اتنی خبر دی تھی کہ راہ میں کوئی درندہ مل سکتا ہے، اب جبکہ وہ مل ہی چکا ہے، اس سے میری حفاظت بھی فرمایئے۔''
چیتا جست لگانے کی فکر میں تھا۔ مولوی پیر محمد نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ پڑھنے لگے۔ اسی لمحے انہوں نے اپنے پیر و مرشد کی آواز سنی۔ ''پیر محمد! اپنی گھوڑی کو بھگا لے جا۔ میں نے چیتے کو پکڑ لیا ہے۔''
مولوی پیر محمد نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ خواجہ بخش نے چیتے کو پکڑ رکھا ہے۔ اس کے دونوں کان ان کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ بار بار یہی کہہ رہے ہیں۔ ''پیر محمد! دیر نہ کر، میں نے اس کو پکڑ لیا ہے۔ تو فوراً ہی چلا جا۔''
پیر محمد نے گھوڑی کو بے اختیار بھگایا اور آناً فاناً اس خطرے کی جگہ سے نکل گئے۔ دوسرے دن جب وہ صبح مدرسے میں پہنچے تو خواجہ قادر بخش کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! اگر آپ نے مدد نہ کی ہوتی تو کل میں چیتے کے پیٹ میں پہنچ چکا ہوتا۔''
آپ نے پوچھا۔ ''میں نے تیری کیا مدد کی تھی جس کا تو شکریہ ادا کر رہا ہے؟''
پیر محمد نے پورا واقعہ دہرا دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''تجھ کو دھوکا ہوا ہوگا۔ میں نے چیتے کے کان نہیں پکڑے تھے۔''
پیر محمد نے عرض کیا۔ ''پیر و مرشد! اگر وہ فریبِ نظر یا دھوکا تھا تو پھر میں جو کچھ بھی دیکھتا ہوں، سب کچھ فریبِ نظر اور دھوکا ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''ایسا ممکن تو ہے کیونکہ اللہ نے اپنے نیک بندوں کو درندوں پر بھی فائق اور برتر رکھا ہے۔ یہ بھی ان برگزیدہ انسانوں کے تابع ہوتے ہیں۔''

مولوی پیر محمد نے آپ کے ہاتھوں کو فرطِ عقیدت سے بوسہ دیا اور کہا۔ ''حضرت! اس انکسار کو میں کیا کہوں۔ آپ سب کچھ ہونے کے باوجود اپنی ذات اور صفات کی نفی کر دیتے ہیں۔''

آپ نے خاموشی اختیار کر لی اور نظریں جھکالیں۔ ان کے ایک مرید الٰہی بخش جو محکمے میں ملازم بھی تھے، نے ایک دن کسی معاملے میں دس روپے رشوت میں لے لیے۔ روپے جیب میں ڈالے ہی تھے کہ الٰہی بخش کے گال پر ایک تھپڑ لگا اور کانوں میں آواز گونجنے لگی۔ ''ارے مردود! رشوت لیتا ہے، ذلیل کتے۔ اس لیے اس محکمے میں ملازمت کی تھی؟''

الٰہی بخش نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ خوف زدہ ہو کر روپے واپس کر دیے اور شرمندہ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ کام سے فراغت پانے کے بعد خواجہ قادر بخش کی خدمت میں پہنچے۔ سلام کیا اور مصافحے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیے لیکن آپ نے منہ پھیر لیا۔ الٰہی بخش قدموں میں گر کر رونے لگے، عرض کیا۔ ''پیر و مرشد! بس ایک بار معاف کر دیجیے۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو نے بیعت ہوتے وقت اللہ اور مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ نواہی شرعیہ سے مجتنب اور محترز رہوں گا لیکن افسوس کہ تو نے اس وعدے کا پاس نہیں کیا۔''

الٰہی بخش نے جواب دیا۔ ''پیر و مرشد! میں نے جو گناہ کیا تھا، اس کی سزا بھی مل گئی۔ میں نے وہ روپے اسی وقت واپس کر دیے۔ اب خدا کے لیے مجھ کو معاف فرما دیجیے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''خدا نے مجھے خبر دی۔ میں نے تمہیں روک دیا۔''

الٰہی بخش نے شرمندگی سے دوبارہ بیعت کی اور وعدہ کیا کہ اب آئندہ ایسی حرکت سرزد نہیں ہوگی۔ آپ نے ان کے حق میں دعا کی کہ خدا تجھے بیعت پر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ نے محکمۂ پولیس میں ملازمت کے دوران لوگوں کی بڑی خدمت کی اور گم کردہ راہ لوگوں کی اصلاح فرماتے رہے۔ آپ اس بھٹی میں کندن ہو چکے تھے۔ آخر ایک دن آپ کے پیر و مرشد حاجی محمود نے انہیں بلایا اور انہیں حکم دیا۔ ''قادر بخش! اب ملازمت چھوڑ دے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کیا فوراً ہی، اسی وقت؟''

حاجی صاحب نے جواب دیا۔ ''ہاں فوراً ہی، اسی وقت۔''

آپ نے اسی وقت استعفا دے دیا اور پیر و مرشد کے حکم پر اپنے آبائی وطن جہاں خیل چلے گئے۔ آپ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔ دور دور سے لوگ شرفِ ملاقات اور شوقِ بیعت کی خاطر آپ سے ملنے اور پھر یہیں کے ہو رہتے۔ آپ لوگوں کی مشکلوں اور الجھنوں کا علاج بھی بتا دیتے تھے۔ یہاں بھی غرض مندوں اور حاجت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی۔

آپ کے مریدوں میں ایک صاحب محمد بخش تھے۔ ان پر آپ کی خصوصی توجہ رہتی تھی۔ ایک دن وہ بے خبر سوئے ہوئے تھے کہ کسی نے ان پر گھڑوں پانی ڈال کر جگا دیا۔ جب وہ گھبرا کر اٹھے تو انہیں کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ یہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ بیوی سے پوچھا۔ ''نیک بخت! یہ مجھ پر پانی کس نے ڈال دیا؟''

بیوی نے شرابور شوہر کو حیرت سے دیکھا اور جواب دیا۔ ''دروازے تو اندر سے بند ہیں، یہ پانی کون ڈال گیا؟''

محمد بخش نے کہا۔ ''اگر دروازے اندر سے بند ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پانی تو نے ڈالا ہوگا کیونکہ تیرے علاوہ یہاں کوئی بھی نہیں۔''

بیوی نے جواب دیا۔ ''اگر پانی میں نے ڈالا ہے تو اس پانی کا برتن کہاں چلا گیا، میں تو ابھی یہاں سے ہلی بھی نہیں۔''

محمد بخش کو ہوش آیا تو واقعی یہ دیکھا کہ کمرے میں پانی کا پیالہ تک نہ تھا۔ پھر یہ پانی کون ڈال گیا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا کوئی جواب نہ مل سکا۔ اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ ایک دن دونوں سو رہے تھے۔ سوتے سوتے ان کی آنکھ جو کھلی تو انہیں اپنے نیچے بستر کے بجائے ریت سی محسوس ہوئی۔ میاں بیوی دونوں ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ نہ کمرا تھا، نہ گھر، نہ محلہ۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ زمین ٹٹولی تو نیچے ریت محسوس ہوئی۔ انہوں نے بیوی سے پوچھا۔ ''یہ ہم اس وقت ہیں کہاں؟''

بیوی بہت ڈری ہوئی تھی، جواب دیا۔ ''پتا نہیں کہاں ہیں اور یہاں ہمیں لایا کون؟''

محمد بخش نے اٹھ کر آس پاس کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہ دونوں دریائے بیاس کے ساحل پر پڑے ہیں۔ ابھی ان کی حیرت دور نہیں ہوئی تھی کہ کسی مرد کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ بیوی اور زیادہ ڈر گئی۔ شوہر نے تسلی دی۔ ''نیک بخت! مت گھبراؤ، میں سمجھ گیا کہ یہ کیا چکر ہے؟''

یہ دونوں بمشکل اپنے گھر پہنچے اور بقیہ رات جاگ کر گزار دی اور علی الصباح پیر و مرشد کی خدمت میں پہنچے اور دونوں واقعے بیان کر دیے، کہا۔ ''حضرت! میں بے حد پریشان ہوں۔ میری بیوی تو رات کے تصور سے ہی گھبرانے اور ڈرنے لگی ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟ آخر یہ معاملہ کیا ہے اور کون ہمیں تنگ کر رہا ہے؟''

آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے۔ اس کے بعد آنکھیں کھول دیں اور قرآن پاک کی کوئی سورۃ پڑھنے لگے۔ پھر انگوٹھے پر دم کر کے اس کو زمین پر لگا دیا اور اسے زور سے دبایا۔ اسی وقت کسی کے رونے اور فریاد کرنے کی آواز سنائی دی۔ ''حضرت! مجھے معاف کر دیجیے۔ میں جلا، میں مرا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تو ہے کون؟''

اسی وقت ایک شخص نمودار ہوا اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ ''حضرت! میں جن ہوں اور میرا نام زمان شاہ ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تو اس غریب کو کیوں ستاتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں اس شخص کو پسند کرتا ہوں اور ازراہِ مذاق اس کو ستاتا ہوں۔''

آپ نے طیش میں فرمایا۔ ''تیری ہنسی اس کی مصیبت ہے۔ میں تجھ کو نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ رونے لگا اور کہا۔ ''اس بار آپ مجھ کو چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بھی اس کے پاس نہیں آؤں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں آنے کو نہیں، ستانے کو منع کرتا ہوں۔''

اس نے وعدہ کیا۔ ''میرا وعدہ کہ میں آؤں گا ضرور لیکن اس کو ستاؤں گا نہیں۔''

آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد وہ بمشکل انسان محمد بخش کے پاس آیا اور کہا۔ ''بخدا میں نے اتنا بڑا بزرگ عامل نہیں دیکھا۔ مجھ کو تو ان سے خوف محسوس ہوتا ہے۔''

کچھ عرصے بعد زمان شاہ، اس کی بیوی اور اس کے کئی رشتے دار خواجہ قادر بخش کے مریدوں میں شامل ہو گئے اور بیعت کر لی۔ جہاں خیل کی مسجد کے جنوبی گوشے میں آپ کا حجرہ تھا۔ یہیں آپ عبادت فرمایا کرتے تھے۔

عشا کا وقت تھا، اذان ہو چکی تھی۔ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اس وقت آپ کے پاس خلیفہ رنگ علی شاہ اور بلاقی شاہ موجود تھے۔ دھواں دار بارش دیکھ کر آپ نے باہر کی طرف دیکھا، اسی وقت بجلی چمکی۔ آپ نے بجلی کی روشنی میں نورانی شکلوں کے چند انسان حجرے کے باہر دیکھے۔ آپ نے بلاقی شاہ سے کہا۔ ''بلاقی شاہ! ذرا دیکھنا تو اس بارش میں یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ اور یہ بھی پوچھو کہ کس لیے آئے ہیں؟''

بلاقی شاہ نے بھی بجلی کی چمک میں ان نورانی شکل والے انسانوں کو دیکھ لیا اور یہ حجرے سے نکل کر ان کی طرف دوڑے۔ بلاقی شاہ پوچھ رہے تھے۔ ''ارے بھائی سننا تو۔ تم کون ہو اور کیا لینے آئے ہو؟''

اسی وقت پیچھے سے زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ حجرے کی پوری چھت ان کے پیر و مرشد اور خلیفہ رنگ علی شاہ پر گر چکی تھی۔ بلاقی شاہ نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں موسلا دھار بارش میں حجرے کے آس پاس ایک مجمع لگ گیا۔ ان میں خواجہ قادر بخش کی والدہ بھی تھیں۔ ان کی حالت لوگوں سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ لوگوں نے ملبا ہٹایا تو اندر سے دونوں شہیدوں کی لاشیں نکلیں۔ انہیں عزت و احترام سے وہیں دفن کیا گیا۔ تاریخ شہادت 1272ھ، 1857ء ہے۔

آپ کو لوگ فرطِ عقیدت سے شمس العرفان کہتے تھے۔ عرفان کا آفتاب اور اس آفتاب کی روشنی نے ہوشیار پور اور اس کے گرد و نواح کو منور کر دیا تھا۔

ماخذات

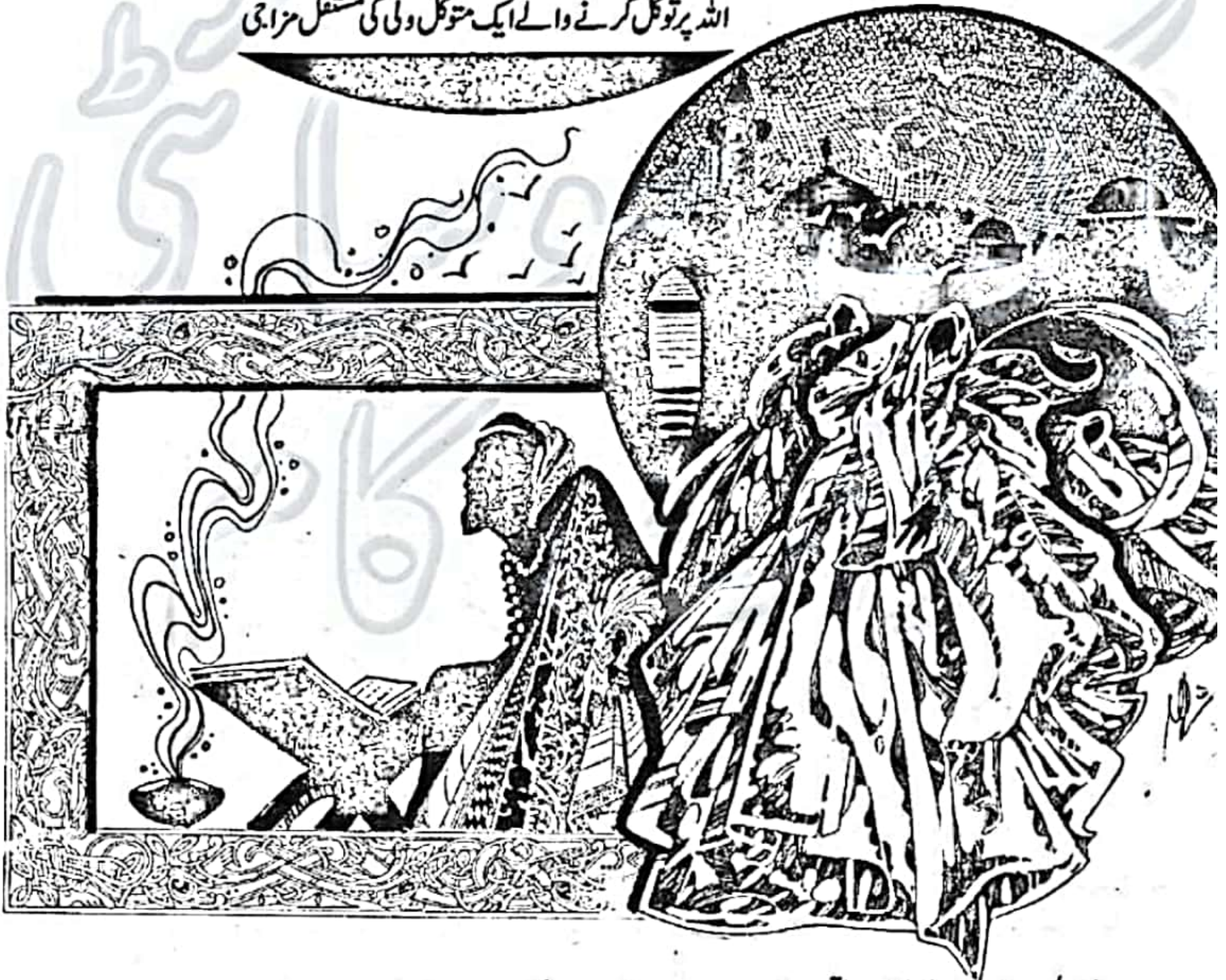
- تاریخ مبارک شاہی — یحییٰ بن احمد سرہندی
- آثار الصنادید — سرسید احمد خان
- تاریخ فرشتہ — محمد قاسم فرشتہ
- عہد سلاطین دہلی — صلاح الدین ناسک
- تاریخ فیروز شاہی — شمس سراج عفیف
- طبقات اکبری — نظام الدین احمد

شیخ نجیب الدین متوکل

ضیا تسنیم بلگرامی

کچھ لوگ زمین پر اتنے خوش قسمت اتارے گئے ہیں کہ ان کے بارے میں سوچ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ جیسے کہ بی بی قرسن خاتون... جن کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا جن کے تین بیٹے تھے اور تینوں اللہ کے برگزیدہ بندے... سبحان اللہ... انہی میں شیخ نجیب الدین بھی شامل تھے جو تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہوئے اپنے منجھلے بھائی بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہوئے اور متوکل کا خطاب پایا۔ وہ کتنی خوش قسمت ماں تھیں جن کے بیٹوں کے نام سلسلۂ بزرگان دین میں ستاروں کے مانند روشن ہوئے۔

اللہ پر توکل کرنے والے ایک متوکل ولی کی مستقل مزاجی



کابل پر فرخ شاہ کی حکومت تھی۔ شب و روز شان و شوکت سے گزر رہے تھے۔ شاہی خاندان اپنے اقتدار اور جاہ و ثروت کو اپنے لیے دائمی سمجھتا تھا مگر کارکنانِ قضا و قدر نے غزنوی خاندان کو اقبال اور اقتدار کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ فرخ شاہ سے زمامِ حکومت چھین کر سبکتگین کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ فرخ شاہ اپنے خاندان کے ساتھ گمنامی میں چلا گیا۔ ان حالات میں عام طور پر لوگ جلاوطن ہو جانا اپنی تقدیر سمجھتے ہیں لیکن فرخ شاہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے خدا کے فیصلے کو خندہ پیشانی سے

قبول کرلیا اور کابل ہی میں رہائش برقرار رکھی۔ سابق شاہی خاندان اپنی قسمت پر شاکر رہا۔ یہاں تک کہ غزنویوں کا اقتدار بھی چھن گیا اور چنگیز خان نے صحرائے گوبی کو عبور کر کے مشرق اور مغرب کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ کابل بھی اس سے متاثر ہوا اور ہر طرف تباہی و بربادی نے ڈیرا ڈال دیا۔ وہ خاندان جس کو غزنویوں کا اقتدار متزلزل نہیں کر سکا تھا، چنگیز خانی سیلاب نے ہلا کر رکھ دیا۔ ان لوگوں نے کابل سے ہجرت کی اور لاہور چلے آئے۔ لاہور کچھ دن رہے اور پھر قصور کا رخ کیا۔ قصور کا قاضی اس خاندان کی عظمت اور شاندار ماضی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے اس خاندان کی سفارش برصغیر کے بادشاہ سے کی اور بادشاہ نے اس خاندان کے قاضی شعیب فاروقی کو کھتیوال کا قاضی مقرر کر دیا۔ قاضی شعیب فاروقی نے یہیں شادی کی اور ان سے خاندان کا سلسلہ چل نکلا۔ ان کے ایک بیٹے کا نام شیخ جمال الدین سلیمان تھا۔ جب شیخ جمال بن شعور کو پہنچا تو ان کے باپ نے ان کی شادی مولانا وجیہہ الدین خجندی کی صاحبزادی بی بی قرسن خاتون سے کر دی۔ بی بی قرسن خاتون کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا، لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔

شادی کے بعد شیخ جمال الدین سلیمان نے اپنی بیوی میں کیا دیکھا؟ شاید ان کی زبان اس کے بیان پر قادر نہ تھی۔ شوہر نے اپنی بیوی کو صوم و صلوٰۃ کا حد درجہ پابند دیکھا۔ وہ ہر وقت باوضو رہتیں اور اپنی زبان کی حفاظت فرماتیں۔

اندھیری رات تھی، رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ پورا محلہ بلکہ پورا قصبہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں صاف آ رہی تھیں۔ اسی عالم میں ایک چور نے بی بی قرسن خاتون کے گھر کا انتخاب کیا۔ آپ اس وقت بھی محوِ عبادت تھیں۔ آپ جس حصے میں نمازِ تہجد ادا فرما رہی تھیں، چور اس طرف گیا اور جھانک کر آپ کو دیکھنا چاہا مگر اس کو اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا اور بینائی جواب دے گئی۔ اس کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر بصارت کام نہیں کر رہی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے مگر ناکام رہا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور پورے وجود میں دہشت دوڑ گئی۔ جب وہ بالکل مایوس ہو گیا تو اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''اہلِ خانہ! میں نہیں جانتا کہ یہ کس کا گھر ہے اور اس میں کس اللہ والے نے اپنے تقدس کا سایہ ڈال رکھا ہے۔ میں اس گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا لیکن میں اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اب میں کسی نادیدہ غیر مرئی عظمت اور تقدس کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری بینائی چلی گئی اور میں اس لائق بھی نہیں رہ گیا کہ راستہ تلاش کر کے مکان سے باہر جا سکوں۔ بھگوان کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میری بینائی واپس آ گئی تو میں چوری کے پیشے سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو جاؤں گا۔''

آپ نے چور کی آواز سنی مگر آپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ نے چور کے حق میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

''مولا! یہ شخص بشریت کا شکار ہو گیا ہے، اس پر رحم فرما دے اور اس کی بینائی واپس فرما دے۔ میں اس وقت تک سجدے میں پڑی رہوں گی، جب تک تو میری درخواست پر توجہ نہیں فرمائے گا۔ متقی اور پرہیزگار تیرے الطاف و اکرام کے مستحق ہوتے ہی ہیں، یہ گناہ گار کہاں جائیں اے اللہ! ان پر رحم فرما۔''

آپ سجدے میں پڑی گڑگڑا رہی تھیں۔ چور نے اپنی بینائی کو بحال ہوتے محسوس کیا، ذرا سی دیر میں وہ اس لائق ہو چکا تھا کہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی اتنا خوفزدہ اور مرعوب تھا کہ بہ آوازِ بلند عرض کیا۔ ''صاحبانِ خانہ! میں نہیں جانتا کہ میری بینائی کیوں چلی گئی تھی اور پھر واپس کیونکر آ گئی لیکن میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت تو میں جا رہا ہوں لیکن بھگوان نے چاہا تو صبح پھر حاضری دوں گا اور اپنی توبہ کا ایک بار پھر اعلان کروں گا۔''

اس وقت تو چور چلا گیا لیکن دوسرے دن صبح دوبارہ آ گیا اور آپ کے در پر دستک دی۔

آپ نے آڑ سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

چور نے جواب دیا۔ ''میں ہوں گنگا پرشاد۔ میں رات کو چوری کی نیت سے اس گھر میں داخل ہوا تھا مگر میری بینائی چلی گئی تھی۔ میں اسی وقت کسی حد تک اس راز سے واقف ہو چکا تھا پھر میری بینائی واپس آ گئی اور اب میں حسبِ وعدہ واپس آ چکا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تیرا توبہ کر کے ارادتاً یہاں تک آ جانا ہی بہت اچھا ہے، میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ تیری اصلاح کرے اور تجھے صحیح راستے پر ڈال دے تاکہ تو کل قیامت کے دن لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔''

چور نے پوچھا۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں اپنی رات والی حرکت پر بہت زیادہ نادم ہوں۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں، کہیے کیا حکم ہے؟''

آپ نے اس چور کو اس کے خاندان کے ساتھ مسلمان کر لیا اور اس کے حق میں بڑی دعا کی۔
ان خاتون کو خدا نے تین بیٹے دیے۔ ایک کا نام رکھا گیا اعزالدین محمود۔ یہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ دوسرے کا نام رکھا گیا فریدالدین مسعود۔ یہ منجھلے تھے اور بعد میں بابا فریدالدین گنج شکر ہو گئے۔ سب سے چھوٹے بیٹے کا نام رکھا گیا نجیب الدین، یہ بعد میں نجیب الدین متوکل ہو گئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عمر بن الخطابؓ سے مل جاتا تھا۔
یہ تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہوئے اپنے منجھلے بھائی بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہو گئے۔ ان دنوں دہلی میں دور دور سے بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام تشریف لایا کرتے تھے۔ ان میں بابا فرید گنج شکر کا نام بھی شامل تھا۔ ان کے ساتھ نجیب الدین بھی ہوتے تھے۔ ان دونوں کو دہلی آئے ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ آخر بابا فریدالدین نے واپسی کے لیے اپنا سامان سنبھالا۔ نجیب الدین بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ بابا فرید نے انہیں تیار جو دیکھا تو مسکرا کر پوچھا۔ ''نجیب الدین! کہاں......کیا ارادے ہیں؟''
نجیب الدین نے جواب دیا۔ ''بھائی! میرا کیا ارادہ؟ میں تو آپ کا تابع ہوں۔ جہاں لے جائیں گے، چلا جاؤں گا۔''
بابا فرید نے فرمایا۔ ''نجیب الدین! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دہلی ہی میں رہو، تم یہیں رک جاؤ۔''
نجیب الدین نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ ''جیسا آپ کا حکم، مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔''
بابا فرید مسکرائے، فرمایا۔ ''بھائی نجیب الدین! تم دہلی میں کس طرح رہو گے؟ یہاں تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہو گا؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''میں کیا جانوں کہ میرا ذریعۂ معاش کیا ہو گا۔''
بابا فرید نے فرمایا۔ ''پھر بھی...... یہ دہلی ہے، ایک بڑا شہر ہے، یہاں جب تک ذریعۂ معاش قابلِ اطمینان نہ ہو، آدمی کس طرح عزت دار زندگی گزارے گا؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''بھائی صاحب! میں نے اللہ پر توکل کیا، میرے لیے یہی کافی ہے۔''
بابا فرید نے دعائیہ انداز میں فرمایا۔ ''خدا تمہیں متوکل کرے۔''
اس طرح نجیب الدین متوکل ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے متوکل کہلائے۔ آپ نے دہلی میں جس جگہ قیام فرمایا تھا، وہیں ایتمر نامی ایک ترک رہتا تھا۔ اس ترک نے یہاں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور مسجد کے پہلو میں ایک مکان بھی تعمیر کرا دیا۔ جب یہ سارا کام مکمل ہو گیا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں ایک درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔ کیا آپ اس پر توجہ فرمائیں گے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اگر وہ اس لائق ہوئی کہ اس پر توجہ دی جائے تو میں ضرور توجہ دوں گا۔''
ایتمر ترک نے عرض کیا۔ ''حضرت! میری خواہش ہے کہ اس مسجد کی امامت آپ فرمائیں۔ مسجد سے ملحقہ مکان آپ کی رہائش کے لیے حاضر ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اس نیک کام سے میں کس طرح انکار کر سکتا ہوں، مجھے منظور ہے۔''
ترک نے کہا۔ ''مسجد کی طرف سے میں ماہانہ ہدیہ بھی پیش کر دیا کروں گا۔''
آپ کے معاملات طے پا گئے اور آپ مسجد والے مکان میں منتقل ہو گئے اور مسجد میں فرائضِ امامت انجام دینے لگے۔ یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ ترک آپ سے بے حد خوش تھا اور علاقے کے لوگ بھی بہت زیادہ مطمئن نظر آتے تھے۔
اسی دوران ایتمر نامی ترک ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ''بابا! عنقریب میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے، میری خواہش ہے کہ اس میں آپ بھی شرکت فرمائیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''واہ! میں اس میں شرکت کیوں نہیں کروں گا؟ میں اس میں ضرور آؤں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔''
شادی کا دن آیا، براتیوں کا ہجوم ایسا تھا کہ پورا علاقہ میلے کا میدان بن گیا۔ آپ بھی وقت پر پہنچ گئے اور برات کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ آپ نے ہزاروں آدمیوں کو اس حال میں دیکھا کہ وہ جن برتنوں میں کھانا کھا رہے تھے، وہ برتن بھی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ یہ سارے برتن چاندی کے تھے۔ آتش بازی نے رات کو دن میں بدل دیا تھا۔ نجیب الدین متوکل جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایتمر ترک کو ایک کونے میں لے جا کر سوال کیا۔ ''میاں ایتمر! میری ایک بات کا جواب دو گے؟''
ایتمر ترک نے جواب دیا۔ ''آپ جواب کی بات کر رہے ہیں، میں نے چاندی کے برتن تک براتیوں کو دے دیے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''اس تقریب پر کُل کتنا خرچہ آیا ہوگا؟''
اسمر ترک نے جواب دیا۔ ''تقریباً ایک لاکھ بائیس ہزار تنکہ۔''
آپ نے فرمایا۔ ''میاں اسمر! تمہارا مال ہے جس طرح چاہو خرچ کرو لیکن مومن کامل وہ ہے جس کی دوستی خدا سے ہو۔ ایسی دوستی کہ اس پر اولاد کی محبت بھی غالب نہ آسکے۔ تم نے ایک لاکھ بائیس ہزار تنکے لڑکی کی شادی پر خرچ کردیے حالانکہ یہ شادی نہایت سادگی سے بھی انجام پا سکتی تھی اور اس خطیر رقم کو خلقِ خدا کی خدمت میں صرف کیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔''
اسمر ترک نے گھور کر آپ کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ''اس وقت تو میں شادی میں مشغول ہوں۔ میں صبح اس موضوع پر بات کروں گا۔''
آپ اپنے گھر چلے گئے۔ صبح نمازِ فجر کے بعد اسمر ترک آپ کے پاس پہنچا، بولا۔ ''ہاں جناب...... تو کل رات آپ کیا فرما رہے تھے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ کہ مومن کامل وہ ہے جو خدا سے دوستی کرے۔ یہ رقم جو تم نے اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ کی ہے اگر اسے یا اس میں کچھ اور ملا کر تم خدا کی مخلوق کی خدمت میں صرف کردیتے تو اس سے مخلوق بھی خوش ہوجاتی اور اللہ بھی راضی ہوجاتا۔''
اسمر ترک نے پوچھا۔ ''تمہیں جو کچھ بھی کہنا تھا کہہ چکے یا ابھی کچھ اور بھی کہنا ہے؟''
آپ نے فرمایا۔ ''نہیں، مجھ کو اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں کہنا۔''
اسمر ترک نے جواب دیا۔ ''اچھا اب میری سنو! اب تم میری مسجد سے نکل جاؤ اور میرا گھر بھی خالی کردو، تم حاسد معلوم ہوتے ہو۔''
آپ نے فرمایا۔ ''میں حاسد نہیں ہوں اسمر! میں نے جو کچھ کہا ہے نصیحت اور ہدایت کے طور پر کہا ہے۔''
اسمر نے سختی سے کہا۔ ''لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں حکماً کہہ رہا ہوں۔ تم مسجد اور گھر اسی وقت خالی کردو ورنہ مجھے سختی کرنا پڑے گی۔''
آپ نے پوچھا۔ ''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''
اسمر نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ تم اسی وقت دفع ہوجاؤ۔''
آپ نے اسی وقت مکان خالی کردیا اور مسجد سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ فرصت پاتے ہی آپ نے اجودھن کا رخ کیا کیونکہ ان کے بڑے بھائی بابا مسعود گنج شکر کا اجودھن ہی میں قیام تھا۔ آپ اجودھن پاک روانہ ہوگئے اور وہاں اپنے بھائی مسعود گنج شکر کے پاس قیام فرمایا۔
بابا فرید نے پوچھا۔ ''ہاں بابا نجیب الدین! کہو، دہلی سے بال بچوں سمیت کیوں آگئے؟''
بابا نجیب نے حسرت بھری نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا اور پورا واقعہ بتا دیا۔ بابا مسعود نے قرآن پاک کی ایک آیت پڑھی جس کا ترجمہ تھا۔ ''ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے اور نہ ہی اس کو لوگوں کے ذہنوں سے محو کرتے ہیں مگر اس سے بہتر یا اس جیسی دوسری آیت لے آتے ہیں۔''
نجیب الدین متوکل نے پوچھا۔ ''بھائی! میں کیا کروں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
بابا مسعود نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تم فکر نہ کرو۔ اللہ کوئی دوسری صورت پیدا کردے گا۔ یہ اسمر تھا، خدا اسمر کو منسوخ کرکے کوئی اینکر پیدا کردے گا۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے، تم اینکر کا انتظار کرو۔''
نجیب الدین نے عرض کیا۔ ''بھائی! میں ان باتوں سے بالکل نہیں گھبراتا۔ اپنی معیشت کے بارے میں، میں ذرا بھی پریشان نہیں ہوتا۔ مجھے تو اسمر کا رویہ برا لگا اور کچھ نہیں۔''
نجیب الدین نے اجودھن سے دہلی کا رخ کیا۔ جب وہ دہلی میں داخل ہوئے تو ان کے کئی جاننے والوں نے انہیں خوش آمدید کرتے ہوئے کہا ''بابا! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ اسمر مرگیا، ایک نیا ترک اینکر آیا ہوا ہے۔ وہ معلوم نہیں کیوں آپ کے بارے میں پوچھتا پھرتا ہے۔''
نجیب الدین نے جواب دیا۔ ''میں ان امراء سے گھبرانے لگا ہوں، میں اینکر سے نہیں ملوں گا۔''
ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک ترک سردار ان کے پیچھے آ کھڑا ہوا، اس نے کہا۔ ''بابا متوکل! میری طرف

دیکھیے......ادھر، میں آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔''
نجیب الدین نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا۔ ''شاید تیرا ہی نام اینکر ہے؟''
ترک سردار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں ہی اینکر ہوں۔''
متوکل نے پوچھا۔ ''مجھ سے کوئی کام؟''
ترک سردار نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں آپ کا ارادت مند ہوں۔ میں نے آپ کی عدم موجودگی میں ایک مکان تعمیر کرایا ہے۔ آپ اس میں قیام فرمائیں اور مجھے اپنا مرید بنا لیں۔''
نجیب الدین متوکل نے کہا۔ ''میں تیرے مکان میں کس طرح رہوں کیونکہ میں جب بھی تجھ کو کوئی نصیحت کروں گا تو تُو ناراض ہو کر مجھے اپنے مکان سے نکال باہر کرے گا۔''
ترک سردار تلملا گیا، بولا۔ ''ایسا نہیں ہوگا پیر و مرشد......میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔''
آپ اس کے اصرار پر نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس شخص نے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا اور آپ کا مرید ہو گیا۔

☆☆☆

ایک دن آپ کے پڑوس سے ایک نوجوان آپ سے ملنے آیا، اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''بابا متوکل! میرا نام نظام الدین ہے۔ میں بدایوں سے آیا ہوں اور آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔''
آپ نے اس نوجوان کو بڑے تپاک سے لیا اور دیر تک مزے مزے کی باتیں کرتے رہے اور آخر میں فرمایا۔ ''نظام الدین! تم اسی طرح میرے پاس آتے رہو۔''
نظام الدین کو آپ سے کچھ ایسی عقیدت ہوگئی کہ اپنا بیشتر وقت آپ کی صحبت میں گزارتا۔
ایک دن نظام الدین نے تخلیہ میں آپ سے کہا۔ ''بابا متوکل! آپ میرے حق میں دعا کیجیے کہ میں کہیں کا قاضی ہو جاؤں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''قاضی......کیا قاضی بہت بڑا ہوتا ہے؟''
نظام الدین نے عرض کیا۔ ''بہت بڑا بھی ہوتا ہے اور عزت والا بھی ہوتا ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''نظام الدین! تم قاضی ہرگز نہ بننا کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو جو کچھ بھی بنے گا، وہ بادشاہوں سے بڑا مرتبہ ہوگا۔ لوگ عقیدت اور احترام سے تیرا نام لیں گے اور تیری جگہ ادنیٰ و اعلیٰ کے دلوں میں ہوگی، بادشاہوں کی وہ عزت نہ ہوگی جو تیری ہوگی۔''
نظام الدین نے پوچھا۔ ''یعنی......یعنی میں کیا بنوں گا؟''
آپ نے فرمایا۔ ''تم اللہ کے محبوب اور انسانوں کے اولیاء بن جاؤ گے۔''
بعد میں دنیا نے یہ دیکھا کہ نظام الدین شیخ المشائخ محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاء بن گئے اور ان کا مقام ہر ادنیٰ و اعلیٰ کا دل قرار پایا۔
بابا مسعود نے اجودھن میں قیام کے دوران آپ سے فرمایا۔ ''نجیب الدین! تم ٹیسوال چلے جاؤ اور والدہ کو اجودھن لے آؤ۔''
نجیب الدین ٹیسوال چلے گئے اور والدہ کو اپنے ساتھ لیا اور اجودھن روانہ ہو گئے۔ راستے میں دوپہر کے وقت درختوں کے سائے میں آپ نے قیام کیا۔ ماں نے کہا۔ ''بیٹے نجیب الدین! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ کیا یہاں کہیں ٹھنڈا پانی مل جائے گا؟''
نجیب الدین نے جواب دیا۔ ''پانی کیوں نہیں ملے گا، میں ابھی لاتا ہوں۔''
نجیب الدین کو پانی کی تلاش میں کافی دور جانا پڑا۔ جب وہ پانی لے کر واپس آئے تو ماں کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگے مگر گھنٹوں کی تلاش اور جستجو کے بعد بھی ماں کا پتا نہ چلا۔ جب وہ ہر طرح سے مایوس ہو گئے تو اپنے بھائی مسعود گنج شکر کے پاس گئے اور انہیں پورا واقعہ سنا دیا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ نجیب الدین کو قرار نہ تھا۔ انہوں نے چشم تصور سے ایک بار پھر پورے جنگل کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کا کچھ حصہ دیکھنے سے باقی رہ گیا ہے۔ دوبارہ اسی جنگل میں پہنچے اور ایک بار پھر پورا جنگل کھنگال ڈالا۔ آخر ایک جگہ جھاڑی میں

انہیں بہت ساری ہڈیاں پڑی ملیں۔ یہ ان ہڈیوں کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اب انہیں اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ ان کی ماں کو کوئی درندہ کھا گیا ہے۔

نجیب الدین نے ساری ہڈیاں ایک کپڑے میں باندھ لیں اور بھائی مسعود گنج شکر کی خدمت میں پہنچے۔ ہڈیوں والی پوٹلی ان کے سامنے رکھ دی اور عرض کیا۔ ''بھائی! مجھ کو یہ ہڈیاں ایک جھاڑی سے ملی ہیں۔ میرا خیال ہے والدہ ماجدہ کو کسی درندے نے......''

بابا مسعود نے پوٹلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس پوٹلی میں کیا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں نے عرض جو کیا غالباً والدہ مرحومہ کی ہڈیاں۔''

بابا مسعود نے فرمایا۔ ''پوٹلی کھول کر ہڈیاں دکھاؤ۔''

نجیب الدین نے پوٹلی جو کھولی تو اس میں ہڈیاں نہیں تھیں۔ وہ حیرت سے خالی کپڑے کو دیکھنے لگے۔

بابا مسعود نے پوچھا۔ ''کہاں ہیں وہ ہڈیاں؟''

نجیب الدین نے جواب دیا۔ ''شاید خداوند تعالیٰ والدہ محترمہ کو اس طرح رسوا نہیں کرنا چاہتا۔''

بابا مسعود نے کہا۔ ''اس سانحے کو بھول جاؤ اور دہلی واپس جاؤ۔ اپنا کام جاری رکھو۔''

نجیب الدین متوکل دہلی چلے گئے۔

☆☆☆

عسرت اور تنگدستی پر آپ فخر کیا کرتے تھے۔ عید کا دن تھا اور گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ آپ نے عید گاہ میں عید کی نماز ادا کی۔ راستے میں آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو گھیر لیا۔ وہ آپ کے ہاتھوں کو بوسے دے رہے تھے۔ اس ہجوم میں قلندروں کی ایک جماعت بھی موجود تھی۔ یہ قلندر خراسان سے آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کسی شخص سے پوچھا۔ ''بھائی! یہ کون ہے جس کی پرستش کی جا رہی ہے؟''

قلندر کو جواب ملا۔ ''شیخ نجیب الدین متوکل، انہیں متوکل اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے توکل کا کوئی جواب نہیں۔''

قلندروں نے آپس میں مشورہ کیا۔ ایک نے کہا۔ ''ہمیں بھی ان سے ملنا چاہیے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''لیکن یہاں سرِ راہ نہیں۔''

کسی قلندر نے پوچھا۔ ''اگر یہاں نہیں تو پھر کہاں؟''

دوسرے قلندر نے جواب دیا۔ ''ہمیں ان کے گھر چلنا چاہیے۔''

چنانچہ قلندروں نے یہ طے کر کے ان کے گھر کا رخ کیا۔ جب یہ سب ان کے گھر پہنچے تو دروازے پر دستک دی۔ آپ باہر نکلے اور قلندروں کو اپنے سامنے دیکھ کر پوچھا۔ ''حضرات آپ؟ آپ لوگوں نے کیوں زحمت کی؟''

ایک قلندر نے جواب دیا۔ ''بھائی! ہم سب نے لوگوں کو دیکھا کہ لوگ آپ کے ہاتھوں اور پیروں کو بے تحاشا بوسے دے رہے ہیں، پھر ہم نے آپ کے گھر کا انتخاب کیا۔ اب ہم کھانا یہیں کھائیں گے پھر کہیں جائیں گے۔''

متوکل کو معلوم تھا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں۔ قلندروں کی باتیں سن کر اندر گئے اور بیوی سے پوچھا۔ ''نیک بخت! چند مہمان آگئے ہیں اور یہ مہمان قلندر ہیں۔ ان کے کھانے پینے کا کچھ انتظام ہونا چاہیے۔''

بیوی نے جواب دیا۔ ''آپ تو گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ گھر میں کچھ بھی نہیں، پھر یہ اس قسم کی باتیں کیوں؟''

متوکل نے کہا۔ ''تمہارے پاس دوپٹا وغیرہ تو ہوگا ہی، وہی دے دو۔ بازار میں بیچ دوں گا اور جو رقم ملے گی اس سے قلندروں کے لیے کھانا آجائے گا۔''

بیوی نے پیوندوں سے آراستہ دوپٹا شوہر کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ''یہ دوپٹا بازار میں کس طرح اور کتنی قیمت میں بکے گا۔ اس کا حلیہ خود ہی ملاحظہ کرلو، اب میں کیا عرض کروں؟''

آپ نے دوپٹے کو دیکھا تو شرمندہ ہوگئے، فرمایا۔ ''واقعی یہ تو بازار میں بک ہی نہیں سکتا۔''

آپ ایک بار پھر قلندروں کی صحبت میں تشریف لے گئے۔

قلندروں نے آپ کو دیکھا اور طنزاً پوچھا۔ ''کیا ہوا بھائی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''مہمانو! مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔''
قلندروں نے کہا۔ ''ہم تو تمہارے مہمان ہیں، ہمیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔''
آپ دوبارہ اندر گئے اور وہاں سے واپس آئے تو بھرا ہوا لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں ایک خالی پیالہ لیے ہوئے تھے۔
آپ نے اس حلیے میں نمودار ہو کر قلندروں سے کہا۔ ''صاحبان! میں آپ کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا کر چکا ہوں، آپ یہ سادہ پانی نوش فرما سکتے ہیں، پانی حاضر ہے۔''
قلندروں نے پانی لیا اور نہایت ادب و احترام سے باری باری پینے لگے۔ اس کے بعد آپ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسے دیے اور باہر نکل گئے۔
آپ اپنے اوپری حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت وہ بہت ملول تھے۔ وہ دل میں سوچ رہے تھے اور خدا سے کہہ رہے تھے۔ ''خدایا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ عید کا دن ہے، دنیا خوش و خرم ہے اور میرے گھر میں بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں۔ وہ تو کئی وقتوں کے بھوکے ہیں، ان پر رحم فرما۔ خدایا! میرے لیے یہ کیسی شرمناک بات ہے کہ مہمان آئیں اور نامراد واپس جائیں۔''
آپ انہی خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ آپ نے زینے پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ محسوس کی۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا شخص ان کے سامنے آ کھڑا ہوا، آپ نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کون ہیں؟ آپ کی تعریف؟''
اس بوڑھے نے ایک شعر پڑھا۔

با دلِ گفتم دلا خضر راہبی
دل گفت اگر مرا نماید بینم

(میں نے اپنے دل سے کہا کیا تو خضر کو دیکھتا ہے؟ دل نے جواب دیا اگر وہ مجھے دکھائی دیں تو ضرور دیکھوں)
آپ نے فرمایا۔ ''آپ کا تعارف تو ابھی باقی ہے۔''
بزرگ نے پوچھا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے آپ زیرلب کس کا شکوہ کر رہے تھے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں شکوہ کسی کا بھی نہیں کر رہا تھا، میں اپنے رب سے یہ کہہ رہا تھا کہ آج عید کے دن بھی میرے بچے بھوکے ہیں اور مہمان نامراد واپس جا رہے ہیں۔''
بزرگ نے فرمایا۔ ''متوکل! عرش پر فرشتے آپ کے توکل کی تعریفیں کر رہے ہیں اور آپ دنیاداری میں پھنسے ہوئے ہیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ بات نہیں ہے، میں دنیاداری کی باتیں نہیں کر رہا تھا بلکہ دوستوں کی ضروریات نے مجھ کو اس طرف مائل کر دیا۔''
اتنے میں آپ کسی ضرورت سے نیچے تشریف لے گئے۔ وہاں صحن میں کھانے کا خوان رکھا ہوا دیکھا۔ آپ نے بیوی سے پوچھا۔ ''یہ کون لایا؟''
بیوی نے لاعلمی ظاہر کی۔ ''مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں غیر مردوں کے سامنے نہیں جاتی۔''
آپ نے پوچھا۔ ''کیا تم آج صبح سے باہر نہیں نکلیں؟''
بیوی نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں آج صبح سے باہر نہیں نکلی۔''
آپ دوبارہ اوپر تشریف لے گئے تاکہ ان بزرگ سے پوچھیں کہ کہیں آپ تو یہ خوان نہیں لائے۔
اوپر پہنچے تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ بزرگ کا کہیں پتا نہ تھا، انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ یہ بزرگ نیچے بھی نہیں اترے، پھر یہ کہاں اور کدھر سے چلے گئے؟
کچھ دیر بعد انہوں نے کسی کی آواز سنی، کوئی سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ ''متوکل! کیا تم نے خضر کو نہیں پہچانا؟''
آپ نے زیرلب فرمایا۔ ''تو یہ تھے خواجہ خضر۔ خوب!''

☆☆☆

آپ کے ایک بھائی بدایوں میں رہتے تھے۔ آپ ہر سال ان سے ملنے کے لیے بدایوں جایا کرتے تھے۔ بدایوں میں قیام کے دوران دونوں بھائیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ چلو آج شیخ علی سے ملاقات کریں۔

شیخ علی ایک بزرگ تھے اور ان کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ دونوں بھائی جب ان بزرگ کی صحبت میں پہنچے تو کچھ خالی فرش پر چلے اور اس کے بعد وہاں بچھے ہوئے بوریے پر پاؤں رکھ دیے۔ شیخ علی واویلا مچانے لگے، بولے۔ ''تم دونوں نے یہ کیا غضب کر دیا۔ یہ بوریا نہیں مصلیٰ ہے۔''

دونوں بھائیوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور ذرا سے کھسک گئے۔

وہاں مصلے پر ایک کتاب بھی رکھی تھی۔ آپ نے شیخ علی سے پوچھا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو پڑھ لوں؟''

شیخ علی نے جواب دیا۔ ''تمہیں روکا کس نے ہے، پڑھ لو۔''

آپ نے جیسے ہی کتاب کو کھولا، اس میں نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا۔

''ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ اس دور کے مشائخ تنہائی میں تو گناہ کریں گے اور جب یہ لوگوں کے سامنے ہوں گے تو اگر ان کے سامنے کوئی بوریے پر اپنا پاؤں رکھ دے گا تو یہ قیامت کھڑی کر دیں گے۔''

شیخ علی نے پوچھا۔ ''شیخ کیا پڑھ رہے ہو؟''

انہوں نے کتاب کا مذکورہ صفحہ ان کے سامنے کر دیا، فرمایا۔ ''پڑھ لیجیے، کچھ آپ ہی کی بابت لکھا گیا ہے۔''

شیخ علی نے وہ حصہ پڑھا تو شرم سے زمین میں گڑ گئے، بولے۔ ''شیخ! میں نادم ہوں، مجھے معاف کر دو۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے معاف کیا، میری دعا ہے کہ میرا خدا بھی معاف کرے۔''

ایک روز آپ اپنے مریدوں سے فرما رہے تھے۔ ''لوگو! جب دنیا تمہارے پاس آئے تو خوب خرچ کرو کیونکہ ایسا کرنے سے کمی نہیں آئے گی اور اگر یہ چلی جائے تو اس کا غم نہ کرو اور اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو کیونکہ یہ پائیدار نہیں ہوتی۔''

آپ اپنے بھائی بابا فرید گنج شکر کی صحبت میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، دوران گفتگو پوچھا۔ ''بھائی! میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ آپ جب مناجات میں 'یا رب' کہتے ہیں تو آپ کو اس کا جواب 'لبیک یا عبدی' (اے میرے بندے میں حاضر ہوں) ملتا ہے۔''

بابا فرید نے فرمایا۔ ''نہیں۔'' پھر قدرے تامل کے بعد فرمایا۔ ''الارجاف مقدمۃ الکون (لوگوں کی زبان پر کسی بات کا مشہور ہو جانا اس چیز کے ہو جانے کا مقدمہ (واقعہ) ہے)''

آپ نے نہایت معصومیت سے ایک سوال اور کیا۔ ''بھائی! میں نے لوگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ حضرت خضر آپ کے پاس تشریف لاتے ہیں؟''

بابا فرید نے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

آپ نے مزید سوال کیا۔ ''لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ابدال آپ کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔''

بابا فرید نے جواب دیا۔ ''یہ درست ہے کیونکہ تم ابدال ہو۔''

نجیب الدین نے اپنا سر جھکا دیا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔

☆☆☆

غیاث پور کے نزدیک اندر پت میں بی بی فاطمہ سام نامی ایک بزرگ خاتون رہتی تھیں۔ یہ نجیب الدین متوکل کو اپنا بھائی کہتی تھیں۔ ان کی ایک کنیز تھی۔ وہ محنت مزدوری کر کے بی بی فاطمہ سام کا خرچہ پورا کرتی تھی۔

نجیب الدین متوکل کا حال غیر تھا۔ کئی دن سے فاقہ ہو رہا تھا۔ بظاہر فاقہ ٹوٹنے کا کوئی امکان بھی نظر نہ آتا تھا۔ صابر و شاکر بیوی اور بچے خاموش اللہ پر توکل کیے ہوئے تھے۔ آپ اپنے بالائی حجرے میں اللہ پر توکل کیے سجدے میں پڑے تھے۔

اتنے میں ایک مرید آیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں تاکہ میں کسی کام آؤں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں چپ رہوں گا کیونکہ میرا جو حال ہے اس سے میرا رب آگاہ ہے اور میرے رب نے میری بہن بی بی فاطمہ سام کو بھی اس سے آگاہ کر دیا ہے۔''

مرید نے تعجب سے کہا۔ ''لیکن پیر و مرشد! بی بی فاطمہ سام تو یہاں سے دور رہتی ہیں۔ انہیں آپ کا حال کیا معلوم؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ اللہ کے بعد بی بی فاطمہ سام ہی میرے حال سے باخبر ہیں۔''

مرید کو پھر بھی یقین نہ آیا، بولا۔ ”آپ فرماتے ہیں تو میں مانے لیتا ہوں ورنہ بات سمجھ میں نہیں آرہی۔“

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ کسی شخص نے دروازے پر دستک دی۔ آپ نے مرید سے فرمایا۔ ”دیکھ بی بی فاطمہ سام کا پیغام آگیا۔“

مرید باہر گیا تو دیکھا، دروازے پر ایک شخص کھانے پینے کا وافر سامان لیے کھڑا ہے۔ اس نے کہا۔ ”پیرومرشد سے کہہ دو کہ ان کی بہن بی بی فاطمہ سام نے انہیں یہ سامان بھیجا ہے کیونکہ انہیں اپنے کشف سے معلوم ہوا ہے کہ ان کے بھائی اور بیوی بچے بہت پریشان ہیں اور یہ سارا کچھ حلال کی کمائی کا ہے۔“

جب یہ سامان آپ کو ملا تو آپ نے مرید سے کہا۔ ”تو نے میری بہن کے کشف کا حال دیکھا اور سنا۔“ اس کے بعد فرمایا۔ ”لوگو! میرے فقر کا حال اس نیک خاتون پر جس طرح عیاں اور روشن ہے اگر خلیفۂ وقت پر اپنی رعایا کا حال اس طرح روشن اور عیاں ہو جائے تو اندرونِ حدودِ خلافت کوئی ننگا بھوکا نہ رہے۔“

ایک دن آپ اندر بہت تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا وہ مصلے پر سربسجود تھیں اور ان کے سامنے دو روٹیاں رکھی ہوئی ہیں۔ بی بی فاطمہ کی کنیز ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے اس سے آہستہ سے پوچھا۔ ”بی بی! یہ کیا معاملہ ہے؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ”کیا عرض کروں، معلوم نہیں بی بی میں کون سی قوت ہے جو غذا کے بغیر بھی انہیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میں ہر روز دو روٹیاں اسی طرح سامنے رکھ دیتی ہوں۔ یہ دن بھر روزہ رکھتی ہیں۔ شام کو دو لقموں سے روزہ افطار تی ہیں اور بقیہ روٹیاں کسی بھوکے کو دے دیتی ہیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ”کئی ماہ سے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میری بہن رابعۂ دوراں ہے، اس عہد کی رابعہ بصری۔“

کافی دیر بعد جب بی بی فاطمہ نے سجدے سے سر اٹھایا تو بہ آوازِ بلند متوکل سے پوچھا۔ ”بھائی! آپ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ میں یہ کیا سن رہی ہوں؟“

متوکل نے جواب دیا۔ ”بہن! میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی، جس پر آپ فکر مند ہوں۔“

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”میں اور رابعہ بصری۔ اس پاک طینت اور جید ترین ہستی کا مجھ گناہ گار سے موازنہ اور مقابلہ کرتے ہیں۔ میں تو شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی ہوں۔“

شیخ متوکل نے جواب دیا۔ ”بہن! یہ آپ کا عجز و انکسار ہے جو آپ اس طرح باتیں کر رہی ہیں ورنہ ایک زمانہ آپ کے مرتبے و مقام سے واقف ہے۔“

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”بھائی متوکل! یہ غیر متوقع تشریف آوری کا مطلب؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بہن! میرا دل گھبرایا تو چلا آیا۔ اندر دل ایک آواز کافی دنوں سے سن رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے، متوکل جا اپنی بہن سے ملاقات کر لے، پھر پتا نہیں کہ ملاقات ہو بھی یا نہ ہو۔“

بی بی فاطمہ نے ٹھنڈی سانس بھری، کہا۔ ”تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو بھائی متوکل! زندگی کا کیا بھروسا ہے۔ اس کا انحصار دو سانسوں پر ہے۔ ایک اندر جاتی ہے دوسری باہر آتی ہے۔ معلوم نہیں کب کوئی سانس بے وفائی کر جائے۔“

شیخ متوکل نے کہا۔ ”میں کچھ عرصہ یہیں رہوں گا۔“

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ”کچھ عرصہ! ارے آپ پوری زندگی یہاں رہ سکتے ہیں۔“

شیخ متوکل نے بات چیت کا سلسلہ بند کر دیا۔ بی بی فاطمہ بھی چپ ہو گئیں۔ رات کو کنیز سے کہا۔ ”کیا تو جانتی ہے کہ بھائی متوکل میرے پاس کیوں آئے ہیں؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ”بی بی جی! میں کیا جانوں؟“

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”اگر نہیں جانتی تو کچھ دنوں بعد جان جائے گی۔“

کنیز چپ ہو گئی۔ چند دنوں کے اندر ہی کنیز نے یہ بات محسوس کر لی کہ بی بی فاطمہ نے کھانا چھوڑ دیا ہے اور عبادت گزاری میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ پوری پوری رات سربسجود رہنے لگیں، وہ اس طرح گڑگڑا کر الحاح وزاری کرتیں، گویا وہ خدا سے مخاطب ہیں۔

رات کے پچھلے پہر آپ نے بی بی فاطمہ کی سسکیوں کی آواز سنی، وہ رو رہی تھیں اور اپنے رب سے کہہ رہی تھیں۔ ”اے اللہ العالمین! میری کنیز مجھ سے کہتی ہے کہ میں روٹی کھاؤں اور پانی پیوں لیکن میں تیری جدائی سے پریشان ہوں۔ تو کب تک مجھے دور دور رکھے گا۔ کیا میں خوب کھا پی کر خود کو تندرست و توانا کرلوں اور جدائی کے لمحات کو طول دیتی رہوں۔ میں جسم کی قید سے عاجز ہوں، خودکشی نہیں کرسکتی، بس تجھ سے یہی درخواست کرسکتی ہوں کہ میری مشکل آسان کردے۔“

اس خطرناک صورتِ حال میں بی بی فاطمہ نے چالیس دن گزار دیے۔ شیخ متوکل نے پوچھا۔ ”بی بی فاطمہ! کیا آپ دنیا سے اتنی ہی بیزار ہوچکی ہیں جو اس طرح اپنے خالقِ حقیقی سے ملنے کا منصوبہ بنالیا ہے۔“

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ”بھائی متوکل! اب میں یکسانیت اور تنہائی سے تنگ آچکی ہوں۔ وہ جس کی مجھے تلاش ہے جسم کی قید میں موجود روح اس کو نہیں پاسکتی۔ پھر کیوں نہ زندگی کو داؤ پر لگا کر میں جیت کا مزہ حاصل کرلوں۔“

ادھر بات چیت بند ہوئی، ادھر بی بی فاطمہ نے ایک نورانی چہرہ انسان کو گھر کے صحن میں کھڑا دیکھا۔ آپ کو ذرا شرم سی آئی، پوچھا۔ ”اے شخص! تو کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”بی بی فاطمہ! میں عزرائیل ہوں۔ آپ کی روح قبض کرنے آیا ہوں۔“

بی بی فاطمہ مسکرانے لگیں، بولیں۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔ میرے اللہ نے میری سن لی۔ میں کس زبان سے اس کا شکریہ ادا کروں اور کس طرح ادا کروں؟“

عزرائیل نے کہا۔ ”بی بی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”میں آپ سے زیادہ وقت مانگوں گی بھی نہیں۔ میں ان آخری لمحات میں تجدیدِ وضو کرنا چاہتی ہوں۔ تجدیدِ وضو کے بعد میں دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کروں گی۔ دو رکعت شکرانہ کے بعد دو رکعت مزید پڑھوں گی۔“

عزرائیل نے جواب دیا۔ ”آپ کو یہ وقت دیا گیا، میں انتظار کرلوں گا۔“

شیخ متوکل نے پوچھا۔ ”بہن! یہ تم کس سے باتیں کررہی تھیں؟“

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ”خدا کے ایک بندے سے، جو نوری ہے اور جسے ہر ذی روح کے پاس جانا پڑتا ہے۔“

شیخ متوکل نے کہا۔ ”تو گویا اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمہاری دعا قبول ہوگئی۔“

بی بی فاطمہ نے وضو کیا اور دو رکعت شکرانہ ادا کرنے لگیں۔ نمازِ شکرانہ کے بعد دو رکعت مزید ادا کیں۔ جب آپ دوسری رکعت میں سجدے میں گئیں تو عزرائیل نے کہا۔ ”بی بی فاطمہ! میں نے آپ کی خواہش پوری کردی تھی۔ اب میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔“

چنانچہ سجدے ہی میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ کنیز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آناً فاناً یہ خبر پھیل گئی اور لوگ جمع ہونے لگے۔ جب جنازہ تیار ہوگیا تو لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کردیں کہ ان کی نمازِ جنازہ کون پڑھائے گا۔

اچانک شیخ متوکل اٹھے اور اعلان کیا۔ ”بی بی فاطمہ سام میری عزیز ترین بہن تھیں۔ اب اگر ان کی نمازِ جنازہ میں نہیں پڑھاؤں گا تو پھر کون پڑھائے گا۔“

شیخ متوکل نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے، لوگوں نے کہا۔ ”پیرومرشد! کیا اس طرح رونا جائز ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں لیکن دل پر موجود غبار کو میں آنسوؤں ہی کے ذریعے بہا سکتا تھا۔“

تجہیز و تکفین کے بعد آپ نے بی بی فاطمہ کو خواب میں دیکھا، پوچھا۔ ”بہن! آپ کا کیا حال ہے؟“

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ”کم از کم میں تو بہت خوش ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”ذرا ادھر میری طرف دیکھو۔“

شیخ متوکل نے اس طرف دیکھا تو پتا نہیں کیا دیکھا کہ دل پر ہیبت سی طاری ہوگئی۔ اس وقت بی بی فاطمہ نماز پڑھ رہی تھیں۔

انہوں نے پوچھا۔ ”بہن! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟“

انہوں نے سلام پھیرنے کے بعد جواب دیا۔ ”بھائی متوکل! میں یہاں عرش پر نماز پڑھتی ہوں۔ خدا نے مجھ پر مہربانی

کی جو میں نے یہ مقام حاصل کرلیا۔"
آپ اپنے گھر واپس تشریف لے گئے۔

☆☆☆

نکلش نامی ایک ترک آپ کی خدمت میں بہت پابندی سے آیا کرتا تھا۔ یہ شخص نہایت خوش عقیدہ، متقی اور صالح تھا۔ ایک دن اس شخص نے خواب میں دیکھا، اللہ تعالیٰ اس کے سامنے موجود ہے اور وہ اللہ سے باتیں کررہا ہے۔
نکلش کو اس خواب نے پریشان کردیا، وہ شخص جس سے بھی یہ کہتا کہ اس نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، وہی نکلش سے ناخوش، بلکہ برہم ہوجاتا۔ اس نے اپنا یہ خواب شیخ متوکل کے سامنے بیان کردیا اور درخواست کی کہ جب تک میں زندہ ہوں، اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کیجیے گا۔ آپ نے وعدہ فرمایا۔
نکلش چالیس سال زندہ رہا مگر آپ نے یہ خواب کسی کو بھی نہیں بتایا۔ جب اس کا آخری وقت آیا تو آپ اس کی عیادت کو گئے اور اس کا حال پوچھنے لگے۔ نکلش نے جواب دیا۔ "پیرومرشد! میرا حال بہت اچھا ہے اور میں اس وقت بھی اپنے اندر ایک کیف سا محسوس کررہا ہوں۔"
آپ نے فرمایا۔ "خدا تیری اس حالت کو برقرار رکھے۔"
نکلش نے پوچھا۔ "پیرومرشد! میں نے چالیس سال پہلے ایک خواب دیکھا تھا، کیا آپ کو یاد ہے؟"
آپ نے فرمایا۔ "خوب اچھی طرح یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ تو نے مجھ سے اس کا عہد لیا تھا کہ میں اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کروں۔"
نکلش نے کہا۔ "پیرومرشد! اب میں اپنے خالقِ حقیقی کے پاس جارہا ہوں لیکن میں نے جو خواب چالیس سال پہلے دیکھا تھا اس کی لذت اور اس کا سرور آج بھی محسوس کررہا ہوں۔"
اس کے بعد اس کا انتقال ہوگیا، آپ نے فرمایا۔ "یہ دولت... کسی کسی خوش نصیب کو اچانک مل جاتی ہے۔ اللہ ہم سب پر کرم فرمائے، آمین۔"
آپ کے دو بیٹے تھے۔ آپ نے ایک کا نام احمد رکھا تھا اور دوسرے کا محمد۔ آپ ان دونوں ناموں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ آپ اپنے مریدوں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے کہ کسی بات پر ان دونوں سے ناراض ہوگئے۔ آپ نے اسی وقت ان دونوں کو آواز دی۔ "اے خواجہ احمد اور محمد!"
کسی مرید نے پوچھا۔ "آپ ان دونوں سے بے حد ناراض ہیں مگر آواز اس طرح دے رہے ہیں گویا درمیان میں ادب اور تکلف آڑے آرہا ہے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "کیا تم ان دونوں کے ناموں میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں کررہے کہ جن کا ادب اور احترام کیا جائے؟ میں انہیں احمد اور محمد کہہ کر مخاطب نہیں کرسکتا، اسی لیے لفظ خواجہ نام کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔"

☆☆☆

آپ دہلی سے اجودھن پاک بڑی پابندی سے جایا کرتے تھے۔ اجودھن پاک میں بابا فرید گنج شکر انہیں بڑی محبت اور شفقت سے رکھتے تھے۔
جب آپ پہلی بار اجودھن تشریف لے گئے تھے تو واپسی سے پہلے عرض کیا۔ "بھائی! میں دہلی واپس جارہا ہوں۔"
بابا فرید نے فرمایا۔ "فی امان اللہ۔ اللہ تجھے حفظ و امان میں رکھے۔"
شیخ متوکل نے فرمایا۔ "کیا آپ فاتحہ نہیں پڑھیں گے تاکہ میں آپ سے پھر ملنے آؤں۔"
آپ نے فاتحہ پڑھی اور شیخ متوکل پر دم کیا، فرمایا۔ "نجیب الدین! تم بے فکر رہو، تم اگلے سال پھر آؤ گے بلکہ بار بار آؤ گے۔"
آپ دہلی چلے گئے اور دوسرے سال پھر آئے۔
آپ نے اس بار پھر وہی درخواست کی۔ "بھائی! کیا آپ فاتحہ نہیں پڑھیں گے تاکہ میں اگلے سال پھر شرفِ ملاقات حاصل کروں۔"
بابا فرید نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، میری دعا ہے کہ تم بار بار اجودھن آؤ اور میں جانتا ہوں کہ تم اسی طرح آتے

جاتے رہو گے۔"

تیسری بار، چوتھی بار، پانچویں بار...... یہاں تک کہ شیخ متوکل نے بابا فرید کی خدمت میں انیس بار حاضریاں دیں۔
وقتِ رخصت آپ بابا فرید کے سامنے مؤدب کھڑے ہو گئے۔

بابا فرید نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بھائی! میں دہلی جا رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ ایک بار پھر فاتحہ پڑھیں اور مجھ کو اگلے سال آنے کی خوش خبری سنائیں تاکہ میں بیسویں بار بھی شرفِ ملاقات کروں۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "میں جو کچھ بھی کہتا ہوں بحکمِ ربی کہتا ہوں۔ اس بار میں فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔"

شیخ متوکل نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

بابا فرید نے جواب دیا۔ "طبیعت نہیں چاہ رہی۔"

شیخ متوکل نے کہا۔ "کیا میں یوں ہی چلا جاؤں؟"

بابا فرید نے فرمایا۔ "ہاں، تم یوں ہی چلے جاؤ۔"

شیخ متوکل کچھ دیر پس و پیش میں ڈوبے رہے پھر کہا۔ "اچھا پھر یہی کہہ دیجیے کہ تم بار بار آؤ گے۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "افسوس کہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔"

شیخ متوکل بہت بے چین ہو رہے تھے، پوچھا۔ "مگر بھائی کیوں؟ ایسا کیوں؟"

بابا فرید نے جواب دیا۔ "خدا کے لیے ان باتوں کو طول نہ دو۔ میں مشیتِ ایزدی کے خلاف کوئی کام کس طرح کر سکتا ہوں۔"

شیخ متوکل اپنے گھر دہلی چلے گئے۔ اسی دوران حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء اجودھن تشریف لے گئے، بابا فرید ان سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ "بابا نظام! میں تمہیں سندِ خلافت دینا چاہتا ہوں۔"

محبوب الٰہی نے کہا۔ "پیر و مرشد! یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں سندِ خلافت اور دستارِ خلافت حاصل کر لوں۔"

چنانچہ انہوں نے محبوب الٰہی کو سندِ خلافت دی اور دستارِ خلافت سر پر باندھ دی اور آخر میں فرمایا۔ "اب تو اگر دہلی جانا چاہے تو چلا جا، میری طرف سے اجازت ہے۔"

جب محبوب الٰہی دہلی جانے لگے تو بابا فرید نے فرمایا۔ "دیکھو نظام الدین! یہ خلافت نامہ جو میں نے تمہیں عطا کیا ہے، راستے میں ہانسی پڑے گا۔ تم ہانسی میں حضرت مولانا جمال الدین ہانسوی کو میرا خلافت نامہ ضرور دکھا دینا۔ پھر جب تم دہلی میں داخل ہو جاؤ تو وہاں قاضی منتخب کے پاس چلے جانا اور میرا خلافت نامہ انہیں بھی دکھا دینا۔"

محبوب الٰہی نے دبی زبان میں پوچھا۔ "اور پیر و مرشد! بابا متوکل کی بابت کیا ارشاد ہے۔ کیا انہیں یہ خلافت نامہ نہیں دکھانا ہے؟"

بابا فرید نے جواب دیا۔ "وہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہوگی۔ میں مشکل کام نہیں بتاتا۔"

حضرت محبوب الٰہی ہانسی ہوتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے تو انہیں پہلی خبر یہ ملی کہ حضرت نجیب الدین متوکل کا 19 رمضان 671ھ کو انتقال ہو گیا۔

محبوب الٰہی آپ کے مزار پر تشریف لے گئے اور سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا۔
"میں نے اس شہر میں آپ جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ آپ کو کبھی بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آج دن کون سا ہے، مہینا کون سا ہے؟ آپ کو کبھی یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ غلہ کس بھاؤ بکتا ہے یا گوشت کا نرخ کیا ہے...... کیوں؟ صرف اس لیے کہ آپ ہر وقت یادِ الٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔"

دہلی میں آپ کا مزار شیخ نجیب الدین شیر سوار کے نام سے مشہور ہے۔

ماخذات

سیر الاولیاء، امیر خورد۔ سیر العارفین، حامد بن فضل اللہ جمالی۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ فوائد الفواد، امیر حسن سنجری۔ گلزارِ ابرار، محمد غوث مانڈوی۔ خیر المجالس، ملفوظات چراغ دہلی

شاہ عبدالرحمٰن پاک

ضیا تسنیم بلگرامی

کہتے ہیں کہ انسان کی پیدائش سے قبل ہی کاتبِ تقدیر اس کی زندگی کے تمام عروج وزوال اس طرح تحریر کردیتا ہے کہ انسان کے گمان وخیال تک کی رسائی ممکن نہیں ہوتی کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا... لیکن وقت آہستہ آہستہ اس کتاب کے ورق یوں کھولتا چلا جاتا ہے جیسے کوئی بچہ نادانی میں صفحات الٹتا جائے... کچھ ایسا ہی حال شاہ عبدالرحمٰن کا بھی تھا جن کی حرکات وسکنات پیدائش کے بعد ہی تمام احباب کو چونکانے کا سبب بن رہی تھیں اور بالآخر زندگی کے مختلف ادوار نے ثابت کردیا کہ اللہ کا قرب پانے والے انسان کو اللہ نے ولایت میں کتنا اونچا مقام عطا فرمایا ہے۔

علم کی پیاس بجھانے کے لیے نگر نگر پھرنے والے ایک ولی کی تلاش کا قصہ

پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ میں ایک گاؤں صدیوں پہلے اورنگ شاہ پورہ کہلاتا تھا، پھر کچھ عرصے بعد اس کا نام رنگن پورڈلا ہوگیا۔ پھر جس طرح آبادیاں ویرانوں میں اور ویرانے بستیوں میں بدل جاتے ہیں، اسی طرح رنگن پورڈلا اجڑا تو اس ویرانے نے ایک ٹیلے کی شکل اختیار کرلی اور پنجابی زبان میں یہ بھڑ (ٹیلا) زیادہ مختصر ہوا تو یائے تصغر کے ساتھ 'بھڑی' کہلایا جانے لگا۔ ملک گوت ہرانے اس کو از سرِنو آباد کیا تو اس کا نام 'بھڑی ہراواں' پڑ گیا، پھر کچھ عرصے بعد جب اس پر قوم دھوتھڑ

کے لوگ قابض ہو گئے تو اس نے بھڑی دھوتھراں کے نام سے شہرت پائی اور آخر میں جب اس جگہ ایک ولی کامل شاہ عبدالرحمٰن نوشاہیؒ نے قدم رنجہ فرمایا اور یہاں سے اپنا فیض روحانی جاری کیا تو یہ جگہ 'بھڑی شاہ رحمٰن' کہلائی جانے لگی۔ امراء اور منصب داروں کے رکھے ہوئے نام ان کے کام کی طرح عارضی اور ہنگامی ہوتے ہیں لیکن جب بھی نام اللہ کے پاک اور برگزیدہ بندے رکھتے یا ان کی وجہ سے رکھے جاتے ہیں تو اس نام کو شہرت دوام حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ شاہ عبدالرحمٰن پاک کون تھے؟ یہ جاننے کے لیے عہدِ اکبری میں جانا پڑے گا۔

گجرات کا ایک خاندان گوجرانوالہ کے ایک گاؤں بھڑی میں آباد ہوا۔ اس خاندان کے سربراہ شیخ صالح محمد تھے۔ صالح محمد کی بیوی کا نام سلطان بیگم تھا۔ یہ لوگ اپنے تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے بڑے مشہور تھے۔ بھڑی ہی میں انہیں اللہ نے ایک بیٹا دیا، بیٹے کی پیدائش نے انہیں بہت خوش کر دیا۔ لوگوں نے مبارکبادیاں دیں، دونوں میاں بیوی پھولے نہیں سماتے تھے۔ یہ بیٹا اپنی حرکات وسکنات اور انداز سے عام بچوں سے مختلف محسوس ہوتا تھا۔ نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ ماں نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن میں بے نیازی کی کیفیت محسوس کی، دودھ پیا یا نہ پیا، ان کی کیفیت میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بھوک میں جس طرح بچے نڈھال ہو جاتے ہیں، عبدالرحمٰن میں اس قسم کی کوئی بات نہیں پائی جاتی تھی۔ کبھی کبھی سکوت کا ایسا دورہ پڑتا کہ گھر والے آواز تک کو ترس جاتے۔ ایسا لگتا گویا عبدالرحمٰن پر محویت طاری ہے اور وہ کسی اہم مسئلے پر غور فرما رہے ہیں۔ یہ کیفیت اس وقت زیادہ نمایاں ہوگئی جب عبدالرحمٰن کی عمر دو سال کی ہوگئی ان پر کسی کسی وقت سکر و مدہوشی کا دورہ پڑ جاتا۔ ماں باپ پریشان ہو جاتے اور ہوش میں لانے کے سارے جتن کر ڈالتے مگر ناکام رہتے اور جب ہوش آتا تو اپنے آپ ہی آجاتا۔

ماں نے اپنے بیٹے کے بارے میں شوہر کے سامنے اپنا خدشہ ظاہر کیا، بولیں۔ "جنابِ والا! مجھ کو تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ عبدالرحمٰن کسی شے کے زیرِ اثر ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی علاج ہونا چاہیے۔"

شوہر نے جواب دیا۔ "میں خود بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ اگر یہ کسی شے کے زیرِ اثر ہے تو اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ بہرحال لڑکے کو انتہائی احتیاط اور دیکھ بھال سے پالنا ہوگا۔"

ماں نے فرمایا۔ "میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے آج تک اس سے ایسا کوئی سلوک نہیں کیا کہ اس کو ناگوار گزرا ہو۔ میں اس کی نازبرداری اور دل جوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی۔"

شوہر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھ کو شبہ ہوتا ہے کہ اس پر کسی آسیب کا اثر ہے شاید لیکن جب تک مجھے اس کا کلی یقین نہ ہو جائے، میں کسی کامل سے رجوع نہیں کر سکتا۔"

ماں کو شوہر کی یہ بات اچھی نہیں لگی، جواب دیا۔ "میرا بیٹا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔ میں یہ بات کس طرح مان لوں کہ اس پر آسیب کا اثر ہے۔"

شوہر نے نرمی سے کہا۔ "بیوی جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، عبدالرحمٰن تمہارا ہی نہیں میرا بھی بیٹا ہے۔ میری یہ بات یاد رکھو کہ عبدالرحمٰن معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔ یہ غیر معمولیت کس قسم کی ہے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے وقت کا انتظار ہے۔"

عبدالرحمٰن کی عمر چار سال ہوگئی۔ ان پر وقتاً فوقتاً بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ جب بھی یہ دورہ پڑتا، شوہر بیوی کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگتا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ "دیکھو، غور کرو اور مجھے بتاؤ کہ یہ آسیب کا اثر نہیں تو اور کیا ہے؟"

انہی دنوں ساہن پال گجرات کے عارف کامل حضرت نوشہ گنج بخش بھڑی میں تشریف لائے۔ اس وقت بستی کے بچے کھیل کود میں مشغول تھے۔ ان بچوں میں عبدالرحمٰن بھی شامل تھے۔ جب حضرت نوشہ گنج بخش کی تشریف آوری کا چرچا ہونے لگا تو سارے بچے مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے نہایت ادب سے سلام کیا اور جہاں کھڑے تھے، وہیں کھڑے رہ گئے۔ چار سالہ عبدالرحمٰن نے جرأت سے کام لیا اور دوسرے بچوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور حضرت نوشہ کو خصوصی سلام نیاز پیش کیا۔ حضرت نوشہ نے سلام کا جواب تو دے دیا لیکن ساتھ ہی انہیں نہایت توجہ سے دیکھا۔ اس نظر میں معلوم نہیں کیا تھا کہ عبدالرحمٰن کی حالت ہی غیر ہوگئی۔ وہ جہاں کھڑے تھے وہیں گر گئے۔ بچوں میں کھلبلی مچ گئی۔ حضرت نوشہ کو جو کچھ دینا تھا دے چکے تھے۔ بچوں نے عبدالرحمٰن کے والد کو اطلاع دی کہ حضرت عبدالرحمٰن کے پاس تشریف لے چلیے، وہ راہ میں مدہوش پڑے ہیں اور ان کے منہ سے جھاگ جاری ہیں۔

شیخ صالح محمد آزردہ و پریشان بھاگتے ہوئے مدہوش عبدالرحمٰن کے پاس پہنچے اور انہیں گود میں اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ بولے۔ "میرے بیٹے! یہ تجھے کیا ہو جاتا ہے؟ افسوس کہ میں تجھے کہاں کس کے پاس لے جاؤں؟ میں کیا کروں؟ میری

تو کچھ سمجھ میں آ ہی نہیں رہا۔"

اسی طرح عبدالرحمٰن نے ایک سال اور گزار دیا اور یہ پانچ سال کے ہو گئے۔ والدین کو تعلیم کی فکر ہوئی مگر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ عبدالرحمٰن بالکل سنجیدہ نہیں ہیں بلکہ ایسا لگتا تھا گویا انہیں تعلیم کا سرے سے کوئی شوق ہی نہیں۔ ان وسوسوں اور خیالوں کے باوجود باپ نے بیٹے کو پڑھائی پر بٹھادیا۔ جو اساتذہ ان کی تعلیم پر متعین ہوئے تھے، انہیں بڑی مایوسی ہوئی اور انہوں نے چھوٹا سا ایک وعظ کہہ ڈالا۔" بیٹے! علم بڑی ضروری چیز ہے۔ علم کے بغیر سینہ گداز نہیں ہوتا اور علم کے بغیر خدا کو پہچانا بھی نہیں جاسکتا۔"

عبدالرحمٰن حیرت سے اپنے استاد کا وعظ سنتے رہے اور پھر بے ہوش ہو گئے۔ والدین ایک بار پھر پریشان ہو گئے۔ کافی دیر بعد جب ہوش میں آئے تو مستانہ وار بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھر والوں نے انہیں دوڑ کر پکڑلیا لیکن ان کے ایک جھٹکے نے سبھی کو گرادیا اور یہ پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ باپ کو حیرت تھی کہ اس کم سن میں آخر اتنی طاقت کہاں سے آگئی۔ انہوں نے بیٹے کا پیچھا کیا اور ہمسایوں کی مدد سے انہیں دوبارہ پکڑلیا اور گھر میں لے جا کر ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ ماں نے یہ منظر دیکھا تو ان کے دل پر چوٹ سی لگی، زاروقطار رونے لگیں۔ بیٹے کو سینے سے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔" میرے لعل! یہ تجھے کیا ہوجاتا ہے۔ تیرے ننھے منے پاؤں میں زنجیر دیکھ کر میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔" اس کے بعد وہ اپنے رب سے مخاطب ہوگئیں۔" خدایا مجھ پر رحم فرما۔ میرے بیٹے پر کرم فرما۔ اے میرے رب! بتا میں کیا کروں؟ اسے کس کے پاس لے جاؤں؟ کسے دکھاؤں؟ کس کا علاج کروں؟ میرے مولا! میری راہنمائی فرما۔"

اتنی دیر میں شوہر نے ایک طبیب کا انتظام کرلیا تھا۔ بیوی سے کہا۔" نیک بخت! تو پردے میں چلی جا، میں اسے طبیب کو دکھانا چاہتا ہوں۔ اگر عبدالرحمٰن کو کوئی بیماری لاحق ہوگئی ہے تو اس کا ابھی پتا چل جاتا ہے۔"

اللہ کی نیک بندی پردے میں چلی گئی اور طبیب اندر داخل ہوا۔ اس نے عبدالرحمٰن کا خوب اچھی طرح معائنہ کیا اور عبدالرحمٰن سے طرح طرح کے سوال کرنے لگا۔ پوچھا۔" صاحبزادے! یہ بار بار آپ کو کیا ہوجاتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔" مجھے کچھ پتا نہیں کہ مجھے کیا ہوجاتا ہے، بس ایک آگ سی لگی رہتی ہے اور میرا دل مجھے بے چین اور مضطرب رکھتا ہے۔ جب میرے استاد مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ علم کے بغیر تو میں خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ مجھے ذلیل وخوار کررہے ہیں۔ وہ معلوم نہیں کس خدا کی بات کرتے ہیں حالانکہ میرا رب میری نس نس میں موجود ہے۔ دنیا کی ہر شے میں وہ موجود اور ظاہر ہے۔ جب میں اس عظیم ہستی کا بوجھ اپنے دل ودماغ پر محسوس کرتا ہوں تو از خود رفتہ و وارفتہ ہوجاتا ہوں اور اس کی مجھے یہ سزا دی جاتی ہے کہ میرے پاؤں زنجیر میں جکڑ دیے جاتے ہیں۔"

طبیب ساری باتیں حیرت سے سنتا رہا، باپ سے پوچھا۔" جناب! اس بچے نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے یا نہیں؟"

باپ نے جواب دیا۔" ہم نے پڑھنے کے لیے بٹھایا تو تھا مگر اس نے کوئی دلچسپی ہی نہیں لی۔"

طبیب نے کہا۔" حضرت! میری سمجھ میں نہ تو آپ کی باتیں آرہی ہیں اور نہ ہی اس معصوم بچے کی۔ اس کی باتوں سے یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ ان پڑھ بچہ ہے۔ یہ میرے اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق بیمار تو ہرگز نہیں، ہاں آسیب کا شبہ البتہ ہوتا ہے اس لیے میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ اسے کسی عالم وکامل کے پاس لے جائیں اگر اس پر آسیب ہے تو وہی اسے دور کرسکتا ہے۔"

غمزدہ باپ نے بڑے دکھ سے طبیب کی طرف دیکھا۔" تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ بے بس اور مایوس ہیں؟"

طبیب نے جواب دیا۔" ہاں، ایسا ہی سمجھ لیں۔"

باپ نے کہا۔" اچھا پھر آپ جاسکتے ہیں، میں کسی عالم اور کامل کو تلاش کرتا ہوں۔"

کافی بھاگ دوڑ اور تگ ودو کے بعد ایک عالم اور کامل کی خدمات بھی حاصل کرلی گئیں اور اسے اس معصوم کے پاس پہنچادیا گیا۔ یہ عالم کامل بھی تھا اور عامل بھی۔ وہ پہلے تو انہیں بغور دیکھتا رہا پھر زیر لب کچھ پڑھنے لگا اور ان پر تین پھونکیں مار کر سوال کیا۔" تم کون ہو اور اس بچے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔" میں عبدالرحمٰن ہوں اور میں کسی کے بھی پیچھے نہیں پڑ گیا ہوں۔ میں تو عشق کی گرمی میں جلا جارہا ہوں۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسا عمل ہے جو میرے سینے سے میرے عشق کی گرمی کھینچ لے؟"

عامل صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔ باپ صالح محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" جناب! یہ بچہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ بچہ خود بول رہا ہے یا اس میں کوئی اور چھپا ہوا ہے اور وہ بول رہا ہے؟"

صالح محمد نے جواب دیا۔ "جناب! مجھے کیا پتا کہ اس میں کون بول رہا ہے۔ میں نے آپ کی خدمات اسی غرض سے حاصل کی ہیں کہ آپ مجھے اپنے علم کے زور سے یہ بتائیں کہ اس بچے پر کس کا اثر ہے؟"

عامل نے کہا۔ "جنابِ والا! یہ باتیں تو بڑے کمال کی ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس پر کس کی روح سایہ فگن ہے۔"

صالح محمد نے کہا۔ "یہ پتا چلانا آپ کا کام ہے۔ جب اس پر دورہ پڑتا ہے تو اس میں اتنی زیادہ طاقت آجاتی ہے کہ کئی آدمی اسے قابو میں نہیں کر سکتے۔"

عامل نے عرض کیا۔ "حضرت! میں کوشش کرتا ہوں مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ میں کامیاب بھی ہو جاؤں گا۔"

اتنے میں ماں نے پردے کی آڑ سے کہا۔ "عامل صاحب! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے بیٹے کو اچھا کر دیں گے تو خیر اپنا روحانی علاج شروع کر دیں لیکن اگر آپ کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں ہے تو خدا کے لیے میرے بیٹے کو تختۂ مشق ہرگز نہ بنایئے گا۔ آپ کو جو کچھ درکار ہو، میں حاضر کردوں گی۔"

عامل نے جواب دیا۔ "میں اس کا روحانی علاج اس لیے نہیں کر سکتا کہ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ آخر یہ سایہ ہے کس کا۔ جب بھی پتا نہ چلے گا تو پھر میں علاج کس طرح کروں گا۔"

عامل کی کھانے پینے سے تواضع کر کے اسے رخصت کر دیا گیا اور والدین کو ایک بار پھر یہ فکر لاحق ہو گئی کہ آخر اس بچے کا ہو گا کیا۔

صالح محمد جس سے بھی ملتا، اس سے یہی پوچھتا۔ "بھائی میرے لیے کچھ کرو۔ کسی ولیِ کامل کا پتا ہی بتاؤ تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔"

ایک بزرگ سے جب یہی بات کہی گئی تو انہوں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور کہا۔ "برادرِ عزیز! ایک ولیِ کامل ہیں تو سہی، ان سے زیادہ مناسب آدمی نہیں مل سکتا۔"

صالح محمد نے پوچھا۔ "کون بزرگ؟ ان کا نام؟"

بزرگ نے جواب دیا۔ "جناب! آپ ساہن پال گجرات تشریف لے جائیں۔ وہاں آپ کی ملاقات حاجی نوشہ گنج بخش سے ہو گی۔ یہ بزرگ اس عہد کے سب سے بڑے عالم اور ولی کامل ہیں۔ وہی آپ کے بیٹے عبدالرحمٰن کا علاج کر سکتے ہیں۔"

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ صالح محمد کے بڑے بیٹے شیخ الہداد نے باپ سے کہا۔ "پدر بزرگوار! آپ خاصے پریشان ہو چکے ہیں اس لیے اب میں عبدالرحمٰن کو لے کر ساہن پال خود جاؤں گا۔"

باپ نے کہا۔ "بیٹے! ٹھیک ہے۔ میں نے تو یہ سن رکھا ہے کہ حاجی صاحب کی ایک نظر ہی کافی ہے۔ عبدالرحمٰن ان کے سامنے پہنچتے ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

شیخ الہداد نے عرض کیا۔ "آپ بے فکر رہیں۔ اللہ نے چاہا تو میں عبدالرحمٰن کو اچھا کرا کے واپس آؤں گا۔"

چنانچہ شیخ الہداد انہیں لے کر ساہن پال چلے گئے۔ یہ عارف کامل حاجی نوشہ کی خانقاہ کے باہر بیٹھ گئے اور اپنی باری اور طلبی کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد آپ کے خادم نے باہر نکل کر شیخ الہداد سے کہا۔ "اندر تشریف لے چلیں، قبلہ حاجی صاحب یاد فرما رہے ہیں۔"

شیخ الہداد عبدالرحمٰن کے ساتھ اندر چلے گئے۔ آپ کی نظر جب عبدالرحمٰن پر پڑی تو چونک پڑے اور فرمایا۔ "ارے عبدالرحمٰن! یہ تم ہو؟ خیریت تو ہے؟ کیسے آنا ہوا؟" پھر شیخ الہداد سے پوچھا۔ "انہیں میرے پاس کیوں لائے ہو؟"

شیخ الہداد نے ساری کیفیت بیان کر دی اور آخر میں کہا۔ "قبلہ و کعبہ حاجی صاحب! پورا خاندان پریشان ہو رہا ہے، اگر عبدالرحمٰن پر آسیب کا اثر ہے تو اسے دور کر دیجیے۔"

آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ "کیسا آسیب، کہاں کا آسیب؟ یہ تو ہمارا منظورِ نظر ہے، اس کو آسیب نہیں ہے۔ رہ گئی اس کی مدہوشی اور بے ہوشی تو یہ وجد اور جذب کا نشان ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے عبدالرحمٰن کو حکم دیا۔ "وضو کر کے میرے پاس آجاؤ۔"

عبدالرحمٰن بے چون و چرا اپنی جگہ سے اٹھے اور جا کر غسل کیا پھر قبلہ حاجی نوشہ کی خدمت میں حاضری دی۔ حاجی نوشہ نے دریافت فرمایا۔ "دیکھ جھوٹ تیرے منہ سے اچھا نہیں لگتا، میں تجھے اپنا مرید کرنا چاہتا ہوں۔"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ "بسر و چشم۔ میں حاضر ہوں۔"

حاجی نوشہ نے انہیں بیعت کیا اور چند دنوں کے لیے اپنے پاس ہی روک لیا کہا "عبدالرحمٰن! یہ بڑی پُرخطر اور دشوار راہ

ہے۔ اس پر کم ہی لوگ چل سکے ہیں۔ میں نے خود بھی یہی پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ خدا تمہیں کامیاب کرے (آمین)۔“
عبدالرحمٰن نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہاں میں سکون محسوس کر رہا ہوں۔ میں آپ کی خدمت کروں گا اور یہیں آپ کے قدموں میں پڑا رہوں گا۔“
آپ نے فرمایا۔ ”کوئی مضائقہ نہیں۔“
عبدالرحمٰن اپنے پیر و مرشد کے پاس رہنے لگے۔ یہاں کوئی بے کار تو رہ نہیں سکتا تھا، پیر و مرشد نے ان کے سپرد بھی ایک کام کر دیا جو درویش کسبِ معاش میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ حضرت نوشہ ان کے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ آپ نے عبدالرحمٰن کو حکم دیا۔ ”اب یہ تمہارا فرض ہے کہ کھیتی باڑی میں مشغول درویشوں کو کھانا پہنچا دیا کرو۔“
آپ نے بلا عذر یہ ذمے داری قبول کرلی۔ دو پہر سے پہلے کھانا لے کر چلے جاتے۔ کام سے فراغت پا کر درویش کھانے میں مشغول ہو جاتے اور عبدالرحمٰن ان سے دور کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگتے۔ درویش اس بے نیازی اور لاتعلقی سے یہ سمجھتے کہ عبدالرحمٰن گھر سے کھانا کھا کر چلے ہوں گے۔
ادھر سے فارغ ہو کر جب یہ گھر پہنچتے تو گھر والے یہ سمجھتے کہ عبدالرحمٰن نے درویشوں کے ساتھ کھا لیا ہوگا۔ یہ معمول تھا جو جاری تھا اور کسی میں بھی اتنی جستجو نہیں تھی کہ کھانے کے بارے میں عبدالرحمٰن سے بھی معلوم کرلیتا۔ اس عمل کو کئی دن گزر گئے۔
ایک دن صبح ہی صبح حضرت حاجی نوشہ نے عبدالرحمٰن کو طلب کرلیا۔ حاجی صاحب کے فرستادے نے عبدالرحمٰن سے کہا۔
”اجی قبلہ! آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔ قبلہ حاجی صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔“
عبدالرحمٰن ڈر گئے۔ جواب دیا۔ ”حاجی صاحب نے مجھ کو یاد فرمایا ہے تو ضرور چلوں گا۔“
یہ حاجی صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ حاجی صاحب نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”عبدالرحمٰن! میں نے تجھے کیوں بلایا ہے کچھ معلوم ہے؟“
عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں اسی حد تک جانتا ہوں جس حد تک آپ کی اجازت ہوتی ہے۔“
حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا۔ ”میں کچھ اور جاننا چاہتا ہوں۔“
عبدالرحمٰن نے عرض کیا۔ ”آپ ارشاد تو فرمائیں۔“
حاجی صاحب نے اچانک سوال کر دیا۔ ”صاحبزادے! تم کھانا کہاں کھاتے ہو؟“
عبدالرحمٰن نے شرما کر جواب دیا۔ ”حضرت! میں کیا عرض کروں؟“
حاجی صاحب نے سخت لہجے میں سوال کیا۔ ”عبدالرحمٰن! میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں؟“
عبدالرحمٰن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، جواب دیا۔ ”کہیں بھی نہیں۔“
حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”آج جب میں نے کشف میں تمہیں دیکھا تو پتا چلا کہ تم بھوکے ہو، کئی دن کے بھوکے۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟“
عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ”درویشوں کے لیے جو کھانا دیا جاتا تھا، اس میں میرا حصہ نہیں ہوتا تھا اور گھر میں مجھے پوچھا نہیں گیا۔ تیسری جگہ تھی نہیں جہاں میں کھانا کھانے جاتا۔“
حاجی صاحب نے بے چینی سے فرمایا۔ ”عبدالرحمٰن! یہ تو نے کیا کیا؟ افسوس کہ تو بھوکا رہا۔“
حاجی صاحب نے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا۔ ”آ۔ میں تیرا پیٹ بھروں گا۔ تیرا روزہ میں کھلواؤں گا۔“
حاجی صاحب نے کوئلوں پر خود روٹیاں پکائیں اور اپنے ہاتھ سے عبدالرحمٰن کو کھانا کھلایا۔ اس کے بعد حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”عبدالرحمٰن! اس روٹی کے طفیل خدا نے تجھے مقامِ صمدیت سے سرفراز فرمایا۔ سلوک کا وہ مقام جہاں تجھے صفاتِ بشری سے مبرا کر دیا گیا۔ اب تجھے شہودِ ذات کا سرور عطا ہو چکا ہے اور اس سرور میں تجھے اکل و شرب (کھانے پینے) کا ہوش ہی نہیں رہے گا۔“
عبدالرحمٰن نے اپنے آپ میں انقلابِ عظیم محسوس کیا۔ وہ اپنی ذات میں جو سرور محسوس کر رہے تھے اس کی لذت اور کیفیت کے سامنے بھوک پیاس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔

☆☆☆

آپ نے اپنے پیر و مرشد سے پوچھا۔ ”اب میرے سپرد کون سی خدمت کی جا رہی ہے؟“

حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا۔ ”اب تم گاہڑی میں بیٹھ کر کنویں سے پانی کھینچا کرو۔“
یہ کنواں حاجی صاحب کے حجرے کے قریب ہی تھا۔ آپ کنویں کے پاس پہنچے اور گاہڑی میں بیٹھ کر بیلوں کو چلانا شروع کر دیا۔ کئی دن تک آپ یہ کام بڑی دلجمعی اور لگن سے انجام دیتے رہے پھر اچانک خیال آیا کہ یہ تو بیلوں پر بڑا ظلم ہے کہ میں خود بھی گاہڑی پر بیٹھوں اور بیلوں سے پانی بھی کھنچواؤں۔ وہ اپنا بوجھ جانوروں پر نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس احساس نے انہیں گاہڑی سے نیچے اتار دیا اور وہ بیلوں کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگے۔
کئی دن بعد انہیں خیال آیا کہ یہ بات کیا ہوئی کہ جانور تو گاہڑی کو کھینچ رہے ہیں اور پانی بھر رہے ہیں اور میں بے کار آزاد گاہڑی کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہوں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ آپ نے بیلوں کو کھول دیا اور خود جت گئے اور پانی کھینچنے لگے۔ ہر چکر میں جب پیر و مرشد کا حجرہ روبرو آجاتا تو بہ احتراماً اپنا سر جھکا لیتے اور پیر و مرشد کو سلام عرض کرتے۔
لوگوں کو آپ کی ان حرکات و سکنات کا علم ہوا تو وہ یہ تماشا دیکھنے کے لیے کنویں کے پاس آجاتے اور آپ کی جذب و کیفیت میں ڈوبی ہوئی اضطراری حرکتیں شوق اور حسد سے دیکھتے رہتے چونکہ ان میں مختلف اور متنوع مزاج اور مختلف فطرت کے لوگ شامل ہوتے اس لیے ان کی رائے بھی ایک دوسرے سے مختلف اور بعض اوقات متضاد ہوتی۔
کوئی صاحب فرماتے۔ ”صاحبان! کیا آپ میں سے کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ عبدالرحمٰن کو یہ ہو کیا گیا ہے؟“
دوسرا جواب دیتا۔ ”میں حاجی صاحب قبلہ کے احترام میں کچھ کہہ تو سکتا نہیں، ہاں اگر یہی حرکتیں کوئی اور کرتا تو میں یہی کہتا کہ یہ پاگل ہو گیا ہے، یہ دیوانہ ہو چکا ہے۔“
تیسرا زبان کھولتا۔ ”پتا نہیں ان پر جذب و کیف طاری ہے یا یہ جنون میں مبتلا ہیں؟“
کوئی اور صاحب فرماتے۔ ”اگر یہاں ایسے لوگ آنے اور رہنے بسنے لگے تو صحیح الدماغ تو یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ خدا کے لیے کچھ اور باتیں کرو یہاں کی حد تک اپنی اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔“
ایک صاحب نے پیر و مرشد سے ان کی شکایت کر دی۔ حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”عبدالرحمٰن میرا مست ہے، اس کی فکر میں کرتا ہوں کسی اور کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“
معترضین اور نکتہ چیں اپنا وقت ضائع کرتے رہے اور عبدالرحمٰن اپنی خدمات عام کرتے رہے۔ آخر ایک دن ان کے پیر و مرشد نے انہیں طلب کیا اور پوچھا۔ ”عبدالرحمٰن! اب تمہیں کیسا لگتا ہے؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ہر وقت ایک نشہ ایک کیف طاری رہتا ہے اور اکل و شرب کا خیال ہی دل و دماغ سے محو ہو چکا ہے۔“
حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”عبدالرحمٰن! میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔ اب میں تجھے خرقۂ خلافت دوں گا اور تو کسی اور جگہ بیٹھ کر مخلوق کی خدمت کرتا رہے گا۔“
عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ”کیا میں آپ کی صحبت سے محروم ہو جاؤں گا؟“
حاجی صاحب نے جواب دیا۔ ”ہاں مگر مجھ سے جدا ہو کر تو مخلوق کی خدمت میں مصروف ہو جائے گا اور تجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہے گا۔“
عبدالرحمٰن سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ حاجی صاحب نے انہیں خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور حکم دیا۔ ”عبدالرحمٰن! تم بھڑی واپس جاؤ اور وہاں بیٹھ کر مخلوق کی راہنمائی کرو۔ خدا اس سے راضی رہے گا۔“
عبدالرحمٰن نے خرقۂ خلافت لیا اور اپنے گاؤں بھڑی کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ آپ کی منزل بھڑی نہیں، اس کے مضافات کی کوئی جگہ تھی۔ چنانچہ بھڑی کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے۔ یہ جگہ بھڑی کے شمال میں واقع تھی۔ آپ نے اس جگہ پر اپنا ڈیرا ڈالا۔ آپ کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرف آپ کا شہرہ پھیل گیا۔ مخلوق جوق در جوق آنے لگی اور اپنی دلی مرادیں پا کر خوش و خرم واپس ہونے لگی۔ آپ نے اپنے ڈیرے کے قریب ہی ایک کٹیا دیکھی۔ لوگوں سے پوچھا۔ ”اس کٹیا میں کون رہتا ہے؟“
جواب ملا۔ ”اس میں ونڈورام نامی ایک ہندو فقیر رہتا ہے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”اچھا تو اس میں ونڈورام رہتا ہے...... خوب۔“
آپ کی موجودگی اور تشریف آوری کا یہ اثر ہوا کہ ونڈورام کی کٹیا اجڑنے لگی۔ مخلوق آپ کے ڈیرے پر آنے لگی۔ ونڈورام اپنی محنت اور ریاضت سے دنیا کماتا تھا، جب اس کی کمائی میں رخنہ پڑا تو وہ بہت برہم ہوا اور آپ کے پاس پیغام

بھیجا کہ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اسی طرح یہاں دو فقیر بھی نہیں رہ سکتے۔ بہتری اسی میں ہے کہ کہیں اور چلے جاؤ کیونکہ میں یہاں پہلے سے رہ رہا ہوں۔

آپ نے جواب میں کہلا دیا۔ ''افسوس کہ میں یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ میرے پیرومرشد نے مجھے اس جگہ بٹھایا ہے۔ اب وہی اگر مجھے اٹھائیں گے تو اٹھ جاؤں گا۔''

وندورام کو اس جواب پر غصہ آ گیا۔ آپ کے پاس خود پہنچ گیا، بولا۔ ''میاں جی! کیا آپ کو میرا پیغام نہیں ملا؟ کیا آپ کو میری حیثیت کا علم نہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تیرا پیغام مجھے مل گیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ میرا جواب بھی تجھے مل گیا ہوگا اور میری سمجھ میں تیری یہ بات نہیں آئی کہ اگر تجھ کو میرا جواب نہیں ملا تھا تو پھر یہ تو چراغ پا ہو کر میرے پاس کیوں آ گیا؟''

وندورام جز بز تو بہت ہوا مگر نرمی سے بولا۔ ''بہر حال میں آپ سے بنتی کرتا ہوں کہ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ مجھے اس جگہ میرے پیرومرشد نے بٹھایا ہے۔ میں ان کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب وہ یہاں سے اٹھ جانے کا حکم دیں گے تو میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

وندورام نے اکڑ کر جواب دیا۔ ''میاں جی! میں مروت اور شرافت سے کام لے رہا ہوں ورنہ مجھے وہ طریقہ بھی آتا ہے کہ میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ ادا کروں اور آپ یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اگر یہ کام اتنا ہی آسان ہے تو پھر دیر کس بات کی۔ مجھ سے باتیں کر کے اپنا اور ہمارا وقت کیوں برباد کرتے ہو؟''

وندورام نے کہا۔ ''میاں جی! جس چیز کو تم کرامات کہتے ہو اسے میں بھی حاصل کر چکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم کرامات میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''جس شے کو تو کرامات کہہ رہا ہے، وہ دراصل استدراج ہے۔ کرامات سے ملتی جلتی مگر ناقص...... اور اس کو تو دنیا کمانے کے لیے کام میں لاتا ہوگا۔''

وندورام کو غصہ آ گیا، بولا۔ ''میں چاہوں تو آپ کے ڈیرے کو جلا کر خاک کر دوں۔''

آپ نے بڑے تحمل سے فرمایا۔ ''آگ بھی خدا کے حکم کے خلاف ایک تنکا بھی نہیں جلا سکتی۔''

وندورام کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا، بولا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو آپ کا ڈیرا بہت جلد سانپوں سے بھر جائے گا۔ اگر آپ میں دم ہے تو میرے سانپوں سے لڑ بھڑ لیجیے گا۔''

وندورام غصے میں اول فول بکتا چلا گیا۔

اس نے اپنی کٹیا میں داخل ہوتے ہی تصرف سے کام لیا۔ وہ سانپوں کا عامل تھا۔ وہ کچھ دیر زیر لب جاپ کرتا رہا پھر بآواز بلند حکم دیا۔ ''ناگو! جاؤ اور اس مسلمان فقیر کو بھگا دو۔ خبردار جو مروت کی۔''

کچھ دیر بعد ہر طرف سے سانپ نمودار ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ وندورام کی کٹیا کے باہر جمع ہو گئے۔

وندورام نے انہیں حکم دیا۔ ''کیا تم نے میرا حکم نہیں سنا؟ میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ جاؤ اور عبدالرحمٰن کے ڈیرے میں پھیل جاؤ اور اس مسلمان جوگی سے کہو کہ وہ یہاں سے کہیں اور چلا جائے۔''

سانپوں نے پھن اٹھا اٹھا کر وندورام کو سلام کیا اور عبدالرحمٰن کے ڈیرے کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ جب سانپوں کا یہ قافلہ ڈیرے کی طرف جا رہا تھا تو دیکھنے والوں نے شور و غل کرنا شروع کر دیا۔ دو ایک آدمی آپ کے ڈیرے میں بھی داخل ہو گئے اور کہا۔ ''شاہ صاحب! ہزاروں سانپ آپ کے ڈیرے کی طرف بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تم لوگ بالکل فکر نہ کرو، سب کچھ صحیح ہو جائے گا۔''

اس کے بعد آپ اٹھے اور ڈیرے کے باہر کھڑے ہو گئے۔ اس شخص سے پوچھا۔ ''کہاں ہیں وہ سانپ جن کا تو ذکر کر رہا تھا؟''

اس شخص نے دور سامنے اشارہ کیا۔ ''حضرت! وہ رہے۔ کیا آپ سامنے سڑک پر بہت ساری سائیں سائیں نہیں سن رہے ہیں؟ یہ سانپوں کے سرسرانے کی آواز ہے۔''

آپ نے نہایت اطمینان سے فرمایا۔ ''اچھا، تو ان سانپوں میں زہر بھی ہوگا؟''

ارادت مند نے جواب دیا۔ ”حضرت! یہ سانپ ہیں، ان میں زہر تو ہوگا ہی۔“
آپ نے معصومیت سے دوسرا سوال کیا۔ ”اور یہ کاٹتے بھی ہوں گے؟ میرا مطلب ڈسنے سے ہے یعنی یہ جانداروں کو ڈس بھی لیتے ہوں گے؟“
مرید نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، یہ ڈس بھی لیتے ہیں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”اگر یہ بات درست ہے تو میں آج اس کا تجربہ کروں گا۔“
اب سانپ ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھا اور بہ آوازِ بلند ڈانٹ دیا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہیں کس کی تلاش ہے؟“
سانپوں نے کوئی جواب تو نہیں دیا مگر پھر فوراً ہی انہوں نے پھنکارنا شروع کر دیا۔ آپ نے ان سانپوں کو وہیں چھوڑا اور خود اندر چلے گئے اور اپنے ایک مرید سے فرمایا۔ ”اس نے مجھ پر سانپ بھیجے تھے تاکہ یہ مجھے مرعوب اور دہشت زدہ کر کے یہاں سے اٹھوا دیں لیکن میں نے ایک بار جو بات کہہ دی ہے، وہی آخر تک کہتا رہوں گا۔ میرے پیر و مرشد یہاں سے چلے جانے کا اگر حکم دیں گے تو میں اس کی فوراً ہی تعمیل کروں گا۔“
اب سانپ بالکل ان کے مقابل کھڑے ہوئے تھے لیکن پھن کوئی بھی نہیں اٹھائے ہوئے تھا۔
عبدالرحمٰن نے اچانک انہیں متنبہ کیا۔ ”تم نے یہاں تک آنے کی جسارت کی ہے تو اب اپنے اس جرم کی سزا بھگتو۔“
سانپ کچھ دیر تو وہاں پھن اٹھائے موجود رہے، اس کے بعد انہوں نے مڑنا اور بھاگنا شروع کر دیا۔
ایک مرید نے پوچھا۔ ”حضرت! کیا اب یہ سانپ دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اب یہ دوبارہ یہاں آ کر کریں گے کیا؟ میں نے ان کا زہر تو کھینچ ہی لیا ہے، اب یہ بے کار ہو چکے ہیں۔“ پھر اس مرید کو حکم دیا۔ ”جا...... وندو رام سے کہہ دے کہ میں نے اس رقیبے کے حاضر اور غیر حاضر سارے ہی سانپوں کا زہر کھینچ لیا ہے۔ اب وہ بیکار ہو چکے ہیں۔“
مرید نے آپ کا یہ پیغام وندو رام کو پہنچا دیا۔ وندو رام ہمت ہار چکا تھا، بولا۔ ”میاں جی سے کہہ دینا، میں ہار گیا آپ جیت گئے۔ اب میں ہی اپنی کٹیا کو کہیں اور لے جاؤں گا۔“
اس کے بعد وندو رام نے اس جگہ کو چھوڑ دیا اور وہاں سے دو میل دور چلا گیا اور یہاں ڈیرا ڈالا۔ یہ جگہ آج بھی موجود ہے۔ حافظ آباد سے گوجرانوالہ کی طرف چلیے تو اس سڑک پر آپ کو یہ گاؤں ملے گا جو آج بھی ڈیرا وندو رام کہلاتا ہے۔

☆☆☆

ایک دن آپ اپنے پیر و مرشد حاجی نوشہ گنج بخش کے ساتھ کشتی میں سوار دریائے چناب کی سیر کر رہے تھے۔ اس کشتی میں حاجی نوشہ کے کئی مرید بھی سوار تھے۔ اس عالم میں کشتی ہی پر قوالی شروع ہو گئی۔ حاضرین دیکھ رہے تھے کہ قوالی کا شاہ عبدالرحمٰن پر شدید اثر ہو رہا ہے۔ آپ وجد میں جھوم رہے تھے۔ جھومنے میں تیزی آگئی اور آپ نے حالتِ وجد میں نعرہ مارا اور دریا میں گر گئے۔ کشتی والوں میں بے چینی پھیل گئی۔ جو لوگ تیرنا جانتے تھے وہ دریا میں کود جانا چاہتے تھے مگر حضرت حاجی نوشہ گنج بخش نے فرمایا۔ ”عبدالرحمٰن کے لیے دریا میں کودنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“
حاضرین میں سے کسی نے پوچھا۔ ”کیوں حضرت؟ پھر یہ نکلیں گے کس طرح؟“
حضرت حاجی نوشہ نے جواب دیا۔ ”جس چیز نے انہیں پانی میں پہنچایا ہے وہی چیز انہیں نکالے گی اور پھر میرا شاہ عبدالرحمٰن تو پانی میں پاک ہونے گیا ہے۔“
پیر و مرشد کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ کسی نے پھر پوچھا۔ ”حضرت! پھر یہ نکلیں گے کس طرح؟“
آپ نے فرمایا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ یہ جس طرح اندر گئے ہیں اسی طرح برآمد بھی ہو جائیں گے۔“
ایک شخص نے سوال کیا۔ ”اور کب؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”جب وہ باہر نکلنا مناسب سمجھیں گے۔“
اس واقعے کو کئی دن گزر گئے مگر شاہ عبدالرحمٰن پانی سے برآمد نہیں ہوئے۔ آخر مایوس ہو کر مریدوں نے آپ کو گھیر لیا اور کہا۔ ”حضرت! اب تو کئی دن گزر گئے، خیال ہے انہیں مچھلیاں کھا گئی ہوں گی۔“
آپ نے جوش میں فرمایا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ مچھلیوں کی مجال کہ وہ شاہ عبدالرحمٰن کو اپنا لقمہ بنا لیں۔ وہ جس شان سے

اندر گیا ہے اسی شان سے باہر آجائے گا۔"
آخر کئی دنوں بعد آپ نے اپنے قوال کو آواز دی۔ "ارے بھائی! کدھر چلے گئے ذرا ادھر آؤ۔"
قوال بھاگا بھاگا آیا اور ادب سے عرض کیا۔ "جی پیر و مرشد! بندہ حاضر ہے۔"
آپ قوال کو دریائے چناب کے ساحل پر لے گئے اور اس سے کہا۔ "بھائی! کئی دن پہلے اپنا شاہ عبدالرحمٰن بحالتِ وجدان دریا میں چلا گیا تھا۔ اب اسے باہر آجانا چاہیے۔"
قوال دم بخود آپ کی باتیں سنتا رہا، جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پوچھا۔ "جی پیر و مرشد! میں آپ کا مفہوم نہ پا سکا۔"
آپ نے فرمایا۔ "جس طرح وہ تیری قوالی سن کر وجد کی حالت میں پانی کے اندر چلا گیا تھا، اب اسی قوالی سے وہ پانی سے باہر آئے گا۔"
قوال حیرت سے آپ کی شکل دیکھتا رہا، آپ نے فرمایا۔ "میاں تم قوالی شروع کرو تا کہ شاہ عبدالرحمٰن قوالی سن کر باہر آجائے۔"
قوال کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی مگر تعمیلِ ارشاد میں قوالی شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد بحالتِ وجد شاہ عبدالرحمٰن پانی کے اندر سے نمودار ہوئے اور میاں علی قوال کے پاس بیٹھ گئے۔ قوالی جاری رہی اور عبدالرحمٰن... پورے انہماک سے قوالی سنتے رہے۔ حضرت حاجی نوشہ کے مریدوں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ انہوں نے اس وقت جو کچھ دیکھا تھا، وہ سراسر نا قابلِ یقین تھا لیکن وہ اس پر یقین کیوں نہ کرتے کیونکہ انہوں نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔
جب قوالی ختم ہوگئی تو حاضرین چلے گئے۔ اس وقت آپ نے شاہ عبدالرحمٰن سے کہا۔ "شاہ عبدالرحمٰن! جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے میں بھی رسوا ہو رہا ہوں اور تم بھی رسوا ہو رہے ہو۔"
شاہ عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ "حضرت! میں کیا عرض کروں، آپ تو سب کچھ بغیر بتائے ہی جانتے ہیں۔"
پیر و مرشد نے فرمایا۔ "جو کچھ ہوا، اس کا بڑا چرچا ہو رہا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ اب تم پاک ہو چکے ہو اور اب تم ہمیشہ شاہ عبدالرحمٰن ہی کہلاؤ گے۔"
شاہ عبدالرحمٰن مغلوب الجذبات ہو رہے تھے، اس وقت ان میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ اپنے پیر و مرشد سے آنکھیں ہی ملا لیتے۔ نظریں جھکائے مؤدب بیٹھے رہے۔
اب وہ جس مقام پر فائز ہو چکے تھے اس کی ذمے داریوں اور فرائض میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ شدید ترین گرمیوں کا زمانہ تھا اور شاہ عبدالرحمٰن نے اپنے پورے جسم کو کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ جو مرید اور ارادت مند وہاں موجود تھے، انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ اتنی شدید گرمی میں بھی وہ کمبل میں لپٹے بیٹھے تھے۔ ایک مرید کا تو اس حلیے نے حال ہی غیر کر دیا تھا، اس نے پوچھا۔ "شاہ جی! کیا بات ہے، کیا آپ کو جاڑے بخار نے گھیر لیا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں...... کیوں؟"
مرید نے عرض کیا۔ "حضرت! اتنی سخت گرمی میں کمبل میں چھپ جانا عجیب سی بات ہے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن اس طرح میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنا چاہتا ہوں۔"
مرید نے پوچھا۔ "پیر و مرشد! وہ کس طرح؟"
آپ نے فرمایا۔ "میرا نفس موٹا ہو رہا تھا۔ اس نے شدید گرمی میں ٹھنڈی ہوا اور ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کیا تھا چنانچہ میں نے ان دونوں کی جگہ گرم کمبل دے دیا۔ اس سے وہ اتنا سہم گیا کہ اب یہ آئندہ ٹھنڈے پانی اور ٹھنڈی ہوا کا مطالبہ نہیں کرے گا۔"
اور جب سردی کا موسم آیا تو انہوں نے کورے گھڑے میں پانی بھر کر آسمان تلے رکھ دیا۔ صبح جب سو کر اٹھے اور کورے مٹکے کے پانی کو انگلی ڈال کر دیکھا تو وہ یخ ہو رہا تھا۔ آپ نے مریدوں سے فرمایا۔ "دوستو! میرا نفس مجھ سے کہہ رہا تھا کہ گرم پانی سے غسل کر کے گرم گرم بستر میں چلا جا مگر میں نے اس کی یہ بات نہیں مانی اور وہی کیا جس سے میرے نفس کو تکلیف پہنچتی ہے۔"
آپ کی ریاضتوں کا یہ حال تھا کہ کنویں میں معکوس لٹک کر نماز ادا کرتے تھے۔ جو لوگ یہ منظر دیکھتے ان کا برا حال ہو جاتا۔

اس عہد کے مشہور صوفی شاہ مسکین قلندر کے مکان پر محفلِ سماع قائم تھی۔ حضرت حاجی نوشہ گنج بخش بھی شاہ عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اس محفل میں بڑے باکمال لوگ موجود تھے، کسی کا حال کسی سے مخفی نہیں تھا۔ قوالی جوش و خروش سے ہو رہی تھی۔ شاہ مسکین پر وجد طاری ہو گیا اور وہ رقص کرنے لگے۔ صاحبانِ حال نے باطنی نگاہ سے دیکھا کہ شاہ مسکین کے ہاتھ پہلے آسمان کو چھو رہے ہیں۔ حضرت حاجی نوشہ نے شاہ عبدالرحمٰن پر توجہ کی اور یہ بھی غلبۂ شوق میں رقص کرنے لگے۔ اس عالم میں صاحبانِ حال نے اپنی اپنی چشمِ باطن سے دیکھا کہ شاہ عبدالرحمٰن چوتھے آسمان پر کھڑے رقص کر رہے ہیں اور ان کے ہاتھ عرشِ معلٰی تک پہنچ رہے ہیں۔

شاہ مسکین قلندر نے انہیں اس حال میں دیکھا تو طنزاً کہا۔ ”واہ جناب، واہ، پیرومرشد صاحب تو زمین پر یعنی نیچے ہیں اور مرید کے پاؤں اوپر چوتھے آسمان پر۔“

شاہ عبدالرحمٰن کو ایسا لگا جیسے کسی نے اوپر سے دھکا دے دیا ہو۔ وہ بے ہوش ہو کر حضرت حاجی نوشہ کے قدموں میں گر گئے۔ بے ہوشی کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ دیر تک ہوش ہی نہ آیا۔ حضرت حاجی نوشہ نے آپ کے پاؤں میں رسا ڈال کر درخت پر الٹا لٹکا دیا، اس کے باوجود آپ دیر تک وجد و حال میں رہے۔

آپ کی پیرومرشد سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ آپ جب بھی ساہن پال تشریف لے جاتے، اپنی جوتی میلوں دور اتار کر ایک جگہ رکھ دیتے اور پیرومرشد کے دربار میں ننگے پاؤں حاضری دیتے۔ پھر جب واپس آتے تو اسی جگہ سے جوتی پہن کر بھڑی تشریف لے جاتے۔ آپ جس جگہ جوتی چھوڑ جاتے تھے، وہ جگہ پیر مہلہ کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

جب کوئی شخص پیرومرشد کے علاقے سے آپ کے پاس پہنچتا تو آپ اس کا حد درجہ احترام کرتے۔ اس کو چارپائی پر بٹھا کر خود نیچے بیٹھ جاتے تھے۔ پیرومرشد کا یہ حال تھا کہ اپنے اس مرید پر خاص توجہ رکھتے۔ جب بھی کوئی شخص بھڑی سے ساہن پال پہنچتا آپ اس سے شاہ عبدالرحمٰن کے بارے میں ضرور پوچھتے۔

ایک دن بھڑی کا ایک کھتری سوداگر فروش حضرت حاجی نوشہ کے پاس پہنچا۔ آپ اس سے کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر فرمایا۔ ”تمہارے گاؤں میں ہمارا ایک درویش بھی تو رہتا ہے۔“

کھتری نے پوچھا۔ ”حضرت! اس درویش کا نام کیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”شاہ عبدالرحمٰن۔“

کھتری شاہ عبدالرحمٰن کا نام سن کر مسکرایا، بولا۔ ”ہاں جناب! اس نام کا ایک درویش بھڑی میں رہتا تو ہے۔“

حضرت حاجی نوشہ نے دریافت فرمایا۔ ”مگر یہ تو ہنسا کیوں؟“

کھتری نے جواب دیا۔ ”جناب! جس شخص کو درویش کہہ رہے ہیں وہ ایک دیوانہ سا شخص ہے۔ ساری رات گیدڑ کی طرح گاؤں کے چکر لگاتا رہتا ہے، لوگوں کو آرام تک نہیں کرنے دیتا۔“

حضرت حاجی نوشہ کو غصہ آ گیا، حالتِ جلال میں فرمایا۔ ”اے گدھے تو کیا جانے۔ وہ تو خدا کا شیر ہے۔ ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ وہ شیر کی طرح غرائے گا اور اس کی حالت لوگوں پر خود بخود ظاہر ہو جائے گی۔“

بعد میں پیرومرشد کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ آپ ذکرِ جہر کرتے تو بالکل شیر کی طرح گرجنے لگتے اور اس کے اثرات صاف ظاہر ہونے لگے۔

جب پیرومرشد حاجی نوشہ کا آخری وقت آیا تو آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں نے مستقل حاضریاں دینا شروع کر دیں۔ شاہ عبدالرحمٰن بھی ہر وقت ان کے پاس موجود رہتے۔

ایک دن حضرت حاجی نوشہ نے سبھی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”لوگو! میں دنیا سے جانے والا ہوں اگر کسی کو کوئی غرض و حاجت ہو تو طلب کر لے پھر یہ موقع نہیں ملے گا۔“

چنانچہ ہر شخص نے اپنی مطلوبہ شے کا مطالبہ کر دیا۔ انہی میں حاجی نوشہ گنج بخش کے نامی گرامی مرید اور خلیفہ حضرت پیر محمد سچیار بھی موجود تھے۔ انہوں نے اپنے پیرومرشد سے عرض کیا۔ ”حضرت! اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کچھ عرض کروں؟“

حضرت حاجی نوشہ نے فرمایا۔ ”جب میں نے طلب کرنے کی اجازت ہی دے دی ہے تو پھر برا کیوں مانوں گا۔“

حضرت سچیار نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں نہ تو دین چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ہی دنیا...... میں دونوں ہی چیزیں

چاہتا ہوں۔“

پیرومرشد نے جواب دیا۔”سچیار! خوش ہو جا کہ میں نے تیرے سلسلے میں قیامت تک دولت مندی اور دین داری قائم کر دی۔“

اس کے بعد آپ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔”آج میرا مستانہ کہیں نظر نہیں آ رہا؟“

شاہ عبدالرحمٰن اداس اور مغموم اس طرح سر جھکائے بیٹھے تھے کہ نظر ہی نہ آتے تھے۔ کسی شخص نے جواب دیا۔

”پیرومرشد! یہ رہے شاہ عبدالرحمٰن۔ میرے پاس بیٹھے ہیں۔“

آپ نے انہیں آواز دی۔”اے میرے مستانے! اِدھر میرے پاس تو آ۔“

شاہ عبدالرحمٰن بہ چشمِ پُرنم اپنے پیرومرشد کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اس وقت ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور لب ساکت تھے۔

حضرت حاجی نوشہ نے فرمایا۔”کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟“

شاہ عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔”بھلا یہ میری مجال کہ آپ فرمائیں اور میں غافل بیٹھا رہوں۔“

آپ نے فرمایا۔”پھر تم نے مجھ سے کچھ مانگا کیوں نہیں؟“

شاہ عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔”پیرومرشد! مجھے تو بس آپ کی ذات کا عشق درکار ہے۔“

آپ نے فرمایا۔”میں تجھے خوش خبری سناتا ہوں کہ عشق کا ظہور تیرے سلسلے میں قیامت تک قائم رہے گا اور یہ عشق ہی تیرے لیے موجبِ عزت و احترام رہے گا۔“

پیرومرشد وصال فرما گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ سچیار سلسلے میں دین اور دولت یکجا پائی جاتی ہیں مگر ان میں جذب و مستی نہیں ملتی جبکہ شاہ عبدالرحمٰن کے سلسلے میں عشق و مستی کی زبردست فراوانی ہے۔

☆☆☆

شاہ عبدالرحمٰن کو سماع سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ آپ مجلس میں سوز و گداز، رقتِ قلب اور وجد و حال عام تھے۔ اس کا شہرہ بھی دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ پرگنہ بچہ چٹھہ کے مفتی کے برخوردار مولانا حافظ کو آپ کی یہ باتیں بہت گراں گزر رہی تھیں۔ جب یہ باتیں ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو اس نے نواب صاحب ناظم لاہور اور قاضی القضاۃ عبدالرحمٰن مفتی اعظم لاہور کو الگ الگ شکایتیں لکھ بھیجیں۔ اس نے ان دونوں کو لکھ دیا کہ آپ دونوں پر دین کی بقا اور حفاظت کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ شاہ عبدالرحمٰن بھٹری والے نے بدعت اپنا رکھی ہے۔ اس کی محفل رقص و سرود سے گرم رہتی ہے۔ قوال گاتے ہیں اور حاضرینِ محفل رقص کرتے ہیں۔ انہیں اس بدعت کے ارتکاب سے روکا جائے۔

نواب لاہور نے شاہ عبدالرحمٰن کو فوراً ہی طلب کیا۔”آپ فوراً لاہور تشریف لے آئیں تاکہ شرعی احتساب کیا جا سکے۔“

شاہ عبدالرحمٰن نے شیخ صالح محمد چنیاں والے، شاہ غریب گاج گولہ والے اور میاں علی قوال کو اپنے ساتھ لیا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ لاہور میں داخل ہوتے ہی آپ نے حضرت مخدوم شیخ علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں آپ نے شکایتاً عرض کی۔”حضرت! یہ آپ کے شہر کے دین دار حاکم فقیروں کو احتسابِ شرعی کے لیے تکلیف دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں، میں آپ ہی سے استمداد کا طالب ہوں۔“

جب آپ وہاں سے فارغ ہو کر اٹھے اور روضے سے باہر تشریف لائے تو وہاں مرزا احمد بیگ نامی ایک عہدے دار کو اپنے استقبال کے لیے کھڑا دیکھا۔ مرزا احمد بیگ شاہ عبدالرحمٰن کا مرید اور نواب صاحب حاکم لاہور کا انتہائی مقرب تھا۔ اس نے آپ سے عرض کیا۔”آپ قیام کہیں اور نہیں فرمائیں گے، میرا غریب خانہ حاضر ہے۔“

آپ نے فرمایا۔”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ تم سرکاری ملازم ہو اور میں یہاں احتسابِ شرعی کے لیے طلب کیا گیا ہوں۔ اس حالت میں اگر میں تمہارے یہاں مقیم ہوتا ہوں تو کہیں اس کا وبال تم پر نہ نازل ہو۔“

مرزا احمد بیگ نے جواب دیا۔”حضرت! میں ان باتوں سے بالکل نہیں ڈرتا۔ میں جانتا ہوں کہ کل آپ کو شاہی مسجد لاہور میں علمائے کرام کے روبرو جواب دہ ہونا ہے مگر میں ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔“

آپ مرزا احمد بیگ کے گھر چلے گئے۔ دوسرے دن شاہی مسجد میں علمائے کرام کا اجتماع ہوا۔ اس میں آپ بھی اپنے تینوں ساتھیوں کو لے کر شریک ہوئے۔ ہر کوئی آپ کو نہایت اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ کارروائی کا آغاز ہوا اور آپ سے سوال

کیا گیا۔ ”جب فقہائے حنفیہ نے سماع کی حرمت پر فتویٰ دے دیا ہے تو آپ سماع کیوں سنتے ہیں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”جناب! میں تو یہ جانتا ہوں کہ عید کے دنوں میں دو لڑکیوں نے حجرۂ رسولؐ میں دف بجا بجا کر گانا سنایا تھا اگر یہ چیز حرام تھی تو یہ واقعہ کیوں پیش آیا؟“
اس کے بعد انہوں نے امام غزالی کی کتاب ”احیاء العلوم“ کے حوالے سے جوازِ سماع میں مثالیں پیش کیں گو کہ شاہ عبدالرحمن ان پڑھ تھے مگر جس شان اور وثوق سے آپ بول رہے تھے، اس نے علمائے کرام کو دم بخود اور خاموش کر دیا۔
حاکم لاہور نواب صاحب نے فرمایا۔ ”ان سے پیش پانا ناممکن ہے کیونکہ آپ کا علم لدنی ہے۔“
علمائے کرام بھی ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ سبھی لاجواب ہو چکے تھے۔ شاہ عبدالرحمن نے ان سب کو دم بخود دیکھا تو میاں علی قوال کو حکم دیا۔ ”تم کیوں خاموش ہو، کچھ شروع کرو۔“
میاں علی قوال نے ایک بار پھر پوچھا۔ ”تو حضرت! میں شروع کروں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، تم شروع کرو۔ اب انتظار کس بات کا؟“
میاں علی قوال نے راگ الاپ کر حضرت حاجی نوشہ گنج بخش کی تعریف میں ایک کافی شروع کی۔ شاہ عبدالرحمن نے ایک نعرہ لگایا اور حاضرینِ جلسہ کو وجد آ گیا۔ ہر طرف سے ہوحق کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اس وقت وہاں کئی علماء موجود تھے۔ قاضی القضاۃ علماء سمیت ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔
یہ کیفیت تادیر طاری رہی۔ جب محفلِ سماع کا اختتام ہوا تو جملہ علمائے کرام اور قاضی القضاۃ نے خواہش ظاہر کی کہ انہیں بھی ارادت مندوں میں شامل کر لیا جائے۔ درخواست منظور ہوئی اور انہیں مریدوں میں شامل کر لیا گیا۔
شاہ عبدالرحمن نے ان سب کے اصرار اور خواہش پر کچھ عرصے کے لیے لاہور ہی میں سکونت اختیار کی۔ اندرونی بھاٹی گیٹ بازار حکیماں کے ایک کمرے میں معتکف ہو گئے۔ آپ کی وہ چلہ گاہ اب تک موجود ہے اور لوگوں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ رہ کر آپ بھڑی واپس چلے گئے۔

☆☆☆

آپ کا چہرہ نہایت بارعب تھا۔ کسی شخص میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آپ سے نظریں ملا کر ہم کلام ہو سکتا۔ آپ کی نظر میں کچھ ایسا اثر تھا کہ جس پر ڈال دیتے، اس کی بھوک پیاس اڑ جاتی۔ آپ کے اس قسم کے مریدوں سے ایک بار کسی نے سوال کیا۔ ”کیا تم نے کھانا پینا قصداً چھوڑ دیا ہے؟“
تقریباً سبھی نے ایک ہی جواب دیا۔ ”ہمیں کھانے کی رغبت ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہم تکلف ہی سے ایک آدھ لقمہ منہ میں ڈال لیں تو وہ حلق سے نیچے نہیں جاتا۔“
پوچھا گیا۔ ”کھانا نہ کھانے سے کمزوری تو آ جاتی ہو گی؟“
جواب ملا۔ ”نہیں کوئی کمزوری بھی نہیں آتی اور نہ ہی کسی قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔“
آپ نے بی بی زہرہ خاتون المعروف بہ بی بی ظہری سے شادی کی تھی۔ آپ اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ تین بیٹیاں البتہ تھیں۔ ایک کا نام بی بی جواہر تھا۔ انہوں نے نہ تو شادی کی اور نہ دنیاداری میں پڑیں، تارک الدنیا بن گئی تھیں۔
دوسری بیٹی بی بی فتح خاتون تھیں۔ ان کی شادی شیخ عبدالکریم معروف بہ میاں شاکر علی سے ہوئی۔ یہ شاہ عبدالرحمن کے بھائی شیخ الہداد کے بیٹے تھے۔ تیسری بیٹی بی بی حسین خاتون تھیں۔ ان کی شادی شیخ عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔
آپ نے بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد 1703ء کی بیس مئی (4 محرم 1115ھ) میں بعمر ایک سو بیس سال آپ نے وفات پائی۔ بھڑی ہی میں آپ کا مزار بنا اور آپ ہی کی ذاتِ بابرکات کے طفیل بھڑی نے ”بھڑی شاہ رحمن“ کا مرتبہ حاصل کیا۔
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

ماخذ

احمد شاہ ابدالی — ڈاکٹر گنڈا سنگھ
تاریخ الافغان — سید جمال الدین افغانی
تاریخ سلطانی — مرزا محمد علی
مآثر الامرا — صمصام الدولہ شاہنواز خان
تاج التواریخ — امیر عبدالرحمن
تاریخ پنجاب — کنہیا لال

عارفِ حق

ضیا تسنیم بلگرامی

حق پر اڑنے اور لڑنے کے لیے انسان کو جن مصمم ارادوں اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں... اور جنہیں یہ دولت مل جائے وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں... آپ کا تعلق بھی انہی محبوب انسانوں میں سے تھا جنہیں عبادت و ریاضت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے۔



تھا۔ چنگیز خاں مر چکا تھا مگر اس کے بیٹے تولی خاں کا بیٹا ہلاکو خاں قتل وخون ریزی میں اس کی نیابت کر رہا تھا۔ وہ تیان شان سے بلخ کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ راستے میں ہلاکو خاں کے خونخوار دستے آگ وخون کا کھیل کھیلتے سروں کے مینار کھڑے کرتے ہوئے فتح مندی کے نشے سے بدمست ہو رہے تھے۔ بلخ کے صلح پسندوں نے ترک سکونت کیا تا مور فاروقی خاندان نے بھی سنت نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان کا رخ کیا۔ برصغیر میں یہ عہد خلجی تھا۔ علاؤ الدین خلجی کا زمانہ، بادشاہ کو ان مہاجروں کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند دن مہمان رکھ کر اودھ میں ردولی کی جاگیر عطا کر دی۔

یہ خاندان ردولی میں بس گیا۔ فکر معاش سے آزادی اور منگولوں کی دستبرد سے دوری نے انہیں علمی میدانوں میں گامزن کر دیا۔ زہد وتقویٰ میں بھی ان کا کوئی شریک نہ تھا۔ نالۂ نیم شبی اور گریۂ سحر گاہی کی تپش نے انہیں کندن کر دیا تھا۔ اس خاندان کا ایک سات سالہ لڑکا احمد اس وقت اپنی ماں کی توجہ کا خاص مرکز بن گیا جب انہوں نے اس کو نصف شب کے بعد اپنے پیچھے تہجد کی نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ احمد اپنے ماحول سے بے نیاز، دنیا سے غافل انتہائی انہماک سے تہجد کی نماز اس طرح ادا کرتا کہ اس طرح کوئی بڑا بھی نہ پڑھتا ہوگا۔ ماں اپنے بیٹے کو کئی ہفتے اس حال میں خاموشی سے دیکھتی رہی۔ احمد پوری رات مصروف عبادت رہتا اور صبح فجر کی نماز پڑھ کر تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو جاتا۔ عبادت گزار ماں کا دل اپنے بیٹے کی عبادت گزاری سے بہت خوش تھا مگر اس خوشی میں یہ تشویش بھی موجود تھی کہ اس نوعمری میں اس کو اتنی شدید ریاضت نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے کئی بار یہ ارادہ کیا کہ اپنے بیٹے احمد کو سمجھائیں اور شب بیداری سے باز رکھنے کی کوشش کریں لیکن ان کی ہمت نہیں پڑی۔ اس کم ہمتی میں خدا کا خوف بھی شامل تھا اور اپنے بیٹے کی نظر میں شرمندہ ہو جانے کا تکلیف دہ احساس بھی۔

ایک دن بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ ماں کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا احمد آج کی رات آرام کرے گا لیکن بیٹے کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے عشا کی نماز بھی پڑھی اور پھر تہجد کے لیے بھی کھڑا ہو گیا۔ ماں کو خود بھی تہجد پڑھنا تھی اس نے چند رکعتوں کے بعد اپنے بیٹے کے جسم کو ٹٹول کر بخار کی حدت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ پورا جسم بخار کی گرمی سے تپ رہا تھا۔ وہ بیٹے کے داہنی طرف بیٹھ کر سلام پھیرنے کا انتظار کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد احمد نے جیسے ہی سلام پھیرا۔ ماں نے کرب سے کہا۔ ”بیٹے احمد! تو تو بخار میں تپ رہا ہے۔“

احمد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ہاں ماں، آج شام ہی سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹے! میں ڈرتی ہوں، کہیں تجھے چکر نہ آ جائے۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”نہیں ماں، اب اتنا تیز بخار بھی نہیں کہ مجھے چکر آ جائے۔“

ماں نے اصرار کیا۔ ”بیٹے احمد! اگر تو میری بات مانے تو میں تجھے یہی مشورہ دوں گی کہ تو آج کی رات آرام کر لے۔“

لیکن احمد نے ناگواری سے پوچھا۔ ”ماں! اگر میں آرام کر لوں گا تو اس سے مجھ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ صبح ہوتے ہوئے تیری طبیعت سنبھل جائے گی اور بخار اتر جائے گا۔“

احمد نے کہا۔ ”ماں! اس معاملے میں، میں آپ سے اتفاق نہیں کروں گا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ مجھ کو شب بیداری میں کیا مزہ ملتا ہے۔ ماں! اس میں ایک نشہ ہے، سوز ہے، لذت ہے نا قابل بیان لذت۔ اگر میں اس لذت سے محروم کر دیا جاؤں تو بیمار پڑ جاؤں گا۔ یہی وہ لذت ہے جو مجھے ہر شب بیدار رکھتی ہے۔ گر مجھ سے یہ لذت چھین لی جائے تو میں کچھ بھی نہیں رہوں گا۔ میں خالی اور محروم رہ جاؤں گا ماں۔“

ماں نے خفت زدہ لہجے میں کہا۔ ”بیٹے احمد! میں اس لذت اور سوز سے واقف ہوں جس کا تو ذکر کر رہا ہے لیکن میرے لال ابھی تو سات سال کا ہے۔ ابھی تو تجھ پر نماز بھی فرض نہیں نہ کہ تہجد کی نماز۔ اتنی کم سنی میں اتنی شدید محنت، بیٹا میرا دل کانپتا رہتا ہے، میں اندر ہی اندر لرزتی رہتی ہوں خدا کے لیے اپنے آپ پر اور مجھ پر رحم کر۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ماں میری بھی یہی دعا ہے کہ خدا آپ پر رحم فرمائے اور مجھ پر بھی۔ رہی یہ بات کہ ابھی میں سات سال کا ہوں اور ابھی مجھ پر نماز کی ادائیگی فرض نہیں ہے تو میری فکر مجھے کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ میں اس پر یقین رکھتا ہوں ماں کہ انسان جب عدم سے وجود میں آتا ہے اور نیست سے ہست میں قدم رکھتا ہے تو اس پر اپنے رب کی بندگی فرض ہو جاتی ہے۔“

ماں اپنے سات سالہ بچے کی زبان سے حکمت ومعرفت کی باتیں سن کر دنگ رہ گئی۔ انہوں نے بے ساختہ کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ بچے کو اپنے رب سے کیا ہوا وعدہ اچھی طرح یاد ہے، الست بربکم۔“

یہ کہتے کہتے وہ سجدے میں گر گئیں اور بڑی دیر تک رو رو کر اپنی نادانی اور سہو کی اپنے رب سے معافی مانگتی رہیں۔ وہ

گڑگڑا کر اپنے رب سے کہہ رہی تھیں۔"خدایا! میں نادان ہوں، مجھ کو اپنے بیٹے کے مرتبے کا علم نہیں تھا۔ یہ میری کتنی بڑی چوک تھی کہ میں اس کو تیرے ذکر سے محروم کر دینا چاہتی تھی۔ میں اسے تیری بندگی سے روکنے کی غلطی کر رہی تھی۔ مجھے معاف کر دے اور میرے بیٹے کے دل سے اس کدورت کو دور کر دے جو اس وقت کی باتوں سے پیدا ہو گئی ہوگی۔"

بیٹا ماں کی گریہ وزاری سن رہا تھا۔ جب ماں نے سجدے سے اپنا سر اٹھایا تو اس نے عاجزی سے عرض کیا۔"ماں! آپ اتنی غمزدہ کیوں ہیں، میں اور میرا خدا دونوں ہی آپ کے اس جذبے سے واقف ہیں جو ممتا کا جذبہ کہلاتا ہے۔ آپ نے جو کچھ فرمایا اپنی ممتا کے زیر اثر فرمایا۔ اگر میرے اور آپ کے درمیان رب کی ذات نہ ہوتی تو میرے لیے آپ کا حکم ماننا ہی عبادت قرار پاتا۔"

ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور فرط جذبات سے رونے لگیں، احمد کا دل بھی بھر آیا۔ وہ بھی رونے لگا۔ روتے روتے دونوں ہی ہلکان ہو گئے ور دل کو دبانے والے بوجھ نے آنسوؤں کی شکل میں بہہ کر انہیں ہلکا کر دیا۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد پھر ایسی ہی صورت حال پیش آئی۔ ماں ایک بار پھر بیٹے کی صحت کی طرف سے فکرمند ہو گئیں۔ احمد کی عبادت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ رات کو تہجد، دن کو ذکر الٰہی۔ آرام کا کوئی وقت ہی نہ تھا۔ ماں کو ہر وقت یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس محنت شاقہ کا ان کے بیٹے احمد کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ ان دونوں میں اس موضوع پر کئی بار گفتگو بھی ہوئی، دونوں ہی دلیلوں اور نظیروں سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور تقریباً ہر بار بیٹے کی پُراثر باتوں نے ماں کو لاجواب اور جذباتی کر دیا۔ انہیں اپنے بیٹے پر فخر تھا لیکن وہ کبھی بھی بیٹے کی دلیلوں سے اپنی وہ فکر دور نہیں کر سکیں جو انہیں اپنے بیٹے کی صحت کی طرف سے مستقلاً لاحق ہو چکی تھی۔

ماں نے اپنے شوہر کو بھی اس معاملے میں شریک کر لینا چاہا اور زور دے کر مجبور کیا کہ وہ احمد پر دباؤ ڈال کر شب بیداری سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔

لیکن سلجھے ہوئے باپ نے ہر بار یہی کہا کہ"بیوی! میں بندے اور اس کے رب کے تعلقات میں کیونکر دخل دے سکتا ہوں۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کو کرنے دو۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور ہے اور میرا تو خیال ہے کہ احمد مادرزاد ولی ہے اور وہ جو کچھ کر رہا ہے کوئی غیرمعمولی طاقت اس سے یہ کراتی ہے۔"

بیوی نے کہا۔"آپ میرے دل میں جھانک کر دیکھ لیں، میں اپنے بیٹے کو شب و روز بیدار نہیں دیکھ سکتی۔ خدانخواستہ اس کو کچھ ہو گیا تو؟"

شوہر نے جواب دیا۔"بیوی! اس کو کچھ نہیں ہوگا، خدا اس کا محافظ ہے۔ یاد رکھو، خدا کسی بھی شخص سے اس کی استطاعت اور صلاحیت سے زیادہ کام نہیں لیتا۔ احمد جو کچھ کر رہا ہے خدا نے اس میں اتنی صلاحیت اور استطاعت رکھ دی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ راتوں کو اپنے گرم گرم بستر میں دبکا آرام کر رہا ہوتا۔"

لیکن ماں کو قرار نہیں آیا اور وہ سیدھی بیٹے کے پاس پہنچ گئیں بولیں۔"بیٹے احمد! افسوس کہ میں ایک بار پھر وہی فرسودہ موضوع لے کر آ گئی ہوں۔"

بیٹے نے لاتعلق نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے یا اللہ یا اللہ کا ورد شروع کر دیا۔ ماں کچھ دیر خاموش کھڑی بیٹے کی کیفیت ملاحظہ کرتی رہی۔ آخر کچھ دیر بعد کہا۔"بیٹے احمد! میں نے کیا کہا؟ میں کچھ کہہ رہی ہوں، کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

بیٹے نے نفی میں سر ہلا دیا۔"مجھے کچھ پتا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

ماں نے جواب دیا۔"میرے لال! میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تو اس کم سنی میں اتنی زیادہ عبادت نہ کر، ورنہ تیری صحت جواب دے جائے گی عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہے۔"

بیٹے نے کہا۔"خوب خوب! کیا فرمایا آپ نے عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہوئی ہے۔"

"ہاں میں نے یہی بات کہی ہے کہ عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہے۔"

بیٹے نے مسکرا کر عرض کیا۔"ماں زندگی کا کوئی بھروسا نہیں پھر آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہوئی ہے، اگر آپ کسی طرح مجھ کو لمبی عمر کا یقین دلا دیں اور یہ ثابت کر دیں کہ میں طویل عرصے تک زندہ رہوں گا تو میں شب بیداری ختم کیے دیتا ہوں۔"

ماں نے جواب دیا۔ ''یہ یقین تو کوئی ولی بھی نہیں دلا سکتا۔ پھر میں کس طرح دلاؤں۔''

''تب پھر آپ خاموش رہیے ماں! مجھ کو عبادت سے نہ روکیے اگر میں نے ایسا کیا تو میں یادِ حق سے بہت دور ہو جاؤں گا اور اگر ایسا ہوا مار تو آپ یقین کیجیے کہ میں بھی شاید یہ ہمت بھی نہ کرسکوں کہ اپنی شب بیداری سے باز آجاؤں۔ کیا میں نے شب بیداری کی لذتوں سے آپ کو آگاہ نہیں کیا؟ کیا آپ میری وہ بات چیت بھلا چکی ہیں؟ شاید نہیں، اگر میں آپ کی سیدھی سچی بات مان بھی لوں تو اس سے آپ کے بقول صحت کے علاوہ اور کیا فائدہ پہنچے گا۔''

بیٹے نے لاجواب کر دیا تو ماں نے ایسا سکوت اختیار کیا کہ پھر زندگی بھر اس موضوع پر بات ہی نہیں کی۔

دہلی میں احمد کے بڑے بھائی شیخ تقی الدین مستقل رہ رہے تھے، ان کی علمی قابلیت کا بڑا شہرہ تھا گھر میں شیخ تقی الدین کا بڑا ذکر رہتا۔ ماں اکثر کہتی رہتیں کہ اگر میرا بیٹا تقی الدین کے گھر میں ہوتا تو احمد کو شاندار تعلیم دلواتی۔ شیخ احمد ان کی باتیں بغور سنتے اور اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے سراپا شوق بن جاتے لیکن یہ شوق پرواز سے محروم ہی رہتا۔ چھوٹے سے دل و دماغ میں شوق اور ولولے کی لہریں اٹھتی بیٹھتی رہتی تھیں لیکن ان لہروں نے طوفان کی شکل ایک عرصے تک نہیں اختیار کی۔ ان کے دل و دماغ مختلف طور پر ایسی تجاویز اور تدابیر پر غور کرتے رہتے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ بھائی تقی الدین سے ملاقات کس طرح کی جائے۔

شب و روز کی عبادت میں سوز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ شیخ احمد سوچتے رہتے کہ آخر میں اپنی عبادت اور ریاضت میں کس کی راہنمائی اختیار کروں۔ جب ماں کو اس الجھن کا پتا چلا تو وہ شیخ احمد کے پاس جا بیٹھیں اور پوچھا۔ ''بیٹے! کیا بات ہے آج کل تو پریشان کیوں رہتا ہے؟ کسی سے کوئی جھگڑا یا کوئی رنجش؟''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''نہیں ماں ایسی کوئی بات نہیں؟''

ماں نے پوچھا۔ ''پھر تو فکرمند اور اداس اداس کیوں رہتا ہے؟''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''ماں! بات یہ ہے کہ میں عبادت ریاضت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہوں کہ طمانیت قلب حاصل کروں لیکن روح کی تشنگی دور ہی نہیں ہوتی، پیاس بجھتی ہی نہیں۔ میں ہمیشہ اپنی ذات میں کوئی کمی محسوس کرتا رہتا ہوں، آخر ایسا کیوں ہے؟''

ماں نے کہا۔ ''احمد! ابھی تیری عمر ہی کتنی ہے، کل بارہ سال۔ اس عمر میں تو نے جو کچھ بھی حاصل کر لیا ہے، بہت ہے رہا تشنگی کا مسئلہ تو یہ ہمیشہ باقی رہے گی۔''

لیکن بیٹے کو ماں کی باتیں مطمئن نہ کرسکیں، اضطراب اور اضطرار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ انہوں نے ماں سے پوچھا۔

''ماں! دہلی میں بھائی تقی الدین کیا کر رہے ہیں؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹے! تقی الدین ایک عالم فاضل انسان ہیں معلوم نہیں کہاں کہاں سے طالبانِ علم اس کے پاس پہنچ کر تحصیلِ علم کرتے ہیں۔ اس کی علمیت مسلمہ ہے، شک و شبے سے بالاتر۔''

شیخ احمد نے کہا۔ ''پھر تو ماں میں دہلی جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ بھائی تقی الدین میری تشنگی دور کر دیں گے۔''

ماں نے تشویش ظاہر کی۔ ''لیکن بیٹے ایک بارہ سالہ لڑکا اتنا لمبا سفر کیونکر کرے گا۔ میرا تو یہ سوچ کر ہی دل بیٹھا جاتا ہے کہ تو تنہا یہ سفر کس طرح کرے گا؟''

شیخ احمد نے عرض کیا۔ ''ماں! میں سفر کے لیے آپ کی اجازت کا طالب ہوں۔ تلاشِ فضل اور طلبِ علم میں اس فاصلے کی اہمیت ہی کیا ہے، مجھ سے پہلے تو ایک ملک سے دوسرے ملک تک کے سفر کیے گئے ہیں۔''

ماں خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی آخر کچھ دیر بعد ہتھیار ڈال دیے اور دہلی جانے کی اجازت دے دی۔

شیخ احمد ایک قافلے میں شامل ہو گئے۔ یہ قافلہ مغربی حصوں میں جا رہا تھا۔ شب و روز کی صعوبتیں جھیلتے، مصیبتیں اٹھاتے آپ دہلی میں داخل ہو گئے۔ تلاش کرتے ہوئے اپنے بھائی شیخ تقی الدین کے پاس پہنچ گئے۔ شیخ احمد اس بات سے بہت متاثر ہوئے کہ ان کے بھائی کا دہلی میں بڑا شہرہ تھا اور ہر شخص ان کا نام عزت و احترام سے لیتا تھا۔ بڑے بھائی نے ایک بارہ سالہ اجنبی لڑکے کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو یہ گمان گزرا کہ یہ بھی کوئی طالب علم ہے جو ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے آیا ہے۔ شیخ احمد نے بھی اپنے بھائی کی یہ کیفیت محسوس کر لی کہ وہ انہیں پہچان نہیں سکے، انہوں نے سکوت اور تامل اختیار کیا۔

شیخ تقی الدین نے اپنے چھوٹے بھائی کو بغور دیکھ کر سوال کیا۔ ''صاحبزادے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں؟''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''حضرت! میرے پاس آپ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں آپ کی خدمت میں کیوں آیا ہوں؟''

تقی الدین نے اس عجیب وغریب لڑکے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ بولے۔ ''آدمی تو اچھے لگتے ہو۔ اچھا اگر تم یہ نہیں بتانا چاہتے کہ کہاں سے آئے ہو تو کوئی حرج نہیں، میرے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ تم مجھ سے تعلیم حاصل کرنے آئے ہو۔''

شیخ احمد نے عرض کیا۔ ''جناب! میں پانچ چھ سال سے ایک اندرونی کرب میں مبتلا ہوں، اگر آپ اس کو دور فرمادیں تو میں آپ کا زندگی بھر ممنون رہوں گا۔''

بڑے بھائی نے پوچھا۔ ''تمہارا قیام کہاں ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''حضرت! یہاں میں ایک لاوارث ہوں، مجھ کو تو رہنے کے لیے ٹھکانا بھی درکار ہے، میں اس شہر میں بالکل اجنبی ہوں۔''

تقی الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے تم کو اپنے رہنے کا انتظام خود ہی کرنا چاہیے۔ میرے پاس اتنی گنجائش کہاں کہ طلبہ کی اقامت کا انتظام بھی کروں۔''

شیخ احمد نے معصومیت سے کہا۔ ''نہ صرف یہ کہ آپ مجھے پڑھائیں گے اور اقامت کا انتظام بھی کریں گے بلکہ کھانے پینے کی ذمے داری بھی قبول کرنا ہوگی۔''

تقی الدین نے ایسا عجیب طالب علم پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ذرا تختی سے کہا۔ ''میاں صاحبزادے یہ تو بتاؤ تمہارے ماں باپ کیسے ہیں جو انہوں نے تم کو تنہا دہلی چلا آنے دیا۔ آخر تم کسی خوشحال گھرانے ہی سے تعلق رکھتے ہوگے ورنہ غریب انسان تو یہاں تک آنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتا۔''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''جنابِ والا! آپ مجھ سے بحث تو کیجیے نہیں بس یہ بتا دیجیے کہ آپ مجھ کو میری عائد کردہ شرطوں پر پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟''

تقی الدین نے تھکے ہارے لہجے میں کہا۔ ''میں انکار نہیں کرسکتا۔ اگر تو نادار ہے تو میں تیرے قیام وطعام کی ذمے داری بھی اپنے ہی سر لے لوں گا۔ تو میرے پاس ہی رہ جا۔''

شیخ احمد نے خوش ہوکر عرض کیا۔ ''بھائی صاحب! مجھ کو آپ سے یہی امید تھی۔ ماں نے آپ کو بہت بہت پوچھا ہے اور یہ معلوم کیا ہے کہ آپ ردولی کب تشریف لا رہے ہیں؟ وہ آپ کو یاد کرکے اداس ہوجاتی ہیں۔''

تقی الدین نے شیخ احمد کے چہرے پر اپنے باپ کا عکس دیکھ لیا۔ بے اختیار اٹھے اور بھائی کو سینے سے لگالیا۔ بولے۔

''احمد! تو نے کمال کردیا! کیا تجسس پیدا کیا۔ واہ واہ خوب!''

شیخ احمد نے حرفِ مدعا گوش گزار کیا۔ ''بھائی صاحب! میں ایک عرصے سے مضطرب اور پریشان ہوں کہ میں اپنی روح کی پیاس کس طرح بجھاؤں۔ اپنی تشنگی کس طرح دور کروں؟''

بھائی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت تیری رہائش کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کے بعد کچھ اور کروں گا۔'' شیخ احمد وہیں بیٹھ گئے اور تقی الدین ان کے قیام اور طعام کا انتظام کرنے چلے گئے۔ رات ہوگئی تو شیخ احمد کو تشویش ہوئی کہ یہ بھائی کہاں چلے گئے؟ آخر وہ نصف شب کو واپس آئے تو بہت خوش خوش، بولے۔ ''احمد! افسوس کہ میں اپنے مدرسے میں تجھ کو نہیں رکھ سکتا۔ ہاں ایک دوسری جگہ کا انتظام کرلیا ہے۔''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''بھائی صاحب! آپ بھی کن چکروں میں پڑ گئے۔ میں کہیں کسی گوشے میں پڑا رہتا۔''

بھائی نے کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی۔ تو میرا بھائی ہے اور بھائی عزت واحترام سے رہے گا۔ تو خرچ اور مصارف کی تو بات ہی نہ کر اس کو مجھ پر چھوڑ دے۔''

احمد نے پوچھا۔ ''بھائی صاحب! پھر مجھے کون سا وقت مرحمت فرمائیں گے؟''

بھائی نے جواب دیا۔ ''ہر وقت، کسی بھی وقت تجھ کو تو میں اپنے بھائی کی حیثیت سے تعلیم دوں گا۔''

احمد کو بڑے بھائی کے پاس قیام وطعام کی سہولتیں مل گئیں اور جب انہیں پہلے دن بڑے بھائی نے پڑھانا شروع کیا تو شیخ احمد نے ان سے سوالات کرنا شروع کردیے۔

تقی الدین نے کہا۔ ''احمد! تو مجھ سے پڑھنے آیا ہے یا سوالات کرنے؟''

احمد نے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! علم وہی نہیں ہے جو کتابوں میں موجود ہوتا ہے بلکہ میں جو علم حاصل کرنا چاہتا ہوں شاید وہ اس درس گاہ سے نہیں ملے گا۔“

بڑے بھائی نے کہا۔ ”میاں صاحبزادے! مجھ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ میری تدریس میں کوئی مخل ہو، مجھ کو اپنی مرضی کا نصاب پڑھانے سے روکا جائے۔“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”اور بھائی صاحب! مجھ کو بھی یہ قطعاً ناپسند ہے کہ کوئی معلم میرے اندر کی بے چینی نہ دور کر سکے، روح کی تشنگی نہ بجھا سکے۔ میں یہاں علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے نہیں آیا۔ میں اپنی روح کو تسکین اور آسودگی دینا چاہتا ہوں۔“

تقی الدین نے افسوس سے کہا۔ ”احمد! افسوس کہ میں ظاہری علوم تو پڑھا سکتا ہوں علوم باطنی میں، میں تقریباً کورا ہوں۔“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”پھر مجھے بھی افسوس ہے کہ میں یہاں علومِ ظاہری حاصل کرنے نہیں آیا۔ میری بیماری علومِ باطنی سے دور ہوگی۔ میرے لیے آپ کا مدرسہ کارآمد نہیں۔“

تقی الدین نے پوچھا۔ ”پھر کیا ارادے ہیں؟“

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ”میں کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں ہوں اور میں اس کی جستجو میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا۔ بھائی صاحب بس ایک رات۔ اس سے زیادہ نہیں۔ میں آپ کے سرِ معیت نہیں بننا چاہتا۔“

بھائی کی محبت انہیں روکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کہا۔ ”احمد! تم یہیں میرے پاس ہی رہو۔ اگر تمہیں کسی مرشدِ کامل کی تلاش ہے تو میں خود بھی تمہارا ساتھ دوں گا اور اس کو تلاش کر کے دم لوں گا۔“

”بھائی صاحب!“ چھوٹے بھائی نے کہا۔ ”صاف گوئی کی معافی چاہتا ہوں جو آگ میرے سینے میں روشن ہے آپ اس سے محروم ہیں اور جب آپ کے دل میں مرشدِ کامل کے لیے تڑپ ہی نہیں تو اس کو تلاش کہاں اور کس طرح کریں گے؟“

بھائی نے آہستہ سے کہا۔ ”پھر بھی تو رات بھر اس سلسلے میں غور کر، میرا خیال ہے تجھ کو میرے پاس سے جدا نہیں ہونا چاہیے۔ کسی ٹھکانے کو مرکزی حیثیت دینا ہی پڑے گی کیونکہ بے گھر و بےدر انسان منزلِ مقصود نہیں پا سکتا۔“

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ”اپنی اپنی سوچ، اپنی اپنی فکر کی بات ہے کیونکہ مرشدِ کامل کی تلاش میں جب تک آدمی بے گھر اور بے در نہیں ہوگا اپنی منزل نہیں پا سکتا۔“

بڑے بھائی نے رعب سے کہا۔ ”میں کہتا ہوں سوچنے میں حرج ہی کیا ہے؟ بے سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم اٹھانا کسی طور مناسب نہیں۔“

شیخ احمد خاموش ہو گئے جس کا بڑے بھائی نے یہ مطلب لیا کہ شاید ان کی بات مان لی گئی ہے۔

شیخ احمد بستر پر گئے تو ان کے ذہن میں مرشد کامل کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتے رہے معلوم نہیں کب تک جاگتے رہے۔ اس کیفیت میں انہیں نیند آ گئی۔ سوتے میں انہیں کسی کی آواز سنائی دی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ”میاں صاحبزادے! آپ کی منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ پانی پت جائیے اور قطب ربانی سے بیعت ہو جائیے۔“

شیخ احمد نے سراپا شوق بن کر سوال کیا۔ ”ان قطب ربانی کا نام؟ میں پانی پت میں انہیں کہاں تلاش کروں گا؟“

جواب ملا۔ ”آپ پانی پت جائیں تو سہی۔ اللہ نے چاہا تو ان تک پہنچ کر ہی قدم رکیں گے۔“

اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل گئی اور دیر تک اس خواب پر غور کرتے رہے، کبھی فیصلہ کرتے کہ پانی پت فوراً ہی چلے جانا چاہیے اور کبھی تساہل سے سوچتے کہ کہیں یہ وسوسۂ شیطانی تو نہیں جو ہر جویائے حق کی راہ روکنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن صبح ہوتے ہوتے شیخ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں بہرحال پانی پت پہنچنا ہے۔

وہ علی الصباح اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ بڑے بھائی کو پتا نہ تھا کہ شیخ احمد کہاں چلے گئے۔

دوسری طرف قطب ربانی شیخ جلال الدین کبیر الاولیا کشفِ باطن سے اس مادرزاد ولی کی آمد سے باخبر ہو چکے تھے۔ انہیں شیخ احمد کا امتحان لینا مقصود تھا۔ اس لیے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ”لوگو! ہمارے پاس ایک مہمانِ خاص آ رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کا شاندار استقبال کیا جائے۔“

مریدوں نے جواب دیا۔ ”حضرت! ہم سب ہر طرح حاضر ہیں۔ آپ جو حکم دیں گے، بجا لائیں گے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”سامنے کھلی جگہ میں چولہے روشن کیے جائیں اور ان پر دیگیں چڑھا دی جائیں لطیف و لذیذ کھانے پکوائے جائیں۔“

ایک مرید نے بصد ادب عرض کیا۔ ''حضرت! یہ سب ابھی ہوا جاتا ہے مزید اور کچھ؟''

آپ نے جواب دیا۔ 'اور دوسرے مریدوں سے کہہ دو کہ خانقاہ کے در پر حسین اور خوبصورت گھوڑے ساز و سامان سے لیس کر کے کھڑے کر دیے جائیں۔''

ایک مرید نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ ''حضرت! یہ انتظام بھی ہو جائے گا بس حضور کے ارشاد کے مطابق میں پندرہ بیس ہاتھی کھڑے کر دوں گا۔ اسی تعداد میں گھوڑے بھی کھڑے کر دیے جائیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''کھڑے کر دیے جائیں نہیں، جو کچھ ہونا ہے فوراً ہی ہونا ہے اس لیے ان پر فوراً عمل درآمد ہوگا۔''

مرید ادھر ادھر پھیل گئے۔ کسی نے چولہے جلائے۔ کسی نے دیگوں میں مال ڈالا اور کسی نے ہاتھی گھوڑے اپنے قبضے میں کیے اور انہیں خانقاہ کے دروازے پر سجا کر کھڑا کر دیا۔ جب قطب ربانی کو اس کا علم ہوا کہ ہاتھی اور گھوڑے در پر کھڑے کر دیے گئے ہیں تو آپ ان کے معائنے کو نکل کھڑے ہوئے اور خانقاہ کے در پر شاندار منظر دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور مریدوں سے فرمایا۔ ''لوگو! میرا ایک بارہ تیرہ سال کا مہمان آرہا ہے اس طرح میں اس کو مرعوب کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ چند باتوں کا تمہیں بھی خیال رکھنا ہوگا۔''

مریدوں نے بیک آواز سوال کیا۔ ''کن باتوں کا حضرت، ارشاد!''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں آنے والے مہمان کی تلخ نوائی اور صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ اس لیے اگر میرا مرید کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو تم لوگ اس کا کوئی خیال نہ کرو گے۔''

مریدوں نے عرض کیا۔ ''حضرت، یہ آج آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم آپ کے مہمان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کریں گے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

آپ اندر جاتے ہوئے بولے۔ ''اچھا میں اندر جارہا ہوں، میرا مہمان بس آیا ہی چاہتا ہے، تم لوگ اس کو سنبھالنا۔''

مرید خاموش ہو گئے اور آپ اندر تشریف لے گئے۔

کچھ ہی دیر بعد شیخ احمد خانقاہ کے در پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت ساری دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان میں سے لذیذ کھانوں کی نکلنے والی خوشبو سے گرد و پیش کی فضا مہک رہی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے سامنے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی قطاریں دیکھیں، یہ دونوں مویشی نہایت شان سے کھڑے گویا کسی کے منتظر تھے۔ شیخ احمد کو ذرا سی دیر کے لیے یہ شبہ گزرا کہ یہ مکان قطب ربانی کا ہی ہے یا کسی امیر کبیر شخص کا۔ وہ انہی وسوسوں میں مبتلا تھے کہ ایک مرید نے چند قدم چل کر کسی مرید سے پوچھا۔ ''بھائی! پیر و مرشد اندر تشریف رکھتے ہیں کیا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''تو کیسا مہمل سوال کر رہا ہے۔''

دوسرے مرید نے کہا۔ ''مہمل سوال؟ کیا کہا تم نے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''آج کل بھی اگر......''

آپ چند قدم آگے بڑھے اور دونوں سے سوال کیا۔ ''حضرات! میں ایک پردیسی انسان ہوں، یہاں کے ماحول اور لوگوں سے قطعاً ناواقف ہوں، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس امیر کا محل ہے؟''

ایک مرید نے ادھر ادھر دیکھ کر حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''میاں صاحبزادے، آپ کس محل کی بات کر رہے ہیں؟ کون سا محل؟ یہاں تو کوئی محل نہیں ہے۔''

شیخ احمد نے خانقاہ اور اس کے در پر موجود شان و شکوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس محل اور اس کے ساز و سامان کی بابت پوچھ رہا ہوں۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''صاحبزادے! یہ محل نہیں ایک خانقاہ ہے حضرت جلال الدین کبیر الاولیا کی خانقاہ۔''

آپ نے طنزاً فرمایا۔ ''تو یہ خانقاہ ہے۔ خوب، میں تو اس کو محل سمجھ بیٹھا تھا۔ کیا خانقاہیں ایسی ہوتی ہیں؟ درویش کی خانقاہ لیکن ٹھاٹ باٹ شاہانہ محل جیسے تعمیر کی کٹیا جس پر شاہی قصر کا گمان ہوتا ہے۔''

مرید نے کہا۔ ''صاحبزادے! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

آپ نے جوش میں فرمایا۔ ''میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ اندر میرا ضمیر اس محل کو کٹیا کہنے پر آمادہ ہی نہیں۔''

مرید نے انہیں ایک بار پھر سمجھایا۔ "صاحبزادے! یہ قطب ربانی کی خانقاہ ہے، آپ یہاں سے واپس جا کر پچھتایئے گا۔"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "میں سکونِ قلب کی تلاش میں ہوں، میں طمانیت کی جستجو میں ہوں اور جہاں یہ ساز و سامان موجود ہو، وہاں سکون اور طمانیت کا کیا کام؟"

مرید نے بے بسی سے عرض کیا۔ "آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جو جی میں آئے کریں۔"

شیخ احمد نے اسی وقت اس در کو چھوڑ دیا اور پانی پت سے نکل جانے کے ارادے سے سارا دن پیدل ہی سفر کرتے رہے یہاں تک...... کہ وہ شام تک ایک دوسری آبادی میں داخل ہو گئے۔ ایک درخت کے نیچے ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ رات سر پر کھڑی تھی۔ پریشان تھے کہ شب بسری کہاں ہو گی۔ انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔ "بھائی ذرا سننا تو۔"

راہ گیر کھڑا ہو گیا، بولا۔ "صاحبزادے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "پانی پت سے۔"

راہ گیر مسکرایا۔ "پانی پت سے، واللہ طبیعت تو ٹھیک ہے جناب کی؟"

آپ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں اس میں طبیعت کی خرابی یا صحت یابی کو کیا دخل؟ میں پانی پت سے چلا آرہا ہوں۔"

راہ گیر نے جواب دیا۔ "صاحبزادے! اس وقت آپ پانی پت ہی میں تشریف فرما ہیں پھر پانی پت سے آنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔"

شیخ احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن پھر اس شبے میں پڑ گئے کہ شاید وہ راستہ بھول کر پانی پت ہی میں چلتے پھرتے رہے ہیں راہ گیر نے جاتے جاتے کہا۔ "صاحبزادے اب آپ گھر جائیں کیونکہ یہ پردیس نہیں آپ کا اپنا وطن پانی پت ہے۔"

شیخ احمد خاموش رہے اور پوری رات اس درخت کے نیچے گزار دی۔

صبح طلوعِ آفتاب کے فوراً بعد آپ دوبارہ چل کھڑے ہوئے اور نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے دن بھر سفر کرتے رہے۔ شام سے پہلے ہی، وہ پانی پت سے دور جا چکے تھے۔ نئی آبادی، نئے نئے اجنبی سے مکانات، غیر مانوس کھیت غرضیکہ ماحول کی ہر شے نئی اور اجنبی تھی۔ یہ ایک محل کے سائے میں جا کھڑے ہوئے اور سوچنے لگے کہ اگر کوئی نظر آجائے تو اس سے شب بسری کے لیے جگہ مانگی جائے۔ راستے میں ایک گھڑسوار آتا دکھائی دیا، یہ اپنی جگہ سے اٹھے اور گھڑسوار کی راہ میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے گھوڑا روک دیا اور گھوڑے کی پشت ہی سے سوال کیا۔ "کیوں صاحبزادے کیا بات ہے؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "مجھے جانا تو بہت دور ہے لیکن سردست میں پانی پت سے بھاگ جانا چاہتا ہوں اور خدا کا شکر ہے میں اس میں کامیاب ہو گیا۔"

گھڑسوار ہنسا۔ "خوب یعنی آپ پانی پت سے تشریف لائے ہیں اور پانی پت ہی میں کھڑے یہ سوال کر رہے ہیں۔ خوب۔"

شیخ احمد نے گھبرا کر گھڑسوار کا جواب دہرایا۔ "یعنی اس وقت میں پانی پت میں ہوں؟ وہ پانی پت جس کو میں نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں؟ اس وقت بھی میں اسی پانی پت میں موجود ہوں؟ یہ معاملہ کیا ہے اور یہ مجھ سے کون مذاق کر رہا ہے؟"

گھڑسوار نے آپ کو حیرت و استعجاب سے دیکھا اور اپنی راہ لی۔

شیخ احمد کو ضد ہو گئی خود سے بولے۔ "احمد! کچھ بھی ہو، میں پرکار کی طرح ساری عمر یوں ہی کوشش جاری رکھوں گا اور دیکھوں گا کہ کس طرح اس پرکار سے نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔"

انہوں نے پوری رات محل کی دیوار کے سائے میں گزار دی اور علی الصبح ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک نہایت سرگرمی سے سفر کرتے رہے لیکن دھوپ کی تمازت نے انہیں آرام کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک خشک درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ تنے سے ٹیک لگا کر ماضی حال اور مستقبل کی سیر کرنے لگے۔ اتنے میں اچانک آواز سنائی دی۔ "اے بھائی تمہیں کہاں جانا ہے؟"

آواز درخت کے اوپر سے آرہی تھی چنانچہ انہوں نے اوپر درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک خوب صورت نوجوان اچھے لباس میں مخملی ٹوپی پہنے بیٹھا تھا۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ نوجوان اس جگہ تھوڑی دیر پہلے تو نہیں تھا۔ اب یہ کہاں سے آگیا۔ نوجوان انہیں حیرت زدہ اور متفکر دیکھ کر مسکرایا اور طنزیہ کہا۔ "لڑکے تو اتنا پریشان کیوں ہے۔ کیا ہوا؟"

شیخ احمد نے گھبرا کر سوال کیا۔ "ارے بھائی یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میں یہاں کچھ بھی نہیں کر رہا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

شیخ احمد نے کہا۔ ”بھائی! میں منزل کی تلاش میں یہاں تک آ گیا ہوں، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اب مجھے کدھر کو جانا ہے؟“

نوجوان ہنس دیا۔ مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ ”معلوم نہیں میں تمہیں کیا کہوں، خوش قسمت یا بدقسمت۔ تم وہ شخص ہو جو منزل پر پہنچ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے، تم نے تو اپنا راستہ جلال الدین کے در پر پہنچ کر ہی گم کر دیا۔“

شیخ احمد نے کہا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”بھائی! میں ہی نہیں ایک زمانہ بھی کہے گا۔“ پھر...... سامنے آتے ہوئے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں سے بات کرو، اللہ نے چاہا تو یہ بھی میری تائید کریں گے۔“

شیخ احمد دونوں کی طرف بڑھے۔ یہ دونوں نہایت ستھرے کپڑوں میں ملبوس انہی کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ شیخ احمد ان کی طرف بڑھے اور قریب پہنچ کر سوال کیا۔ ”صاحبان! مجھے کدھر جانا چاہیے۔ میرا راستہ کدھر ہے؟“

ان دونوں نے بیک آواز جواب دیا۔ ”راستہ کھونے کے بعد راستہ پوچھ رہے ہو؟ کیا جلال الدین قطب ربانی کا در تیری منزل نہیں تھا؟ تو نے تو اپنا سارا راستہ خود ہی کھو دیا۔“

شیخ احمد شرمسار و شرمندہ درخت کی طرف مڑے اور درخت پر بیٹھے ہوئے نوجوان کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن اب درخت پر کوئی بھی نہ تھا۔ ادھر سے مڑ کر دونوں اجنبیوں کی طرف بڑھے لیکن اب وہ بھی غائب ہو چکے تھے۔ یہ خجل و شرمندہ ہو کر درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

آخر اٹھے اور پانی پت کی طرف چل پڑے لیکن راستے میں ندامت اور شرمندگی نے انہیں نڈھال کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گئے اور بڑی دیر تک یوں ہی پڑے رہے لیکن ہوش میں آتے ہی وہ پانی پت کی طرف چل نکلے۔

ابھی آستانہ دور ہی تھا کہ وسوسوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں، انہیں کون ورغلا رہا تھا۔ دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ تجربے اور ثبوت کے بغیر میں انہیں کس طرح ولیِ کامل اور قطب ربانی مان لوں پھر کسی نے دل سے یہ مشورہ دیا کہ ”شیخ احمد! ذرا ان قطب ربانی کا امتحان تو لے لے۔“

اس آواز سے شیخ احمد نے سوال کیا۔ ”میں ان کا کیا امتحان لوں؟“

جواب ملا۔ ”جب تو ان کے سامنے پہنچے تو اپنے دل میں دو خواہشیں لیے ہو کہ حضرت قطب ربانی اپنے سر کی ٹوپی اپنے پیر کی قبر سے مس کر کے تیرے سر پر رکھ دیں اور اس کے بعد شیرینی عطا فرما دیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو واقعی قطب ربانی ٹھہریں گے ورنہ کچھ بھی نہیں۔“

چنانچہ شیخ احمد اپنے دل میں دونوں خواہشیں لیے ہوئے قطب ربانی کی خدمت میں پہنچ گئے۔ خادم سے پوچھا۔ ”کیوں بھائی، قطب ربانی تشریف رکھتے ہیں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

خادم نے جواب دیا۔ ”قطب ربانی اس وقت اپنے پیر کے مزار پر کھڑے فاتحہ پڑھ رہے ہیں، اگر ان سے ملاقات کا اتنا ہی شوق ہے تو اندر مزار کے پاس چلے جاؤ اسی وقت ملاقات ہو جائے گی۔“

شیخ احمد اسی وقت مزار کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت قطب ربانی فاتحہ پڑھ کر واپسی کا ارادہ کر رہے تھے، اپنے سامنے شیخ احمد کو کھڑے دیکھا تو مسکرا دیے۔ پوچھا۔ ”تو تم ابھی تک پانی پت میں ہی موجود ہو؟“

شیخ احمد کے دل پر چوٹ لگی بولے۔ ”حضرت میں خطاکار ہوں۔“

حضرت قطب ربانی نے فرمایا۔ ”تم پرکار کی طرح عمر بھر چکر لگانے کا عہد کر چکے تھے؟“

شیخ احمد تڑپ کر بولے۔ ”مجھ سے غلطی ہوئی میں شرمندہ ہوں۔ مجھ کو اور زیادہ شرمندہ نہ کیجیے۔“

جواب میں قطب ربانی نے کلاہ سر سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور پھر اس کو مزار سے چھوا کر شیخ احمد کے سر پر رکھ دی۔ دوسرے ہاتھ میں روٹی اور حلوا تھا فرمایا۔ ”یہ کلاہ اپنے سر پر رہنے دے اور روٹی اور حلوا کھا لے۔“

شیخ احمد کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”حق حق حق۔“

اور بے اختیار قطب ربانی کے قدموں میں ڈھیر ہو گئے۔ قطب ربانی نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بڑی دعائیں دیں۔

حضرت قطب ربانی انہیں اپنے ساتھ خانقاہ میں لے گئے اور اپنے ہاتھوں سے سر کے بال کاٹ دیے اور باقاعدہ اپنا مرید کر لیا۔ کچھ دیر بعد دسترخوان بچھا اور اس پر کئی قسم کے کھانے سجا دیے گئے۔

شیخ احمد نے ہر کھانے میں تامل سے کام لیا۔

قطب ربانی نے دریافت کیا۔ ''کیا بات ہے شیخ احمد، کھاتے کیوں نہیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''حضرت میری کیا مجال جو کھانے سے گریز کروں لیکن اندر دل میں معلوم نہیں کون ہے جو مجھے وسوسوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں کھانا کھانا چاہتا ہوں لیکن دل سے آواز آ رہی ہے کہ خبردار، محتاط جو کچھ بھی کھانا سوچ سمجھ کر کھانا، کھانے کی طرف سے ہر طرح اطمینان کر کے۔''

اس کے بعد شیخ احمد نے کئی بار حق حق کا نعرہ بلند کیا۔

قطب ربانی نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے وسوسے کا علاج کرتا ہوں، تمہارے دل کو ہاں اور نہیں کے وسوسوں سے پاک کرتا ہوں۔''

شیخ احمد نے عجز و انکسار سے فرمایا۔ ''خدا کے لیے جلدی کیجیے ورنہ میں بیمار پڑ جاؤں گا۔''

قطب ربانی نے تیز تیز نظروں سے شیخ احمد کو گھورا اور تحکمانہ فرمایا۔ ''شیخ احمد! ان موجود کھانوں میں جو ناپسند ہوں، انہیں چھوڑ دو بقیہ کھالو۔''

شیخ احمد کو یوں محسوس ہوا گویا ان کا دل وسوسوں سے پاک ہو چکا ہے، انہوں نے بے ساختہ ''حق حق'' کا نعرہ بلند کیا۔

قطب ربانی نے فرمایا۔ ''شیخ احمد، یہ تو حق حق کا نعرہ کیوں لگا رہا ہے؟''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''مجھ کو حق حق سے سکون ملتا ہے۔''

قطب ربانی نے ارشاد فرمایا۔ ''اب آج سے تو شیخ احمد کے ساتھ ساتھ عبدالحق بھی ہے۔ یہ نام تیرے ساتھ اچھا رہے گا۔ اب تو عبدالحق ہے اور ہمیشہ عبدالحق ہی رہے گا۔''

اس کے بعد سے وہ واقعی عبدالحق ہی ہو گئے۔

کچھ عرصہ پیر و مرشد کے پاس رہ کر انہوں نے سیاحت اختیار کی۔ قطب ربانی نے بھی اس کی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ یہ پانی پت سے ردولی پہنچے، ماں اپنے بیٹے کی یاد میں سوگوار ہو رہی تھیں۔ اچانک بیٹے کو سامنے دیکھ کر بے چین ہو گئیں اور دیر تک سینے سے لگائے رکھا۔

بعد میں ماں نے پوچھا۔ ''کیا تیرے بھائی تقی الدین نے تیری مدد کی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ذرا بھی نہیں کیونکہ بھائی تقی الدین علوم ظاہری کا درس تو دے سکتے ہیں علوم باطنی کا انہیں کوئی تجربہ نہیں۔''

ماں نے شفقت سے پوچھا۔ ''پھر تو نے کیا کیا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''پھر میں نے اپنے بھائی کی قیام گاہ چھوڑ دی اور مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مجھے پانی پت کا پتا بتایا گیا تھا چنانچہ جب میں پانی پت پہنچا اور وہاں قطب ربانی کے در پر ہاتھیوں اور گھوڑوں کا ہجوم جو دیکھا تو میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ آخر یہ کیسا پیر ہے جو اس کر و فر اور شان و شوکت سے رہتا ہے۔ میں نے اس خانقاہ میں دوبارہ جانا بھی گوارا نہ کیا اور پانی پت کو چھوڑ دیا۔ سارا دن چلتا رہا اور بعد میں یہ معلوم ہوا کہ میں پانی پت ہی میں عمر بھر گردش کرتا رہوں گا کسی پرکار کی طرح۔''

ماں نے بے چینی سے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

شیخ احمد نے سب کچھ تفصیل سے بتا کر عرض کیا۔ ''ماں اب میں بہت شرمندہ بھی ہوں اور مطمئن بھی۔''

ماں نے ایک بار پھر بیٹے کو اپنے سینے سے لگالیا اور بڑی دعائیں دیں۔ اس کے بعد شیخ احمد سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور کئی سال تک سیاحت کرتے رہے۔ پانی پت میں پیر و مرشد کی طبیعت بہت نازک ہو گئی اور انہیں اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ اپنے بیٹے شیخ احمد عارف کو بلا کر فرمایا۔ ''بیٹے عارف! اب میں عنقریب اپنے خالق کے پاس چلا جاؤں گا۔''

قطب ربانی کے صاحبزادے رونے لگے کہا۔ ''ابا جان! خدا آپ کو ہزاروں سال زندہ و سلامت رکھے آپ ایسی بات نہ کیجیے۔''

شیخ عارف کی باتیں آپ نے بڑے انہماک سے سنیں اور فرمایا۔ ''فرزند! میرے بعد شیخ احمد جو اب عبدالحق ہو چکا ہے تیرے پاس آئے گا تو میرے سارے تبرکات اس کے حوالے کر دے گا، کیونکہ وہی میرا خلیفہ اور سجادہ نشین ہوگا۔''

بیٹے کو رونا آئے چلا جا رہا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابا جان آپ ایسی باتیں نہ کیجیے میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے۔''

باپ نے بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ ''بیٹے! تو آنسو نہیں بہائے گا کیونکہ رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا میری ساری وصیتیں اور نصیحتیں تو نے سن لی ہیں؟''

بیٹے نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''میں نے آپ کی نصیحتیں اور وصیتیں اچھی طرح سن لی ہیں اور اللہ نے چاہا تو میں

ان پر پورا اتروں گا۔"

اس کے چند دن بعد حضرت قطب ربانی نے وصال فرمایا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ احمد پانی پت واپس پہنچے۔ مرحوم قطب ربانی کے صاحبزادے شیخ عارف نے بصد ادب واحترام تبرکات ان کے حوالے کر دیے اور کہا۔ "حضرت! پدر مرحوم فرما گئے ہیں کہ ان کا سلسلہ آپ ہی سے جاری ہوگا۔ آپ ان کے جانشین ہیں۔ چنانچہ ان کے سارے تبرکات پیش خدمت ہیں قبول فرمائیے۔"

شیخ احمد نے تبرکات لے کر پیرومرشد کے فرزند شیخ عارف پر توجہ دینا شروع کر دی اور تعلیم و تربیت دے کر انہیں مرتبہ کمال کو پہنچا دیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر آپ نے ردولی کے لیے رختِ سفر باندھا۔ شیخ عارف نے سوگوار ہو کر دریافت کیا۔ "حضرت! میرے لیے کیا ارشاد ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "مرشد زادے! تم میرے خلیفہ اور جانشین ہو۔ چاہو تو ردولی چلو، ورنہ یہیں رہ جاؤ۔"

مرشد زادے نے عرض کیا۔ "میں آپ کے ساتھ ردولی چلوں گا کیونکہ آپ کے بغیر میرا وجود ہی کیا۔"

آپ مرشد زادے کے ساتھ ردولی تشریف لے گئے گھر کی حالت ہی بدل چکی تھی۔ والدین میں سے کوئی بھی بقیدِ حیات نہ تھا۔ ردولی چند مکانوں کی ایک بستی کا نام تھا اور نہ ہر طرف جنگل و بیابان تھا۔ آپ اپنے آبائی مکان میں رہنے لگے۔ آپ کے عقیدت مندوں نے آپ کی صحبت میں ردولی کا قیام اختیار کیا اور اس کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔

آپ کے حجرے میں نہ تکیہ تھا نہ بستر۔ جسم پر ایک خرقہ تھا جس پر بے شمار پیوند لگے ہوئے تھے۔ شیخ عارف نے ایک عرصہ بعد آپ کو یاد دلایا۔ "حضرت! کامل تیس سال گزر چکے ہیں کہ آپ کا سر تکیے کی لذت سے نا آشنا ہے۔ اب ضعیفی میں تو سر کو آرام دے دیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تکیہ ایک ہی ذات کا کافی ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور تکیے کی کیا ضرورت۔ اور اس تکیے میں جو لذت ہے اس کا بیان کرنا ہی کیا۔"

شیخ عارف نے عرض کیا۔ "حضرت! آپ کا لباس بھی پیوندوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور ان کی کثرت سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ لباس کا اصل کپڑا کون سا ہے۔"

آپ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "مجھے اپنے لباس کی نہیں اپنی شناخت منظور ہے، اگر یہ شناخت میں نہ حاصل کر سکوں تو پھر میرے پاس رہے گا کیا لیکن اب میری شناخت میں یہ لباس بھی شامل ہو چکا ہے۔"

اس کے بعد آپ پر محویت طاری ہو گئی اور دنیا فراموش ہونے کے ساتھ ساتھ خود فراموشی میں ایسے گم ہوئے کہ سب کچھ بھلا دیا۔ وہ ذات واحد میں گم ہو چکے تھے، جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے باقاعدگی سے تشریف لے جاتے اور ردولی اتنی ترقی کر چکا تھا کہ وہاں کئی مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں اور ایک جامع مسجد بھی بن چکی تھی۔ آپ ہمیشہ جامع مسجد ہی میں نماز پڑھتے تھے لیکن خود ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جامع مسجد کہاں ہے۔

مرید اور رشتے دار آپ کی خدمت میں حاضریاں دیتے لیکن آپ کو دنیا سے بے نیاز اور گم دیکھ کر واپس چلے جاتے۔ آپ کسی سے مخاطب ہوتے نہ کسی کا مخاطب کرنا پسند فرماتے۔ دنیا فراموشی کا یہ عالم تھا کہ رشتے دار ان کے سامنے کھڑے ہوتے مگر آپ انہیں پہچاننے سے قاصر رہتے۔

ایک دن تو یہ ظاہر فراموشی حدِ کمال کو پہنچ گئی۔ آپ کا ایک انتہائی قریبی رشتے کا نوجوان اس زعم میں آپ کے پاس پہنچا کہ آپ اس کو تو پہچان ہی لیں گے۔ آپ نے اپنے روبرو ایک سایہ سا محسوس کیا پوچھا۔ "بھائی! تم کون ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضرت! میں آپ کی بہن کا بیٹا ہوں۔"

آپ نے حیرت سے کہا۔ "میری بہن کا بیٹا، یہ کیا ہوتا ہے؟"

بھانجے نے جواب دیا۔ "بہن کا بیٹا بھانجا ہوتا ہے، آپ کی بہن کا بیٹا۔"

آپ نے بدستور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میری بہن کا بیٹا! میرا بھانجا، میں تیری بات نہیں سمجھا، میرا وقت کیوں ضائع کرتا ہے اپنی راہ لے اور میرے سامنے سے ہٹ جا۔"

بھانجے نے چڑ کر عرض کیا۔ "میں خود کو پہچان کرائے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، چاہے جو ہو جائے۔"

آپ نے فرمایا۔ "پھر جلدی پہچان کرا دو میں تجھے نہیں پہچان سکا۔"

بھانجے نے پوچھا۔ "کیا آپ اپنی بہن کو بھول گئے؟"

آپ نے ذہن پر زور دیا، فرمایا۔ ”بہن؟ یہ کوئی چیز ہوتی تو ضرور ہے۔ ذرا اس کا اتا پتا تو بتا۔ ممکن ہے اس طرح میں اسے پہچان لوں۔“

بھانجے نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”حد ہے تو گویا آپ نے اپنی بہن ہی کو بھلا دیا۔ اس بہن کو جو آپ کی ماں اور باپ کی بیٹی تھی۔ آپ کے والدین کی بیٹی آپ کی بہن۔“

آپ نے ذرا سکوت اختیار کیا اور پھر فرمایا۔ ”میرے والدین کی بیٹی؟ ہاں ایک تھی تو ضرور لیکن آج کل وہ ہے کہاں؟ وہ کہاں چلی گئی۔ شاید بچپن، میں اس کا میرا کچھ ساتھ بھی رہا ہے۔“

بھانجے نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”بے شک بے شک آپ نے درست فرمایا۔ اب آپ نے پہچان لیا، بالکل صحیح پہچانا۔“

آپ نے دریافت کیا۔ ”تو تو میری بہن کا بیٹا ہے لیکن وہ میری بہن ہے کہاں؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”حضرت! وہ اللہ کو پیاری ہو چکیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہم سب کو وہیں جانا ہے بس اللہ ہی باقی رہے گا۔“

بھانجے نے عرض کیا۔ ”حضرت! ایسی خود فراموشی بھی کس کام کی کہ بہن اور بھانجے تک کو بھلا دیا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کوئی کام کی بات کرنا ہو تو کر، وقت ضائع نہ کر۔“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”حضرت! میرے حق میں دعا کیجیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

آپ بدستور حق حق فرماتے رہے، اس طرح گویا انہوں نے بھانجے کی آواز سنی ہی نہیں۔

بھانجے نے ایک بار پھر عرض کیا۔ ”حضرت! کچھ میری بھی سنیے، میں کچھ عرض کر رہا ہوں۔“

آپ نے بھانجے کو غور سے دیکھ کر سوال کیا۔ ”کیا کچھ مجھ سے کہہ رہے ہو؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”ہاں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں، میں بہت پریشان ہوں میرے حق میں دعا فرما دیجیے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”لیکن تم ہو کون؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”میں ہوں آپ کا بھانجا۔“

آپ نے ذہن پر زور دے کر پوچھا۔ ”بھانجا۔ یہ بھانجا کیا ہوتا ہے؟“

بھانجے نے زچ ہو کر عرض کیا۔ ”بھانجا بہن کا بیٹا ہوتا ہے۔“

آپ نے ذہن پر مزید زور دیا۔ ”بہن کا بیٹا؟ یہ بہن کیا ہوتی ہے؟“

بھانجے نے عاجز آ کر جواب دیا۔ ”حضرت! ابھی ابھی بہن کا مطلب سمجھا چکا ہوں اور آپ پھر پوچھ رہے ہیں کہ بہن کیا ہوتی ہے اب میں ہار کیا بتاؤں کہ بہن کیا ہوتی ہے۔“

آپ نے ”حق حق“ کا نعرہ لگایا۔ بولے۔ ”ہاں بتا بتا یہ بہن کیا چیز ہوتی ہے؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ کو اپنے والدین کا علم ہے؟ آپ کی ایک ماں تھی ایک باپ تھا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”ہاں تھے تو سہی، پھر؟“

بھانجے نے کہا۔ ”ان کا ایک بیٹا تھا جو آپ ہیں اور ایک بیٹی تھی وہ بیٹی آپ کی بہن تھی میں اس کا بیٹا ہوں۔“

آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ”سمجھا سمجھا۔ بالکل سمجھ گیا۔“

بھانجے نے فوراً عرض کیا۔ ”میں آپ کی بہن کا بیٹا ہوں، میرے حق میں دعا کیجیے۔“

آپ پھر ”حق حق“ کہنے لگے فرمایا۔ ”دعا کروں گا ضرور کروں گا، تیرے لیے بھی۔ بہن کے لیے بھی، سب کے لیے دعا کروں گا۔“

اس کے بعد آپ جتنے دن بھی رہے خود فراموشی میں رہے۔ آخر اسی حال میں 15 جمادی الثانی 837ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ آپ کا سنِ وفات، عارف حق احمد عبدالحق بحق، سے نکلتا ہے۔

آپ کے بعد آپ کے مرشد زادے عارف خلیفہ اور سجادہ نشین ہوئے ان کے بعد یہ خلافت محمد بن عارف کو منتقل ہوئی اور پھر یہ خلافت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو ملی اور ان سے یہ سلسلہ پورے برصغیر میں پھیلتا چلا گیا۔

شاہ دولہ

ضیا تسنیم بلگرامی

انسان چاہے خاندان میں رہنے کا عادی ہو یا خاندان سے ہٹ کر تنہا... اس کی انفرادی شخصیت، عمل، کردار اور منفرد سوچ ہی اس کی زندگی کا حاصل اور قیمتی سرمایہ ہے۔ جیسے کہ شاہ دولہ... جنہیں اپنا خاندان تو نصیب نہیں ہوا مگر جس حلقے میں بھی رہے اپنی جداگانہ شان کا مظہر ضرور رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کاتبِ تقدیر اپنے خاص بندوں کے مقدر کو ایک الگ ہی انداز میں تحریر کرتا ہے پھر ویسے ہی حالات کے دائرے میں قید کرکے اسی کے مطابق رستے بھی پیروں تلے بچھا دیتا ہے... اس طرح اس کے مقرب بندے اس کی رضا میں راضی رہ کر تمام آزمائشوں میں سرخ رو ہو جاتے ہیں۔

حالات کی سختیوں سے نبرد آزما پاک رب العزت کی خوشنودی

پانے والے ولی کی روداد

جب انقلابِ زمانہ نے لودھیوں کو مغل فاتح بابر کے ہاتھوں تباہ و برباد کر دیا تو یہ پورے ملک میں منتشر ہو گئے اور ادھر ادھر آوارہ و سرگرداں پھرنے لگے۔ انہوں نے مختلف پیشے اختیار کیے۔ مغل دربار میں ان لوگوں کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی کیونکہ لودھیوں کے آخری فرماں روا ابراہیم لودھی کی ماں نے بابر کو کھانے میں زہر دے کر ہمیشہ کے لیے لودھیوں کا اعتماد ختم کر دیا تھا۔

لودھیوں کے چند خاندان پنجاب میں بھی بس گئے تھے۔ یہ لوگ سالوں گمنامی میں زندگیاں بسر کرتے رہے۔ اسی خاندان کے کچھ لوگوں نے عبادت و ریاضت میں منہمک ہوکر اپنے زخمی دلوں پر اندمال کا مرہم رکھ لیا تھا۔ شاہ دولہ بھی ایک ایسے ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ابھی بچے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ عزیزوں رشتے داروں نے نظریں پھیر لیں۔ گزر بسر کا کوئی سہارا نہ رہا۔ پاس پڑوس والوں نے کچھ دن تو ان کا ساتھ دیا اس کے بعد وہ بھی خاموش ہوگئے اور اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔

کئی وقتوں کا فاقہ، سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ایسے میں ایک ادھیڑ عمر شخص نے شاہ دولہ سے بڑی محبت ظاہر کی۔ ان کے پاس آیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”صاحبزادے! مجھے تمہارے حالِ زار پر بڑا رحم آتا ہے۔ تم نے کھانا کب سے نہیں کھایا؟“

شاہ دولہ نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”دو دن سے۔“

اس شخص نے اور زیادہ افسوس کیا۔ ”صاحبزادے! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤں گا۔“

ننھے معصوم شاہ دولہ نے اپنے مہربان کی انگلی پکڑلی اور اس کے گھر چلے گئے۔ اس نے نوکر کو حکم دیا۔ ”دیکھو! بچہ بہت بھوکا ہے اس کے لیے گرما گرم مزے دار کھانا لاؤ۔“

حکم کی دیر تھی کہ گرما گرم مزے دار کھانا بچے کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اس شخص نے نوالے بنا بنا کر شاہ دولہ کو کھلانا شروع کردیے۔ کھانا کھلانے کے دوران اس شخص نے شاہ دولہ سے پوچھا۔ ”بیٹے! ایک بات تو بتاؤ۔“

شاہ دولہ نے کہا۔ ”پوچھیے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”تم کہتے ہو، میں دو دن کا بھوکا ہوں حالانکہ تمہارے چہرے سے دو دن کے فاقوں کی نقاہت ذرا بھی مترشح نہیں، آخر یہ کیا بات ہے؟“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے فاقوں کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا لیکن یہ بات درست ہے کہ میں نے دو دن سے کچھ بھی نہیں کھایا۔“

وہ شخص میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا اور اپنے ہاتھ سے انہیں کھانا کھلاتا رہا۔ کھانا کھلانے کے بعد اس نے انہیں نرم و ملائم بستر پر لٹا دیا اور کہا۔ ”بیٹے سو جاؤ اور کسی قسم کی فکر نہ کرو۔ اللہ جو کچھ کرے گا، اچھا ہی کرے گا۔“

شاہ دولہ اس بستر پر لیٹے تو پلک جھپکتے ہی سو گئے۔ وہ شخص انہیں سلا کر کہیں غائب ہوگیا۔ شام کو جب واپس آیا تو اس نے شاہ دولہ کو ایک خوش خبری سنائی، بولا۔ ”صاحبزادے! میں نے تمہارا انتظام کردیا۔ اب تم کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اس کے بعد دسترخوان پر کھانا لگوایا اور شاہ دولہ کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ کھانے کے دوران کہا۔ ”صاحبزادے! میں چاہوں تو تمہیں اپنے ساتھ ہی رکھ سکتا ہوں لیکن میرے ساتھ رہنے میں ایک دشواری ہے، میری بیوی بچوں کے ساتھ ان دنوں میکے گئی ہوئی ہے، ہفتے عشرے میں واپس آجائے گی۔ میں اپنی بیوی کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ تمہیں اس گھر میں دیکھ کر چراغ پا ہو جائے گی اور میں اس کی یہ بات نہیں برداشت کرسکتا۔ اس لیے اس کے آنے سے پہلے ہی میں نے تمہارا انتظام ایک دوسری جگہ کردیا ہے۔ اس گھر میں صرف دو میاں بیوی رہتے ہیں۔ ان کی اولاد کوئی نہیں ہے۔ وہ تمہیں اپنے بیٹے کی طرح پالیں گے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ تم بڑے مقدر والے ہو۔ ورنہ ایسا گھرانا کسے ملتا ہے؟“

شاہ دولہ کم گو تھے۔ اس شخص کی باتیں سنتے رہے اور اس کی شکل دیکھتے رہے۔ دونوں نے رات کا کھانا ایک ساتھ کھایا اور سونے کے لیے اپنے اپنے بستر پر چلے گئے۔

علی الصباح اس شخص نے شاہ دولہ کو بیدار کیا اور کہا۔ ”صاحبزادے! تم منہ ہاتھ دھولو، ناشتا تیار ہے۔“

شاہ دولہ نے منہ ہاتھ دھوکر ناشتا کیا اور اس شخص کے ساتھ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ باہر گھوڑا گاڑی تیار کھڑی تھی جسے کوچوان چلا رہا تھا۔ دونوں اس پر سوار ہوگئے اور گھوڑا گاڑی چل پڑی۔

راستے میں اس شخص نے شاہ دولہ کو سمجھانا شروع کیا۔ ”صاحبزادے! میری ایک بات تم ہمیشہ یاد رکھنا۔“

شاہ دولہ معصومیت سے اس شخص کی شکل دیکھنے لگے۔

وہ شخص کہہ رہا تھا۔ ”صاحبزادے! اگر تمہارے والدین زندہ ہوتے اور تم سے یہ کہتے کہ میرا جسم داب دو، تو تم کیا کرتے؟“
شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔“
اس شخص کے چہرے پر شگفتگی سی دوڑ گئی، بولا۔ ”شاباش! مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔“
کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”یہ گرمیوں کا موسم ہے اگر تمہارے والدین اس گرم موسم میں تم سے یہ کہتے کہ ذرا پنکھا تو جھل دو تو تم کیا کرتے؟“
شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت تک پنکھا جھلتا رہتا جب تک کہ وہ مجھے منع نہ کر دیتے۔“
اس شخص نے فرطِ خوشی میں کہا۔ ”بے شک، نیک اور صالح اولاد یہی کرتی ہے۔“
وہ شخص اسی قسم کی باتیں کرتا ہوا جب ایک حویلی کے سامنے پہنچا تو شاہ دولہ سے کہا۔ ”صاحبزادے! سفر تمام ہوا۔ اس حویلی میں ہمیں چلنا ہے۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”اس حویلی میں رہنے والے میاں بیوی حد درجہ شریف ہیں۔ یہ تمہیں اپنی اولاد کی طرح اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں پھر جب تم ان کے ساتھ رہنے لگو تو ہمیشہ ان کا اپنے والدین کی طرح احترام کرنا اور ان کا ہر حکم بے چون و چرا مان لینا۔“
شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”میری تو یہی کوشش رہے گی کہ میں ان کا ہر حکم مانوں، آگے کا حال اللہ جانے۔“
گاڑی پر سے اتر کر اس شخص نے حویلی کے دربان سے کہا۔ ”جاؤ، اندر کہہ دو کہ علی نقی آیا ہوا ہے۔“
دربان اندر گیا اور ذرا دیر بعد واپس آ کر جواب دیا۔ ”لالہ جی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“
اس شخص کا چہرہ فرطِ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے شاہ دولہ کی انگلی پکڑی اور حویلی میں داخل ہو گیا۔ دربان آگے آگے تھا اور یہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے۔ دربان انہیں ایک ایسے کمرے میں لے گیا جس میں لالہ جی دھوتی باندھے اور جنیو کاندھے میں پھنسائے ایک مورتی کے سامنے بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ یہ دونوں مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔
کچھ دیر بعد لالہ ادھر سے فارغ ہو کر ان دونوں کے پاس آ گئے۔ آنکھوں کے گوشوں سے شاہ دولہ کو دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ ”کہو علی نقی! کیا حال چال ہے؟ کام دھندا کیسا چل رہا ہے؟“
علی نقی نے جواب دیا۔ ”کام دھندا مندا ہے آج کل۔ باہر کہیں جانا نہیں ہوتا۔ تم جانو شہر کے اندر تو یہ دھندا صحیح طور پر چل نہیں سکتا۔ اتفاق سے کوئی کام ہو جائے تو ہو جائے۔ بس گھر میں پڑا مکھیاں مارتا رہتا ہوں۔“
لالہ جی نے شاہ دولہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تو یہ ہے وہ لڑکا؟“
علی نقی نے جواب دیا۔ ”ہاں یہی ہے وہ لڑکا۔ بے چارہ یتیم بھی ہے اور اسیر بھی۔ بہت شریف ہے۔“
لالہ جی برابر آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ پوچھا۔ ”پر ایک بات تو بتاؤ علی نقی! اس کے ماں باپ کیا واقعی مر گئے؟“
علی نقی نے جواب دیا۔ ”میں اس کے ماں باپ کی موت کا یقین دلانے کے لیے بڑی سے بڑی قسم بھی کھا سکتا ہوں۔“
لالہ جی نے پوچھا۔ ”اور اس کا کوئی اور رشتے دار؟“
علی نقی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اوپر اللہ اور نیچے آپ ہیں۔ بس ان دو کے سوا اس کی کسی سے بھی کوئی رشتے داری نہیں ہے۔“
لالہ جی نے دربان سے کہا۔ ”اس لڑکے کو للائن کے پاس لے جا، میں وہیں آ رہا ہوں۔“
شاہ دولہ نے علی نقی کی طرف دیکھا۔ اس نے شاباش دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے! اندر چلا جا۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“
شاہ دولہ نے بغیر کسی حیل و حجت کے دربان کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔
شاہ دولہ کے جاتے ہی لالہ جی نے علی نقی سے پوچھا۔ ”اس کا کیا نذر کر دوں؟“
علی نقی نے جواب دیا۔ ”صرف پانچ سو اشرفیاں۔“
لالہ جی نے کچھ اس طرح منہ بنایا گویا انہیں یہ جواب پسند نہیں آیا ہوا۔
علی نقی نے کہا۔ ”پھر لالہ جی! جلدی کیجیے۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔“
علی نقی نے اپنا جملہ ختم کیا ہی تھا کہ لالہ جی بول پڑے۔ ”میں کہتا ہوں اگر تم یوں ہی امن و سکون سے رہنا چاہتے ہو تو......“ لیکن پوری بات نہیں ہو سکی۔ علی نقی نے کہا۔ ”لالہ جی! اب دیر نہ کیجیے۔ مجھے دے دلا کر رخصت کیجیے۔“
شاہ دولہ اندر سے واپس آ چکے تھے۔ لالہ جی نے دربان کو گھورا اور نرمی سے کہا۔ ”میں نے کیا کہا تھا تم سے؟“

دربان نے جواب دیا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ اس کو للائن کے پاس لے جاؤں۔ یہ للائن کو دیکھتے ہی یہاں بھاگ آیا۔ اس سلسلے میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں تو اسے جھڑک بھی سکتا ہوں مگر...... مگر......“

علی نقی نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور حکم دیا۔ ”بیٹے! جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم اندر للائن کے پاس جاؤ اور اس وقت تک وہیں رہو جب تک تمہیں بلایا نہ جائے۔“

شاہ دولہ پھر اندر چلے گئے تو علی نقی نے لالہ جی سے کہا۔ ”لالہ جی! اب دیر نہ کیجیے۔ پانچ سو اشرفیاں مرحمت فرمائیے۔“

لالہ جی نے منہ بنا کر کہا۔ ”اس ذرا سے بچے کی پانچ سو اشرفیاں۔ آخر اس بات کا جواز کیا ہے؟“

علی نقی نے جواب دیا۔ ”اس کا جواز یہ ہے کہ شاہ دولہ کا تعلق بہلول لودھی کے خاندان سے ہے۔ یہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے، آئندہ تاریخوں میں شاہ دولہ کے ساتھ آپ کا نام بھی آجائے گا۔“

لالہ جی نے علی نقی کے آگے دو سو اشرفیاں رکھ دیں اور کہا۔ ”میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اگر لینا ہو تو لے لو۔ ورنہ لڑکے کا ہاتھ پکڑو اور اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

علی نقی نے دو سو اشرفیاں اٹھالیں اور پژمردگی سے کہا۔ ”لالہ جی! آج کل کاروبار مندا ہے اس لیے دو سو اشرفیاں لے رہا ہوں ورنہ میں انہیں ہاتھ بھی نہ لگاتا۔“ یہ کہتے ہوئے علی نقی کھڑا ہو گیا۔

لالہ جی نے کہا۔ ”اب اپنا وقت نہ برباد کرو۔ جاؤ، ورنہ وہ لڑکا دوبارہ آجائے گا۔“

علی نقی فوراً ہی چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شاہ دولہ پھر آگئے اور پوچھا۔ ”وہ میرا مہربان دوست کہاں چلا گیا؟“

لالہ جی نے معنی خیز نظروں سے شاہ دولہ کو دیکھ کر پوچھا۔ ”میں کون ہوں؟ کچھ جانتے ہو؟“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، جانتا ہوں...... آپ ایک مہربان شخص ہیں۔ آپ کی کوئی اولاد نہیں ہے، آپ مجھ کو پالنا چاہتے ہیں۔“

لالہ جی نے کہا۔ ”نہیں صاحبزادے! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تمہیں علی نقی سے خریدا ہے وہ بردہ فروش ہے اور اس کا یہی کاروبار ہے۔ وہ اکثر سفر میں رہتا ہے اور جن بچوں کو ادھر ادھر سے اٹھا کر لاتا ہے، یہاں کے متمول لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔“

شاہ دولہ کی نظریں مورتی پر لگی ہوئی تھیں۔ بچپنے کے باوجود انہیں یہ احساس تھا کہ بت پرستی بہت بری چیز ہے، پوچھا۔ ”آپ لوگ ہندو ہیں نا؟“

لالہ جی نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہم ہندو ہیں۔“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”مجھ سے بت پرستی نہ کرانا۔ میں بتوں کی کوئی خدمت نہیں کروں گا۔“

لالہ جی نے ہنس کر کہا۔ ”تو مسلمان ہے نا۔ میں جانتا ہوں، میں تجھ سے اپنے مندر کا کوئی کام بھی نہیں لوں گا۔“

للائن نے بھی لالہ جی سے شاہ دولہ کی بڑی تعریف کی۔

شاہ دولہ کو اس حویلی میں جو سب سے زیادہ تکلیف دہ بات محسوس ہوئی، وہ یہ تھی کہ ہندوانہ چھوت چھات کے پیشِ نظر انہیں کھانا اچھوتوں کی طرح پیش کیا گیا تھا۔ وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے رہے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد لالہ جی نے شاہ دولہ کو آواز دی۔ ”شاہ دولہ! ذرا میرے پاس تو آنا۔“

شاہ دولہ جب اس کے پاس پہنچے تو وہ ٹانگیں پسار چکا تھا، بولا۔ ”ذرا میرے پاؤں تو دابنا۔“

شاہ دولہ نے لالہ جی کے پاؤں دابنا شروع کر دیے۔ وہ بڑی دیر تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ لالہ جی کو نیند آگئی اور وہ خراٹے لینے لگے۔

☆☆☆

لالہ اور للائن دونوں ہی شاہ دولہ سے بڑی خدمتیں لیتے۔ دوپہر کو کمرا بند کر کے سو جاتے اور شاہ دولہ ان کے لیے چھت کا پنکھا کھینچتے رہتے اور یہ کام کئی کئی گھنٹے جاری رہتا۔ شام سے ذرا پہلے پورے گھر کی صفائی کرنا پڑتی۔ مغرب کے بعد انہیں کھانا دیا جاتا۔ ابھی یہ کھانے سے فارغ بھی نہ ہوتے کہ لالہ جی کے پاؤں میں درد شروع ہو جاتا اور یہ اسے دابنا شروع کر دیتے۔

رات کو جب یہ سو رہے ہوتے، لالہ جی کو ان کی ضرورت پیش آجاتی تو بے دریغ جگا دیتے۔

للائن اپنی ساڑیاں شاہ دولہ کے حوالے کر دیتیں کہ انہیں دھولا۔ یہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے ساڑیاں دھونے لگتے اور کوشش کر کے صاف ستھری دھوتے۔ دونوں میاں بیوی شاہ دولہ کے بے عذر کام سے بہت خوش تھے۔ وہ اکثر آپس میں باتیں کرتے تو موضوعِ گفتگو شاہ دولہ ہی ہوتے۔

شب و روز گزرتے رہے، یہاں تک کہ سالوں بعد جب شاہ دولہ سن شعور کو پہنچے تو ان میں ایک تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ وہ لالہ اور للائن کے کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنی کوٹھری میں چلے جاتے اور اللہ اللہ کیا کرتے۔ سالوں ساتھ رہنے کے دوران دونوں میاں بیوی نے شاہ دولہ میں یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ ان کی اکثر باتیں سچ ہو جایا کرتی تھیں۔ مثلاً کسی دن للائن سے کہہ دیا کہ...... ''مالکن! آج آپ کی بہن آ رہی ہیں، ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر لیجیے۔''

للائن پوچھتیں۔ ''تجھے یہ خبر کس نے دی؟''

شاہ دولہ جواب دیتے۔ ''میرے دل نے۔ اندر معلوم نہیں کون بیٹھا مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ للائن سے کہہ دو تمہاری بہن آ رہی ہے، اس کے کھانے پینے کا انتظام کر لو۔ بس اندر کی یہ بات میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔''

اور سہ پہر تک یہ بات حیرت انگیز طور پر صحیح ہو جاتی۔ للائن کی بہن آ جاتیں اور للائن کو سکتہ ہو جاتا۔

جب اس قسم کے کئی واقعات رونما ہوئے تو شاہ دولہ کا احترام کیا جانے لگا۔ لالہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ شاہ دولہ کوئی معمولی ہستی نہیں ہیں۔ جب لالہ نے شاہ دولہ کی دیانت، محنت اور صبر و استقلال پر غور کیا تو انہیں بالکل یقین ہو گیا کہ شاہ دولہ کے جسم میں کسی رشی منی کی روح ہے۔ لالہ نے ایک دن شاہ دولہ کا امتحان لیا۔ لالہ کا ایک بھائی اپنی نوعمری سے مفقودالخبر تھا۔ سوچا کہ اپنے اس بھائی کی بابت شاہ دولہ سے معلوم کیا جائے۔ لالہ جی نے شاہ دولہ کو اپنے سامنے بٹھایا اور کہا۔ ''شاہ دولہ! یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ کو کافی عرصے تک نہیں پہچان سکا۔ میں نے آپ کو بہت پریشان کیا اور بہت زیادہ محنت کرائی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ علی تقی کا کیا انجام ہوا؟ وہی علی تقی جس نے آپ کو میرے ہاتھ بیچ دیا تھا۔''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''میں ہمیشہ اپنی قسمت پر شاکر رہا ہوں۔ خدا کے معاملات میں دخل دینا میرا کام نہیں۔ اس نے میرے ذمے یہ کام سونپ دیا تھا کہ آپ کی خدمت کروں، چنانچہ میں نے یہ کام پوری دیانت داری اور محنت سے انجام دیا اور میں یہ بھی نہیں جاننا چاہتا کہ علی تقی کا کیا انجام ہوا؟ ہاں، کوئی میرے دل میں بیٹھا یہ کہہ رہا ہے کہ علی تقی کے سینے میں برچھا اتار دیا گیا۔''

لالہ جی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بے اختیار شاہ دولہ کے پاؤں چھو لیے۔ شاہ دولہ نے اپنے دونوں پاؤں کھینچ لیے، لالہ نے کہا۔ ''میاں جی! یہ برچھے والی بات میرے سوا کوئی بھی نہیں جانتا مگر یہ بھی آپ کو معلوم ہو گئی۔ علی تقی نے کسی طرح جوڑ توڑ کر کے ایک مغل شہزادے کی ملازمت کر لی تھی۔ ابھی کل ہی ایک شخص نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ شہزادہ کسی بات پر علی تقی سے ناراض ہو گیا اور اس کے سینے میں برچھا اتار دیا گیا۔''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''اللہ کا نظام بڑا پیچیدہ ہے اور اسے انسان نہیں سمجھ سکتا۔''

لالہ جی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کیا۔ ''میاں جی! میرا ایک بھائی بچپن سے غائب ہے، ہم نے اسے بہت زیادہ تلاش کیا مگر اس کا آج تک کوئی پتا نہیں چل سکا۔ کیا آپ اس کی بابت مجھے کچھ بتائیں گے؟''

شاہ دولہ نے آنکھیں بند کر لیں اور سکوت اختیار کیا پھر بولے۔

''لالہ جی! کل دوپہر تک آپ کے بھائی آ جائیں گے۔''

لالہ جی نے فرطِ خوشی میں کہا۔ ''کیا سچ؟ مگر اس کا تو کہیں پتا تک نہیں۔ پھر وہ کیسے آ جائے گا؟''

لالہ جی شک و شبہے میں پڑ گئے۔ انہوں نے بے یقینی سے اس کا ذکر گھر میں للائن سے کیا۔ انہوں نے شاہ دولہ کی تائید کر دی، بولیں۔ ''اگر میاں جی نے یہ بات کہہ دی ہے تو ضرور سچی نکلے گی۔''

شاہ دولہ رات رات بھر عبادت و ریاضت میں لگے رہتے تھے۔ دوسرے دن سہ پہر کو وہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے کہ لالہ جی پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے آئے اور کہا۔ ''میاں جی! میرا بھائی آ گیا...... میاں جی! میرا بھائی آ گیا۔''

شاہ دولہ نے ہنکاری بھری جس کا یہ مطلب تھا کہ وہ تلاوتِ کلام پاک میں مشغول ہیں اس لیے بات نہیں کریں گے۔ کچھ دیر بعد جب وہ تلاوت کر چکے تو لالہ کے پاس گئے اور پوچھا۔ ''لالہ جی! آپ کے بھائی کہاں ہیں؟''

لالہ جی نے انہیں اپنے بھائی سے ملایا اور ان کی بابت اپنے بھائی کو بتایا۔ ''میاں جی نے تیری بابت کل ہی مجھے یہ

بتادیا تھا کہ آج تو سہ پہر تک آجائے گا، چنانچہ تو آگیا۔"

رات کو عشا کی نماز کے بعد شاہ دولہ اسمائے ربانی کا ورد کرنے لگے۔ یہ سلسلہ نصف رات تک جاری رہا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد انہیں کچھ سہو ہوا اور وضو کرنے کے لیے اٹھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے چند سائے محسوس کیے۔ جب ان سایوں پر نظر پڑی تو انہیں فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ لالہ جی، للائن اور لالہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ آپ نے پوچھا۔ "آپ لوگ کب آئے؟ خیر تو ہے؟"

لالہ جی نے عرض کیا۔ "ہم تینوں بڑی دیر سے یہاں کھڑے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ آواز دے کر آپ کے انہماک کا سلسلہ توڑ دیں۔ اب جب آپ خود ہی اٹھے ہیں تو آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

آپ مصلے پر دوبارہ بیٹھ گئے اور ان تینوں کو چارپائی پر بٹھانا چاہا مگر ان تینوں نے آپ کے سامنے اونچی جگہ پر بیٹھنے سے انکار کردیا۔ "میاں جی! جب تک ہمیں آپ کے مقام اور مرتبے کا علم نہیں تھا، بڑی گستاخیاں کرتے رہے مگر اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہم آپ کے پاس زمین پر تو بیٹھ جائیں گے مگر پلنگ پر یا اونچی جگہ پر ہرگز نہیں بیٹھیں گے۔"

آپ نے فرمایا۔ "جیسی آپ صاحبان کی مرضی۔ جہاں مناسب سمجھیں بیٹھ جائیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ تینوں فرش پر آپ کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

لالہ جی نے نظریں جھکالیں اور کہنا شروع کردیا۔ "میاں جی! اب ہم آپ کو اس طرح اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے جس طرح آپ اس حویلی میں داخل ہوئے تھے۔ ہماری طرف سے آپ آزاد ہیں، جہاں چاہیں چلے جائیں۔ اگر آپ اس حویلی میں رہیں گے تو یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہوگی اور ہم آپ کے لیے ایک اچھی سی جگہ بنادیں گے اور اگر آپ کو اس حویلی میں رہنا پسند نہ ہو تو جہاں چاہیں چلے جائیں۔"

للائن نے رقت سے عرض کیا۔ "آپ جہاں بھی جائیں، آپ جہاں بھی رہیں، مجھے نہیں بھولیں گے۔ یا تو آپ خود تشریف لایا کریں گے یا پھر میں درشن کے لیے حاضری دیا کروں گی کیونکہ اب آپ کا ساتھ مرنے جینے کا ساتھ ہے، میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

لالہ کے چھوٹے بھائی نے کہا۔ "اور میاں جی! میں نے تو ابھی آپ سے کوئی فیض ہی نہیں پایا۔ درشن کے لیے بھی حاضری دیا کروں گا۔"

آپ نے لالہ سے کہا۔ "لالہ جی! اگر آپ واقعی مجھ کو آزاد کررہے ہیں تو میں اس حویلی میں نہیں رہوں گا کیونکہ میں کسی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتا بھاگتا پھروں گا۔ میں کسی ایک جگہ رہ ہی نہیں سکتا۔"

لالہ جی نے جواب دیا۔ "میں آپ کے جانے سے خوش تو نہیں ہوں گا لیکن جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ اب آپ آزاد ہیں، آپ فی الواقع آزاد ہیں، جہاں چاہیں چلے جائیں اور جہاں رہنا چاہیں رہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "تب پھر میں یہ رات تو اسی حویلی میں گزاروں گا، صبح چلا جاؤں گا۔"

تینوں بہت اداس اور سوگوار تھے۔ وہ آپ کی اجازت سے دیر تک آپ کی صحبت میں رہے اور باتیں کرتے رہے۔ صبح آپ نے لالہ سے رخصت چاہی تو تینوں نے رونا شروع کردیا۔ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

آپ نے حویلی سے کوئی سامان بھی نہیں لیا۔ حالانکہ تینوں نے اس پر بڑا زور دیا اور خوشامدیں کرتے رہے کہ بستر، لوٹا اور اسی قسم کا دوسرا ضروری سامان ضرور لیتے جائیں مگر انہوں نے انکار کردیا، کہا۔ "میں اس حویلی میں خالی ہاتھ آیا تھا اس لیے خالی ہاتھ ہی یہاں سے جاؤں گا۔"

آپ اس حویلی سے نکل کر سیالکوٹ کے مشہور بزرگ شاہ سیدا کی خدمت میں پہنچے، انہیں سرمست سیالکوٹی بھی کہا جاتا تھا۔

شاہ سیدا نے شاہ دولہ کو دیکھا اور سوال کیا۔ "کس لیے آئے ہو؟"

آپ نے جواب دیا۔ "پیاسا کنویں کے پاس کیوں جاتا ہے؟"

پوچھا۔ "کیا نام ہے؟"

جواب دیا۔ "دولہ۔"

شاہ سیدا نے فرمایا۔ "یہاں تو ایک دولہ پہلے ہی سے موجود ہے۔" پھر آواز دی۔ "دولہ! ادھر تو آنا۔"

آپ کی آواز سن کر ایک شخص آپ کے پاس آن کھڑا ہوا، بولا۔ "جی پیر و مرشد! ارشاد؟"

شاہ سیدا نے شاہ دولہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ نوجوان بھی کچھ حاصل کرنے آیا ہے۔ تیرا ہم نام بھی ہے۔“

شاہ سیدا کے خدمت گار دولہ نے عرض کیا۔ ”پیر و مرشد! میں تو ایک عرصے سے کچھ حاصل کرنے کی غرض سے آپ کے قدموں میں پڑا ہوں، ویسے سمندر زمانے کی پیاس بجھا سکتا ہے۔“

شاہ سیدا نے شاہ دولہ سے کہا۔ ”تو بھی اپنے ہم نام دولہ کے ساتھ رہ میرے قریب ہی۔ اللہ بھلا کرے گا۔“

شاہ دولہ بھی اپنے پیر و مرشد سے بیعت ہو کر ان کے قدموں میں رہنے لگے۔

وہاں مریدوں اور ارادت مندوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ہزاروں کا ہجوم رہتا تھا۔ شاہ سیدا محویت میں رہتے تھے۔ شاہ دولہ نے محسوس کیا کہ ان کے پیر و مرشد کی خود ان پر کوئی خاص نظر نہیں ہے۔ ہاں اپنے ہم نام دولہ پر خاص توجہ دیتے تھے لیکن اس احساس سے وہ دل برداشتہ کبھی بھی نہ ہوئے۔ وہ کوشش یہی کرتے کہ پیر و مرشد کی خدمت کریں اور جب بھی وہ آواز دیں، خود جائیں اور ان کا حکم بجا لائیں۔

شاہ سیدا اپنی عمر کے آخری دور میں تھے۔ ان کی باتوں میں جدائی کی بو محسوس ہوتی تھی۔ وہ بیمار رہنے لگے تھے۔

ایک دن تخلیہ میں شاہ دولہ نے اپنے پیر و مرشد سے عرض کیا۔ ”پیر و مرشد! میں ہنوز پیاسا کا پیاسا ہوں۔“

شاہ سیدا نے جواب دیا۔ ”صبر کر صبر! جو جس کے حصے کا ہے مل جائے گا۔“

شاہ دولہ نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ”حضرت! یہ کچھ خالی خالی سا محسوس ہوتا ہے۔“

شاہ سیدا نے جواب دیا۔ ”وہ خالی اسی لیے ہے کہ بھرا جائے۔ اس کی فکر نہ کر۔“

کئی دن بعد شاہ سیدا کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ آپ کے مرید اور ارادت مند ہر وقت آپ کے آس پاس موجود رہتے لیکن ایک رات شاہ دولہ کے علاوہ شاہ سیدا کے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔

نصف شب کو آپ نے آواز دی۔ ”دولہ! ذرا آنا تو۔“

شاہ دولہ آواز سن کر اندر چلے گئے۔ وہاں السی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ شاہ سیدا نے چراغ کی روشنی میں شاہ دولہ کو دیکھا تو کہا۔ ”وہ اپنا دولہ کہاں چلا گیا؟ میں نے اسے آواز دی تھی، تجھے نہیں۔“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! وہ دولہ تو یہاں موجود نہیں ہے، کچھ توقف فرمائیں شاید آجائے۔“

شاہ سیدا نے فرمایا۔ ”تب پھر تم جاؤ، جب وہ آجائے تو اسے میرے پاس بھیج دو۔“

شاہ دولہ باہر چلے آئے۔

کافی دیر بعد شاہ سیدا نے پھر آواز دی۔ ”دولہ! ذرا آنا تو۔“

اس بار پھر شاہ دولہ اندر داخل ہوئے اور ادب سے عرض کیا۔ ”حضرت! میں حاضر ہوں، کوئی خدمت ہو تو بے دریغ فرمادیں۔“

شاہ سیدا نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ”کیا میں نے تجھ سے تھوڑی دیر پہلے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنا دولہ درکار ہے۔ پھر یہ تو بار بار کیوں آجاتا ہے؟“

شاہ دولہ نے کہا۔ ”پیر و مرشد! یہاں میرے سوا کوئی بھی نہیں، میں باہر موجود ہوں، آپ جب بھی آواز دیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔“

رات کے پچھلے پہر شاہ سیدا نے پھر آواز دی۔ ”دولہ! کہاں ہو؟“

شاہ دولہ ایک بار پھر اندر داخل ہوئے اور عرض کیا۔ ”حضرت! آپ کا دولہ تو موجود نہیں، میں حاضر ہوں۔“

شاہ سیدا مسکرائے، فرمایا۔ ”اچھا دولہ! تو ہی آجا۔“

شاہ دولہ اپنے پیر و مرشد کے روبرو ادب سے کھڑے ہو گئے۔

شاہ سیدا نے فرمایا۔ ”دولہ! یہ میرا آخری وقت ہے۔ اب میں جا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے، کسی کو بخش دوں۔“

شاہ دولہ نے نظریں جھکالیں۔

شاہ سیدا نے فرمایا۔ ”مجھ سے نظریں ملا، میری طرف دیکھ۔“

شاہ دولہ نے اپنے پیر و مرشد سے آنکھیں جو ملائیں تو کایا ہی پلٹ گئی۔ پورے وجود میں ایک آگ سی دوڑ گئی اور دل پگھلنے لگا۔ شاہ دولہ جذب و کیف کا شکار ہو گئے۔

پیرومرشد وفات پا گئے۔ شاہ دولہ ان کی تجہیز و تکفین کے بعد وہاں نہیں رکے اور جنگل کی راہ لی۔ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہ گیا تھا۔ سارا سارا دن جنگل میں گزار دیتے۔ جو کہتے ہو جاتا۔ لوگوں میں ہر طرف آپ ہی کا چرچا ہونے لگا۔

ایک عرصے بعد جب طبیعت ٹھہری تو سیالکوٹ کے بجائے گجرات کو اپنا مستقر بنا لیا۔ مستی کم ہوئی تو خانقاہ کی تعمیر بھی ہوگئی۔ پھر بھی کبھی کبھی مستی میں معلوم نہیں کیا کچھ کر گزرتے۔

خانقاہ میں عورتوں کا ہجوم بھی ہونے لگا۔ ان کی خواہشیں بھی عجیب و غریب ہوتی تھیں، کوئی محبوب کی تلاش میں آتی تو کوئی پردیس گئے ہوئے شوہر کی خیریت اور واپسی کی طالب ہوتی۔ کسی کو شوہر کی بے روزگاری کا مداوا درکار ہوتا تھا لیکن ان میں اکثریت ان عورتوں کی ہوتی جنہیں اولاد درکار ہوتی۔ شاہ دولہ کی زبان میں ایسی تاثیر تھی کہ جو فرماتے ہو جاتا۔

ایک خاتون آئیں۔ ان کا تعلق کسی ریاست سے تھا۔ جب شاہ دولہ کے آستانے پر حاضری دی تو اس وقت بھی ریاست کے حشم خدم ان کے ساتھ تھے۔ آپ کو اندر اطلاع دی گئی کہ ایک ریاست کی بہو شرفِ باریابی چاہتی ہیں۔

آپ نے فرمایا۔ ”انہیں اندر، میرے پاس بھیج دیا جائے۔“

ریاست کی بہو کو شاہ دولہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ آپ نے ان خاتون کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ ”بڑی بہو! خیریت تو ہے؟ کیسے زحمت فرمائی؟“

بہو نے جواب دیا۔ ”شاہ صاحب! کیا عرض کروں؟ اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے مگر وہ دولت جسے آنکھ کا نور کہا جاتا ہے، اس سے میں ابھی تک محروم ہوں۔“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”میں تیرا علاج کر تو سکتا ہوں مگر اس میں ایک ایسی قباحت ہے کہ تو راضی نہ ہو اور میں اس کے بغیر تیرے لیے دعا بھی نہیں کروں گا۔“

عورت نے کہا۔ ”آپ کسی قباحت کی بات نہ کیجیے۔ میں آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔“

شاہ دولہ نے کہا۔ ”میں تیرے لیے اولاد کی دعا کروں گا مگر تجھے اپنی پہلی اولاد خانقاہ کی نذر کرنا ہوگی۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”میں تیار ہوں۔ مجھے آپ کی بات منظور ہے۔ آپ کی بات سے تو ایسا لگتا ہے کہ خدا مجھے شاید کئی اولادیں دے گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”خدا تجھے کئی اولادیں دے گا لیکن تیری پہلی اولاد میری خانقاہ کی ہوگی۔“

عورت نے کہا۔ ”مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ آپ میرے حق میں دعا کیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اب تو جا سکتی ہے مگر اپنی بات یاد رکھنا۔“

عورت چلی گئی۔ جب وہ اپنے قصر میں داخل ہوئی تو اسے طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ اس نے سوچا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ پہلی اولاد خانقاہ کی نذر کر دی جائے۔ اگر اولاد ہی ایک ہوئی، بعد میں نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ وہ سوچتے سوچتے پریشان ہوگئی۔ پھر اپنے آپ پر ہنسنے لگی کہ ابھی اولاد کا تو کہیں پتا نشان نہیں اور وسوسے اتنے زیادہ آنے لگے۔ آخر اس نے اس مسئلے کو اس وقت پر اٹھا رکھا جب تک کوئی بیٹا یا بیٹی پیدا ہو جائے۔

خدا نے شاہ دولہ کی زبان میں برکت دی تھی۔ خاتون کو حمل ہو گیا اور دس ماہ بعد بچہ بھی پیدا ہو گیا۔ بچہ خاصا صحت مند تھا۔ مگر اس کا سر نسبتاً چھوٹا تھا۔ عورت کو اپنا بچہ بہت پیارا لگا۔ اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے سوچا کہ اگر اسے خانقاہ کی نذر نہ بھی کیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ اس نے اپنے ملازمین کو ہدایت دی کہ اس بچے کی پیدائش کا کہیں ذکر نہ کیا جائے۔ کیونکہ عورت کو معلوم تھا کہ اس کے چاکروں میں کئی ایسے تھے جو شاہ دولہ کی خانقاہ میں حاضریاں دیا کرتے تھے۔ عورت نے انہیں دھمکی دی کہ اگر اس بچے کا خانقاہ میں ذکر کیا گیا تو وہ ذکر کرنے والے کو تباہ و برباد کر دے گی۔

اس بچے کی پیدائش کے کئی دن بعد عورت نے خواب میں دیکھا کہ شاہ دولہ اس سے کہہ رہے ہیں۔ ”عورت! بدعہدی بڑا گناہ ہے، اپنا وعدہ پورا کر۔“

عورت نے کہا۔ ”حضرت! مجھ پر رحم کیجیے۔ اس بچے کو مجھ سے نہ لیجیے۔“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”بات لینے دینے کی نہیں ہے، وعدے کی ہے۔ تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنا پہلا بچہ میری خانقاہ کی نذر کرے گی۔ اب اگر تو اس سے منحرف ہو رہی ہے تو ہو جا۔ تیری اطلاع کے لیے میں یہ بتائے دے رہا ہوں کہ تیرا یہ لڑکا اپنے چھوٹے سر کی وجہ سے مسلوب العقل ہے اور یہ تیرے کسی کام کا نہیں۔“

عورت بیدار ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ اس نے اپنے بیٹے کے سر کو بہت غور سے دیکھا، یہ بہت چھوٹا تھا۔ اس نے اپنے خاص اطباء کو بلوا کر بچہ ان کے سامنے کر دیا اور پوچھا۔ ”آپ لوگ بتائیں کہ یہ بچہ اپنے چھوٹے سر کی وجہ سے کیسا ہوگا؟“

اطباء نے خوب اچھی طرح مشاہدہ کرنے کے بعد جواب دیا۔ ”یہ بچہ مسلوب العقل ہوگا، بالکل جانوروں کی طرح۔“

عورت کے ہوش وحواس ہی جاتے رہے۔ وہ کئی دن تک اس مسئلے پر غور کرتی رہی۔ آخر ایک دن یہ فیصلہ کرلیا کہ اس بچے کو خانقاہ کی نذر کر دیا جائے۔ یہ اسی تزک واحتشام سے خانقاہ گئی اور شاہ دولہ کو مطلع کیا۔ ”میں حاضر ہوں اور باریابی کی خواستگار ہوں۔“

شاہ دولہ نے اسے بلالیا۔ بچہ عورت کی گود میں تھا۔ وہ شاہ دولہ کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

شاہ دولہ نے کہا۔ ”تو تم آگئیں؟ حالانکہ شیطان نے تمہیں وسوسے میں ڈال دیا تھا۔“

عورت نے وہ بچہ آپ کی طرف بڑھا دیا۔ ”بچہ حاضر ہے مگر ایسا بچہ کیوں پیدا ہوا؟“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”عورت! جب میں نے یہ کہہ دیا ہے کہ خدا تمہیں اور بچے بھی دے گا تو تم اتنی پریشان کیوں ہو؟“

عورت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی! بچے کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔“

شاہ دولہ نے تسلی دی۔ ”عورت! میں کہہ جو رہا ہوں، خدا تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔“

عورت نے پوچھا۔ ”بچے کو میں پال پوس کر خانقاہ کے حوالے کروں یا اسی وقت؟“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”ہمارے لیے دونوں ہی صورتیں قابلِ قبول ہیں۔“

عورت اس بچے کو اپنے ساتھ واپس لے گئی۔ اسے خدا نے تین سال میں تین اولادِ نرینہ عطا کیں۔ وہ ہنسی خوشی اپنا پہلا بچہ خانقاہ کی نذر کر گئی۔

اس کے بعد یہ خبر مشہور ہوگئی اور شاہ دولہ کی خدمت میں ایسی عورتوں کی بھیڑ رہنے لگی جو اولاد کی خواہش مند ہوتی تھیں۔ آپ اولاد کی خواہش مند ہر عورت سے یہی کہتے اور، جہاں بھی آپ کی دعا سے بچہ پیدا ہوا، اس کی ہیئت یہی ہوتی۔ سر چھوٹا، زبان گنگ، مسلوب الحواس، مجذوب۔ یہ بچے موش شاہ دولہ یعنی شاہ دولہ کے چوہے کہے جانے لگے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

☆☆☆

شاہ دولہ کے عقیدت مندوں میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی تھے، عوام بھی اور خواص بھی۔ ان میں راجا چتر سیہ ملک راجوڑ بھی شامل تھا۔ یہ شاہ دولہ کی خدمت میں حاضری دیتا تو احتراماً آپ کے قدموں میں بیٹھا رہتا۔ آپ بھی راجا کا بڑا خیال رکھتے۔

راجا حسبِ دستور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

شاہ دولہ خلافِ عادت راجا کو دیکھتے رہے۔ راجا پریشان ہوگیا، پوچھا۔ ”حضرت! کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے جو آپ مجھ کو اس طرح دیکھ رہے ہیں؟“

شاہ دولہ نے پوچھا۔ ”راجا! تو میرے پاس کتنے عرصے سے آرہا ہے؟“

راجا نے جواب دیا۔ ”کافی عرصے سے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں نے تجھ سے ایک بار بھی تیرے خاندان اور آبائی رسم ورواج کے بارے میں کوئی سوال کیا کبھی؟“

راجا نے جواب دیا۔ ”ایک بار بھی نہیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تیرے خاندان میں نومولود بچیوں سے کیا سلوک کیا جاتا ہے؟“

راجا اس سوال کا جواب دینے میں متذبذب ہوا۔ آپ نے اسے تسلی دی، فرمایا۔ ”گھبرا نہیں، میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دے دے۔ بقیہ بات میں خود بتاؤں گا۔“

راجا نے جواب دیا۔ ”میاں جی! میرے ہاں صدیوں سے یہ طریقہ رائج چلا آرہا ہے کہ اگر لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اسے اسی وقت ہلاک کر دیا جاتا ہے۔“

آپ نے دریافت کیا۔ ”کیا تو بھی اس رسم پر عمل کرتا ہے؟“

راجا نے جواب دیا۔ ”میاں جی! میں باپ دادا کی رائج کردہ رسم کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟ کس طرح ترک کر سکتا ہوں؟ اگر میں اس پر نہیں چلوں گا تو خاندان کے لوگ مجھے خارج کر دیں گے۔“

آپ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے، گویا اپنے حال میں گم ہیں اور کسی کی کچھ سن ہی نہیں رہے، پھر پوچھا۔ ”اچھا راجا! خدا تیرا بھلا کرے، ایک بات اور بتا۔“

راجا نے کہا۔ ”ارشاد، پوچھیے۔“

شاہ دولہ نے پوچھا۔ ”تیرے گھر میں کچھ ہونے والا ہے کیا؟“

راجا نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، عنقریب بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اگر بچی پیدا ہوئی تو کیا کرے گا؟“

راجا نے جواب دیا۔ ”وہی جواب تک ہوتا رہا ہے۔ میں نے عرض جو کیا کہ میں اپنے باپ دادا کی رسم کو کس طرح بدل سکتا ہوں؟“

آپ نے ذرا سختی سے فرمایا۔ ”راجا! میری پیش گوئی سن لے۔ اس بار تیرے گھر میں لڑکی ہی پیدا ہوگی اور خبردار جو تم نے اسے ہلاک کیا۔ اس کو مارنا مت۔ اس کی پرورش کرنا۔“

راجا چپ ہو گیا لیکن اس کے چہرے سے اس کی ذہنی الجھن ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے عرض کیا۔ ”لیکن میں نے آپ کو بتایا نہیں کیا کہ اگر میں لڑکی کو ہلاک نہیں کروں گا تو خاندان کے لوگ مجھے پریوار سے نکال باہر کریں گے۔“

شاہ دولہ نے بڑے تحمل سے فرمایا۔ ”لیکن میں جو کہہ رہا ہوں کہ تو اس لڑکی کو نہیں ہلاک کرے گا کیونکہ یہ ایک راز ہے، قدرت کا راز۔“

راجا نے پریشانی سے کہا۔ ”لیکن حضرت! میں آپ کی بات ماننے کے بعد بھی بے بس ہی رہوں گا کیونکہ مجھ پر میرے پریوار کا دباؤ جو رہے گا۔“

شاہ دولہ نے فرمایا۔ ”راجا! تیری سمجھ میں میری باتیں نہیں آئیں گی۔ میں سر دست یہی کہوں گا کہ تو پیدا ہونے والی بچی کو ہلاک نہیں کرے گا۔“

راجا نے کہا۔ ”میاں جی! آپ نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ لڑکی نہ ماری جائے۔“

شاہ دولہ نے فرمایا۔ ”راجا! لڑکی پیدا ہو جائے تو اسے سب سے پہلے میرے پاس لانا۔ اس وقت میں تجھے بتاؤں گا کہ میں اس لڑکی کی سفارش کیوں کر رہا ہوں۔“

راجا چلا گیا لیکن اس کا ذہن بہت پراگندہ تھا۔ اس نے اس بات کا ذکر اپنی دھرم پتنی سے کیا، بولا۔ ”شاہ دولہ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس بار جو لڑکی گھر میں پیدا ہو، اس کو ہلاک نہ کرنا کیونکہ اس میں بھی ایک راز ہے۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”شاہ دولہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کو اپنے حال میں مگن رہنے دو اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو، ورنہ رشیوں کی بددعائیں ہمیں پریشان کر دیں گی۔“

جب دن پورے ہو گئے تو راجا پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگا۔ بیوی بہت خوش تھی اور شاہ دولہ کو دعائیں دے رہی تھی جنہوں نے راجا کو بچی کے قتل سے منع کر دیا تھا۔

گھر میں بچی پیدا ہوئی تو کہرام برپا ہو گیا۔ گھر کے سارے ہی افراد بچی کو ہلاک کرنے پر زور دے رہے تھے لیکن راجا نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اس نے کہا۔ ”میں اس لڑکی کو شاہ دولہ کی خدمت میں لیے جاتا ہوں۔ وہ جیسا حکم دیں گے، میں اس پر عمل کروں گا۔“

راجا کی ماں نے کہا۔ ”لیکن ایسا تو آج تک نہیں ہوا کہ بچی پیدا ہو اور اسے ہلاک نہ کیا جائے۔“

راجا نے جواب دیا۔ ”لیکن میں بھی کیا کروں؟ میں شاہ دولہ کی ہدایت پر بہر حال عمل کروں گا۔“

راجا نے اس بچی کو لیا اور سیدھا شاہ دولہ کی خدمت میں پہنچ گیا، بولا۔ ”میاں جی! یہ بچی پیدا ہوئی ہے۔ آپ سے وعدہ تھا اس لیے اسے نہیں مارا گیا۔ اب آپ فرمائیں کہ اس کا کیا کیا جائے؟“

یہ کہتے ہوئے راجا نے اس بچی کو شاہ دولہ کے قدموں میں ڈال دیا۔ انہوں نے اسے فوراً گود میں اٹھالیا، بولے۔ ”راجا! یہ تو کیا کرتا ہے۔ یہ بچی ایک بادشاہ کی بیوی اور کئی بادشاہوں کی ماں ہے۔ اس سے تیرا مرتبہ بھی بلند ہوگا اور ہم فقیروں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔“

راجا شاہ دولہ کی باتیں حیرت سے سنتا رہا، پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”بالکل سچ۔ اس کا نام کیا رکھا ہے؟“

راجا نے جواب دیا۔ ”شاہ جی! نام تو اس کا رکھا جاتا ہے جس کی پرورش کی جاتی ہے۔ اس کا کوئی نام نہیں۔“

شاہ دولہ نے فرمایا۔ ”یہ بائی ہے، عزت دار خاتون، میں نے اس کا نام بائی رکھ دیا۔“

راجا بہت خوش تھا، پوچھا۔ ”حضرت! اس بچی کی بابت مزید کیا حکم ہے؟“

آپ نے حکم دیا۔ ”اس کی شاندار طریقے سے پرورش کی جائے اور اسے کسی قسم کا بھی گزند نہ پہنچایا جائے۔“

راجا بچی کو واپس لے گیا اور اس کی بڑے نازونعم سے پرورش کی۔ لڑکی بالغ ہوگئی۔

یہ شاہجہاں کا عہدِ حکومت تھا۔ اس وقت شاہجہاں کی عمر انچاس سال تھی۔ بادشاہ کشمیر کی سیر کے لیے لاہور پہنچ چکا تھا۔ یہاں شہزادہ اورنگ زیب بھی موجود تھا اور یہیں آصف خان فالج کے مرض میں مبتلا پڑا ہوا تھا۔ آصف خان بادشاہ کی چہیتی مرحومہ بیوی ممتاز محل کا باپ اور ملکہ نور جہاں کا بھائی تھا۔ فالج نے اس کا دایاں حصہ بے کار کردیا تھا۔ یہ بادشاہ کی حکومت کا چوبیسواں سال تھا۔

قرب وجوار کے والیانِ ریاست اور امراء نے بادشاہ کی خدمت میں حاضریاں دیں اور نذرانے گزارے۔ انہی میں راجا ملک راجوڑ بھی شامل تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بیٹی بائی کو بھی لایا تھا۔ اس نے بائی کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کرتے ہوئے کہا۔ ”حضور! میرا یہ حقیر سا نذرانہ قبول فرمائیں۔“

بادشاہ نے یہ نذرانہ قبول تو کرلیا مگر ساتھ ہی فرمایا۔ ”اس وقت میری عمر انچاس برس ہے اس لیے یہ لڑکی میرے لیے مناسب نہیں ہے۔“ پھر شہزادہ اورنگ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، شہزادہ اس سے نکاح کرسکتا ہے۔“

بادشاہ نے نہایت سادگی سے بائی کا نکاح اورنگ زیب سے پڑھوادیا۔ اورنگ زیب ملتان سے لاہور پہنچا تھا۔ بیوی کو لے کر ملتان واپس چلا گیا۔

☆☆☆

آگرے میں شاہجہاں بیمار ہوا تو شہزادوں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ شہزادہ داراشکوہ ولی عہد تھا لیکن امیدواروں میں اورنگ زیب بھی تھا۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ اگر داراشکوہ بادشاہ بن گیا تو ملک میں ہندومت کو ترقی ہوگی اور اسلام روبہ زوال ہوجائے گا۔ اس نے اپنا یہ ارادہ کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ بائی سے یہ سن چکا تھا کہ شاہ دولہ نے سالوں پہلے یہ فرمایا تھا کہ بائی ایک بادشاہ کی بیوی اور کئی بادشاہوں کی ماں ہوگی چنانچہ اس کو کچھ کچھ یقین ہوگیا تھا کہ حکومت اسی کو ملے گی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک بار شاہ دولہ سے ملے گا اور ان سے صاف صاف معلوم کرے گا کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ بنے گا یا نہیں؟

اورنگ زیب نے ایک زرد مرغ، دو ولایتی بلیاں اور ایک لکڑی کی چھڑی لے کر گجرات کا رخ کیا۔ وہ یہ چیزیں شاہ دولہ کی نذر کرنا چاہتا تھا اور یہ سوچا تھا کہ اگر شاہ دولہ نے چھڑی اورنگ زیب کو واپس کردی تو وہ یہ سمجھے گا کہ عصائے حکومت اس کے ہاتھ آگیا۔ بیوی بائی اس کے ساتھ تھی۔

اورنگ زیب آپ کی خانقاہ میں پہنچا تو آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ”باہر جاؤ اور بادشاہ سلامت کو میرے پاس لے آؤ۔“

جب مریدوں نے باہر نکل کر یہ کہا کہ ”بادشاہ سلامت کو پیرومرشد شاہ دولہ یاد فرمارہے ہیں۔“ تو اورنگ زیب بہت خوش ہوا۔ اس نے تینوں چیزیں شاہ دولہ کی نذر کردیں۔ اسی وقت کسی نے شاہ صاحب کی خدمت میں ایک نان پیش کیا۔ شاہ دولہ نے اورنگ زیب کی چھڑی اور نان اس کی طرف بڑھادیے اور کہا۔ ”بادشاہ سلامت! یہ نان خدا کے حکم سے آپ ہی کے لیے بھیجی گئی ہے اور یہ چھڑی..... اس کو اپنے لیے عصائے حکمرانی سمجھیں اور اپنے پاس رکھیں۔“

اورنگ زیب وہاں زیادہ دیر نہیں رکا۔ واپسی میں اپنی بیوی بائی سے کہا۔ ”میں شاہ دولہ کو اتنا بڑا ولی نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے ان سے کچھ بھی نہیں پوچھا لیکن انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو میں ان سے جاننا یا سننا چاہتا تھا۔“

بائی نے جواب دیا۔ ''شہزادے! میں جس خاندان میں پیدا ہوئی تھی، وہاں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیا جاتا تھا مگر میری بابت شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ اسے نہ مارا جائے کیونکہ یہ ایک بادشاہ کی بیوی اور کئی بادشاہوں کی ماں ہے پھر جب میری آپ سے شادی ہوگئی تو مجھے یقین ہوگیا کہ آپ اس ملک کے بادشاہ ہوں گے اور میرے بیٹے بھی حکومت کریں گے۔''

اورنگ زیب کا بیٹا بہادر شاہ اول اسی بائی کا بیٹا تھا۔ اورنگ زیب مطمئن ہوکر اپنے فرائضِ منصبی انجام دینے لگا۔

☆☆☆

شاہجہاں بول و براز کے مرض میں مبتلا ہوا تو اس خطرناک اور اذیت رساں بیماری نے بادشاہ کو بستر پر گرادیا۔ شہزادوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ دارا شکوہ خود کو شاہجہاں کا ولی عہد اور قائم مقام سمجھتا تھا مگر اورنگ زیب نے اسے دعوتِ مقابلہ دی اور اسے ولی عہد ماننے سے انکار کردیا۔

دارا شکوہ نے یہ سن رکھا تھا کہ شاہ دولہ نے اورنگ زیب کو دعائیں دے رکھی ہیں۔ اس نے اپنے ایک معتمد ہندو بلبھ رائے کو ہدایت کی کہ وہ گجرات کے شاہ دولہ کے پاس جائے اور دارا شکوہ کے حق میں دعائیں حاصل کرے۔ بلبھ رائے خود بھی شاہ دولہ کا بڑا معتقد تھا۔ اسے شاہ صاحب نے سدا بسنت کا خطاب دے رکھا تھا۔

بلبھ رائے اپنے ولی نعمت کی ہدایت پر گجرات پہنچا اور شاہ دولہ کی خدمت میں حاضری دی۔

شاہ دولہ نے پوچھا۔ ''سدا بسنت! کہو کیسے آنا ہوا؟''

بلبھ رائے نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں شہزادہ دارا شکوہ کا نمک خوار ہوں اور خدا کے فضل سے شہزادہ ہی ہندوستان کا حقیقی ولی عہد اور مستقبل کا حکمراں ہے۔''

شاہ دولہ نے پوچھا۔ ''اس طرح تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

بلبھ رائے نے جواب دیا۔ ''شہزادہ دارا شکوہ کے حق میں دعائے فرماں روائی و حکمرانی۔''

شاہ دولہ نے فرمایا۔ ''لیکن یہ کام میرا تو نہیں ہے۔ کارکنانِ قضا و قدر کا ہے، میں کیا کرسکتا ہوں؟''

بلبھ رائے نے اصرار کیا۔ ''حضرت! آپ ایک بار اپنی زبان سے فرمادیں کہ دارا شکوہ بادشاہِ ہندوستان۔''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''لیکن میں یہ کس طرح کہہ دوں، ایک غلط بات کس طرح اپنی زبان سے ادا کروں۔ بھائی سدا بسنت! یہ حق اور مال ایک کلہ دار شخص کا ہے، یہاں دستار بندی و ولی عہدی کی کوئی گنجائش نہیں۔''

بلبھ رائے نے پھر اصرار کیا۔ ''حضرت! شہزادہ دارا شکوہ آپ کا حقیقی ارادت مند اور پرستار ہے۔ آپ ولی عہد کے حق میں ارشاد تو فرمائیں پھر دیکھیں اس کی عاجزی اور انکساری۔''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''بلبھ رائے! پختہ کار آدمی کو طمع خام کا آرزومند ہونا فائدہ نہیں دیتا۔''

بلبھ رائے نے شہزادہ دارا شکوہ کو مطلع کردیا کہ شاہ دولہ دعائیہ کلمات ادا کرنے سے انکار کررہے ہیں اور انہیں اس پر کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔

شہزادوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی اور اورنگ زیب نے سبھوں کو شکست دے کر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے نام سے مسندِ شاہی پر قدم رکھا۔

شاہ دولہ نے سیالکوٹ اور گجرات میں کئی مدرسے، مساجد، پُل اور عمارتیں بنوائیں، لنگر خانہ جاری کیا جہاں ہزاروں بھوکے دونوں وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ حاجت مندوں کا تانتا لگا رہتا اور آپ ہر کسی کی حاجت روائی فرماتے۔

آپ ایک عرصے تک انسانوں کی خدمات انجام دینے کے بعد میں وفات پاگئے۔

پنجاب کے شہر گجرات میں شاہ دولی دروازے کے باہر آپ کا مزار ہے۔ یہاں عام دنوں کے علاوہ جمعرات کو زائرین کی کثرت نظر آتی ہے اور اولاد کی خواہش مند عورتیں کاغذ کے پھول چڑھاتی ہیں۔

ماخذات

تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی۔ افضل الفوائد امیر خسرو۔ تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ حیات امیر خسرو، تلی محمد خورجوی۔ خسرو و شیریں بیان، اقبال صلاح الدین۔ بزم مملوکیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن۔



ابو سفیان ثوری

ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ کی رحمت اور محبت پر اگر انسان کا کامل ایمان اور مصیبتوں میں اس پر توکّل ہو تو بڑے سے بڑا امتحان بھی انسان دے سکتا ہے مگر اسی توکل اور محبت پر جو ذرا بھی غرور و تکبر میں مبتلا ہوا تو گویا اس نے خود ہی تباہی کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔ بس یہی وہ نکتہ تھا جسے سمجھنے اور سمجھانے میں ابو سفیان ثوری نے اپنی زندگی تمام کردی۔ آپ کو نہ شاہی رعب ودبدبے نے متاثر کیا اور نہ ہی شاہانہ نوازشوں اور عہدوں نے مرعوب کیا۔ آپ کا یہی استقلال بہت سے لوگوں کو مشتعل کردیتا تھا مگر آپ نے ثابت کردیا کہ صراط مستقیم پر چلنے والا کسی جلال اور اشتعال سے خوفزدہ نہیں ہوسکتا۔

اپنی عبادتوں کے قبول نہ ہونے کے خوف میں مبتلا ایک زاہد کا تقویٰ

کوفے میں سعید بن سروق علم حدیث میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی بیوی بھی زہد و تقویٰ میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ 96ھ میں ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ دونوں نے اس بچے کا نام سفیان رکھا۔ سفیان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی۔

باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ماں نے بڑی حوصلہ مندی دکھائی۔ معیشت کا مسئلہ چرخا کات کات کر حل کیا۔ سفیان کو یہ

دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی کہ ماں تو شب و روز کام کرتی رہیں اور سفیان ہر طرف سے بے نیاز ہو کر حصولِ علم میں لگے رہیں۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ بھی کام کریں۔ آخر ایک دن انہوں نے اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ''ماں! اب میں اس قابل ہوں کہ کام کر کے کچھ پیدا کروں۔''

ماں نے حیرت سے پوچھا۔ ''سفیان! کیا تجھے کوئی پریشانی لاحق ہے؟ اگر ہے تو بتا تاکہ میں اس کا حل بتاؤں۔''

سفیان نے جواب دیا۔ ''ہاں ماں میں بہت پریشان ہوں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے آپ کو محنت و مشقت میں مصروف دیکھ رہا ہوں چنانچہ میری خواہش ہے کہ اب آپ آرام کریں اور میں کام کروں۔''

ماں نے محبت سے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''سفیان! تجھے اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ بیٹے! میری یہ بات یاد رکھ کہ ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ پیٹ کے لیے کام دھندا یا دنیا اور آخرت کے لیے تحصیلِ علم۔ تو پہلے علم حاصل کرے گا، بعد میں کچھ اور کرے گا۔ میں چرخا کات کات کر تیرے اخراجات پورے کر رہی ہوں۔''

سفیان نے عرض کیا۔ ''ماں! میں تحصیلِ علم کے ساتھ ہی کام کاج بھی کر سکتا ہوں، آپ مجھ پر اعتبار کریں۔''

ماں نے بیٹے کو سمجھایا۔ ''سفیان! تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں تو اس علم کو بھی پسند نہیں کرتی جو وسیلہ روزگار بنے۔ میں تو اس علم کے حق میں ہوں جو تیرے اور مخلوق کے اخلاق و کردار کے سنورنے کا سبب بن جائے۔ یہ انسانوں کو بگاڑے نہیں، ایسا علم جو عبادت میں کام آئے، تجارت میں نہیں۔ وہ علم جو یار، مار نہ ہو۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

''اگر علم کو تن پروری کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ مہلک سانپ (یعنی زہر) ہے لیکن اگر اسے نفس کشی اور تزکیہ نفس کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ ایک محب صادق اور ہمدرد ساتھی ہے۔''

بیٹے نے پوچھا۔ ''ماں! مجھے یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ میں جو کچھ پڑھ رہا ہوں، اس کا مجھ پر اثر ہو بھی رہا ہے یا نہیں؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹے! جب تم اتنا علم حاصل کرلو کہ تم خود یہ محسوس کرنے لگو کہ ہاں تمہیں کچھ ملا ہے تو پھر اس بات کا اندازہ لگاؤ کہ اس سے تم میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہے یا نہیں، اگر یہ محسوس کرو کہ تم کچھ بدل گئے ہو تو یہ سمجھ لو کہ تم کامیاب ہو رہے ہو اور اگر یہ محسوس کرو کہ تم پہلے ہی جیسے ہو تو یہ سمجھ لینا کہ تمہاری محنت اکارت جا رہی ہے۔''

سفیان نے ماں کی نصیحتوں پر عمل پیرا ہو کر تحصیلِ علم شروع کر دی اور آپ کی علمیت کا شہرہ چہار دانگِ عالم میں ہو گیا۔ علوم کی تحصیل کے ساتھ ہی عبادت و ریاضت میں بھی محنت و مشقت جاری رہی۔ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا، اس پر عمل بھی کیا اور اس بات کی کوشش جاری رکھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث بھی سنیں اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔

سفیان نے ایک دن بے خیالی میں مسجد میں داخل ہوتے وقت الٹا پاؤں اندر رکھ دیا۔ اسی وقت ان کے کانوں میں کسی کی تہدید آمیز آواز آئی۔ ''اے ثور (بیل) یہ کیا گستاخی ہے، ذرا ہوش میں آ اور سیدھا پاؤں مسجد میں پہلے داخل کر۔''

سفیان اس آواز سے بے ہوش ہو گئے۔ نمازی حیرت زدہ تھے کہ یہ انہیں ہو کیا گیا۔ کئی آدمی انہیں اٹھا کر ایک طرف کنارے لے گئے اور ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب انہیں ہوش آیا تو ایک شخص نے پوچھا۔ ''سفیان! خیریت تو ہے؟ یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟''

سفیان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ کسی سے آنکھ بھی نہیں ملا رہے تھے۔ آپ کی خاموشی سے تنگ آ کر کسی نے پھر وہی سوال کیا۔ ''سفیان! یہ تم بے ہوش کیوں ہو گئے تھے؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''لوگو! میں برباد ہو گیا۔''

کسی نے پھر پوچھا۔ ''آخر ہوا کیا؟ کچھ بتاؤ تو سہی!''

سفیان نے ایک سرد آہ کھینچی اور جواب دیا۔ ''میں نے غلطی سے مسجد میں داخل ہوتے وقت الٹا پاؤں آگے بڑھا دیا تھا، اس پر کسی نے مجھے ڈانٹا کہ 'اے ثور! یہ کیا گستاخی ہے۔' جس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیشہ کے لیے میرا نام دفتر انسانیت سے خارج کر دیا گیا۔ لوگو! اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔''

لوگوں نے آپ کو بے حد سمجھایا لیکن آپ پر بدستور رقت طاری رہی اور ہفتوں زار و قطار روتے رہے۔ اس کے بعد

آپ کا نام ہی سفیان ثوری ہو گیا۔

ابھی آپ جوان ہی تھے کہ کمر جھک گئی اور کوبڑ نکل آیا۔ دیکھنے والے حیرت کرتے تھے کہ ایسا کیوں ہو گیا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آپ سے پوچھتا۔ ''حضرت! یہ آپ کی کمر قبل از وقت کیوں جھک گئی اور کوبڑ کیوں نکل آیا؟''

آپ کسی بیمار کی عیادت کو تشریف لے گئے تو بیمار آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ سے پوچھا۔ ''اے سفیان! اگر آپ محسوس نہ فرمائیں تو میں آپ سے ایک سوال کروں؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''تو شوق سے سوال کر، میں انسان سے نفرت نہیں ہوں۔''

مریض نے کہا۔ ''حضرت! ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ پھر یہ کمر قبل از وقت کیوں جھک گئی اور یہ کوبڑ کیوں نکل آیا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں یہ راز کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کو سامع میری تسلی پر محمول کرتا، مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ میرے استاد کی جب طبیعت بہت زیادہ خراب ہوئی اور امیدِ زیست باقی نہ رہی تو میں ان کی عیادت کو گیا۔ میں نے دیکھا وہ بہت آزردہ تھے۔ میں نے ان سے آزردگی کا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔ ''سفیان! میں نے پچاس سال تک بے لوث و بے ریا خدا کی عبادت کی لیکن ابھی کچھ دیر پہلے مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ تو ہماری بارگاہ کے قابل نہیں ہے۔''

مریض آپ کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

آپ نے ذرا سا سکوت اختیار کیا، پھر فرمایا۔ ''اسی طرح میرے تین استاد، جو حد درجہ عابد و زاہد تھے اپنی آخری عمر میں یہودی، نصرانی اور آتش پرست ہو گئے۔ مجھ پر ان واقعات نے اتنا شدید اثر کیا کہ مارے دکھ کے میں کبڑا ہو گیا اور میری کمر جھک گئی۔ اب میں ہر وقت سلامتی ایمان کی دعا مانگتا رہتا ہوں۔''

آپ علم حدیث میں یگانہ روزگار تھے۔ لوگ دور دور سے آپ کے پاس آتے اور آپ سے احادیث سن کر اپنی پیاس بجھاتے۔ آپ کسی سے نہ تو اس کا معاوضہ لیتے اور نہ ہی کسی قسم کا تحفہ قبول فرماتے۔

آپ کے ارادت مندوں میں سے ایک شخص نے آپ کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کیا اور بڑی عاجزی سے کہا۔ ''امید ہے کہ آپ اسے قبول فرما کر میرا دل رکھ لیں گے۔ اگر اسے قبول نہ کیا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''حضرت! آپ نے تو مجھے کبھی کوئی نصیحت تک نہیں کی جو یہ سمجھ لیا جائے کہ میں اس کا معاوضہ ادا کر رہا ہوں۔ پھر اس تحفے کو قبول نہ کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اے شخص! یہ درست ہے کہ میں نے تجھے کبھی کوئی نصیحت نہیں کی لیکن تیرے دوسرے مسلمان بھائیوں کو تو راستہ دکھا تا رہا ہوں۔ اگر میں تیرا تحفہ قبول کر لوں تو ہو سکتا ہے کہ میرے دل میں تیری رغبت پیدا ہو جائے اور اسی کا نام دنیا ہے لہٰذا میں خدا کے سوا کسی اور طرف راغب نہیں ہونا چاہتا۔''

وہ شخص اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ آپ نے اس کا تحفہ واپس کر دیا۔

آپ اپنے گھر میں سربسجود تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد آپ دروازے پر گئے اور دستک دینے والے سے پوچھا۔ ''اے شخص! خیریت تو ہے، تو پریشان کیوں ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ کے پڑوسی کا انتقال ہو چکا ہے آپ کو اس کے جنازے میں شرکت فرمانی ہے۔''

آپ اسی وقت اس شخص کے ساتھ ہو لیے۔

جنازے میں کافی لوگ تھے۔ جب جنازہ اٹھا تو آپ نے محسوس کیا مرحوم کی بڑی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ آپ اپنے پڑوسی سے اچھی طرح واقف تھے مرحوم کا ذکرِ خیر کرنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ بہت اچھا آدمی تھا حالانکہ وہ بہت برا آدمی تھا اور اس کی بداخلاقی سے کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔

آپ نے ذکر خیر کرنے والوں سے پوچھا۔ ''حضرات! کیا آپ اس شخص کو بہت قریب سے جانتے تھے؟''

ایک شخص نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں مرحوم کو بہت قریب سے جانتا تھا۔''

آپ نے درشت لہجے میں فرمایا۔ ''تو جھوٹا ہے، غلط بیانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔''

ان صاحب میں سے کسی نے کہا۔ ''حضرت! مرنے کے بعد تو تعریف کرنی ہی پڑتی ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''منافقت کی بابت تیری کیا رائے ہے؟''

صاحب خانہ نے جواب دیا۔ ''منافقت بہت ہی بری شے ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جب منافقت بہت بری چیز ہے تو تم لوگ اس کے مرتکب کیوں ہو رہے ہو؟ مرنے والا جیسا کچھ بھی تھا اس سے سبھی واقف ہیں۔ پھر اس کی جھوٹی تعریفیں کر کے خواہ مخواہ منافقت اختیار کرنا کہاں کی عقلمندی اور دین داری ہے۔ اگر بولنا ہی ہے تو سچ بولو، اور اگر مرحوم کے عیب چھپانا ہیں تو خاموش رہو۔ آخر میں بھی تو خاموش ہوں۔''

آپ کے طرز استدلال نے سب کو خاموش کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

آپ نے فرمایا۔ ''افسوس کہ اگر مجھے ان باتوں کا علم پہلے سے ہو جاتا تو میں یہاں نہ آتا کیونکہ میں ان جیسا نہیں بن سکتا۔''

آپ کی باتیں عام و خاص میں مشہور ہو رہی تھیں۔ امرا آپ سے خوش نہیں تھے۔ یہ امرا خلیفہ وقت کو بھی بدظن کرتے رہتے تھے۔ آپ کو کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔ آپ کو خشیت الٰہی کے علاوہ کسی کا بھی خوف نہیں تھا۔

آپ حج کے لیے جا رہے تھے دل پر خشیت الٰہی طاری تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہمسفر ان کی گریہ وزاری سے حیران تھے، جو ان سے واقف نہیں تھے وہ انہیں گناہ گار سمجھے۔ ایک نے آپ کو نصیحت کی۔ ''جناب! گناہ گار تو میں بھی ہوں لیکن میں آپ کی طرح آنسو نہیں بہاتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ حج کے بعد میرے سارے گناہ دھل جائیں گے اور میں پاک صاف ہو جاؤں گا۔''

آپ نے اس شخص کو حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ ''کیا تجھ کو یقین ہے کہ تیرا حج قبول ہو جائے گا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''اس میں شک وشبہ کی کیا بات ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ہم دونوں میں بس یہی فرق ہے کہ تجھے یہ یقین ہے کہ تیرا حج قبول ہو جائے گا اور مجھے اس امر میں شبہ ہے کہ میرا حج قبول بھی ہوگا یا نہیں کیونکہ مجھے یہی نہیں معلوم کہ میرے ایمان میں صداقت ہے یا نہیں۔ رہ گیا گناہوں کا معاملہ تو اس کی میں اس لیے فکر نہیں کرتا کہ رحمتِ خداوندی کے مقابلے میں گناہ ایک بے حقیقت سی شے ہے۔''

یہ جعفر منصور کا زمانہ تھا، عباسیوں کا باجبروت خلیفہ۔ اس کی علیت اور سیاست کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے بھی سفیان کی بابت بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس نے آپ کو طلب کیا تو آپ نے جانے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ کے آدمی نے کہا۔ ''حضرت! آپ چلے چلیں کیونکہ اسی میں آپ کی بہتری ہے، اگر نہیں جائیں گے تو امیر المومنین آپ کو جبراً بلوا لیں گے۔''

آپ مجبوراً چلے گئے لیکن یہ کہہ دیا کہ ''میں حق گوئی سے باز نہیں آؤں گا۔''

ابوجعفر منصور نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور سوال کیا۔ ''اے سفیان! تم میں وہ کیا چیز ہے جس پر تم اکڑتے پھرتے ہو؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''خود شناسی، لیکن میں اکڑا پھرتا ہوں، یہ غلط ہے۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''میں نے تو یہی سن رکھا ہے۔''

سفیان نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اس کی تردید جو کر رہا ہوں۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''خوش اخلاقی کی بابت تمہارا کیا خیال ہے؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جو خوش اخلاق نہیں، وہ ہم میں سے نہیں۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''پھر کبھی آپ نے اپنے اخلاق پر غور فرمایا؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''میرے اخلاق میں کیا کمی دیکھی تم نے؟''

ابوجعفر نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ میرے بلانے پر تم نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔''

سفیان نے جواب دیا۔ ''ہاں میں نے انکار کر دیا تھا کیونکہ تمہارے بلاوے میں بداخلاقی بھی تھی اور اکڑ بھی، حالانکہ اخلاق کا تقاضا یہ تھا کہ تم خود چل کر میرے پاس آتے۔''

حاضرین دربار میں سے کسی نے کہا۔ ''امیر المومنین! یہ گستاخ آپ سے کس بے ادبی سے باتیں کر رہا ہے۔ حکم دیجیے کہ اس کی گردن مار دی جائے۔''

ابوجعفر نے درباری کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ سفیان سے کہا۔ ''اگر میں تمہیں کوئی منصب دوں تو کیسا رہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں اسے قبول نہیں کروں گا کیونکہ میں نے دنیا کو چھوڑ رکھا ہے۔''
ابوجعفر نے جز بز ہو کر کہا۔ ''تم صوفیوں نے دین کو معلوم نہیں کیا سمجھ رکھا ہے۔ بہر حال اب تم جا سکتے ہو، مگر خبردار جو تم نے لوگوں کو ورغلایا اور میرے خلاف باتیں کیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''غیبت انسان کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ میں تیری برائی کر کے خود کو گناہ گار نہیں کروں گا۔''
آپ دربار سے واپس آئے تو آپ کے واقف کاروں نے آپ کو گھیرے میں لے لیا اور طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ ان میں ایک پڑوسی بھی تھا اور اس کو آپ نے ابوجعفر منصور کے دربار میں دیکھا تھا۔ اس شخص نے لوگوں کو بتایا کہ ''بڑی خیریت گزری ورنہ ربیع بن یونس نے تو امیر المومنین سے ان کے قتل کی اجازت طلب کر لی تھی۔''
سفیان نے پوچھا۔ ''تو وہاں کیوں گیا تھا؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں تو اس دربار سے وابستہ ہوں اور روز ہی حاضری دیتا ہوں۔''
آپ نے اسے نصیحت کی۔ ''خدا کا خوف کر۔ دربار کے گناہوں میں تو خوا مخواہ حصہ دار بن رہا ہے۔''
اس شخص نے عرض کیا۔ ''میاں جی! میں دربار کی وابستگی پر مجبور ہوں۔ عیال دار آدمی ہوں، بیوی بچوں کے لیے یہ سب گوارا کرنا پڑ رہا ہے۔''
آپ نے لوگوں کو مخاطب کیا۔ ''حضرات! آپ اس شخص کی باتیں سن رہے ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ اگر یہ خدا کی نافرمانی کرے گا تو اس کے بیوی بچوں کو روزی ملے گی اور جب اللہ کی فرمانبرداری کرے گا تو یہ اپنے بیوی بچوں سمیت ہلاک ہو جائے گا۔''
وہ شخص شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا۔ آپ نے حاضرین کو نصیحت کی۔ ''لوگو! کبھی کسی عیال دار کی اقتدا نہ کرنا۔ کیونکہ بہت کم عیال دار ایسے ہیں جو حرام کی آمیزش سے بچے ہیں اور مشتبہ اور حرام کے کمانے میں ہمیشہ ان کا یہی عذر ہوتا ہے کہ ہم بال بچے والے ہیں۔''

☆☆☆

جب آپ حج کے لیے جا رہے تھے تو اس قافلے میں ابوجعفر منصور بھی اپنے حشم و خدم کے ساتھ چل رہا تھا۔ مکہ کے قریب ان لوگوں نے قیام کیا۔ پھر اذان ہوئی اور نماز باجماعت کے لیے سفیان بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک میدان میں کھڑے ہوئے، ابوجعفر منصور بھی اس جماعت میں شامل تھا اتفاق کی بات کہ سفیان اور ابوجعفر منصور پاس پاس کھڑے ہوئے۔
نماز کے دوران ابوجعفر منصور نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ نماز کے خاتمہ پر سفیان نے ابوجعفر منصور سے کہا۔
''ابوجعفر! ایسی نماز قطعی بے حقیقت ہے اور قیامت کے روز یہ تیرے منہ پر ماردی جائے گی۔''
ابوجعفر نے انہیں ڈانٹا۔ ''سفیان! تم خاموش رہو، میں تمہاری باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''حق گوئی میں خاموشی کیسی؟''
ابوجعفر نے کہا۔ ''یہ حق گوئی نہیں گستاخی ہے۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ حق گوئی ہے لیکن تو جو خلیفہ بھی ہے اسے گستاخی سمجھ رہا ہے۔''
ابوجعفر اس وقت تو خاموش ہو گیا لیکن بعد میں حاضرین نے خلیفہ کو خوب بھرا اور کہا۔ ''اس طرح تو امیر المومنین کا رعب اور دبدبہ کم ہو جائے گا۔ سفیان اپنی صاف گوئی اور گستاخی کا ذکر اپنے پرستاروں میں کرے گا تو ان کے دلوں سے امیر المومنین کا رعب دور ہو جائے گا۔ لوگوں کی عبرت کے لیے سفیان کو عبرتناک سزا دینا ضروری ہے۔''
ابوجعفر دیر تک سفیان کے بارے میں سوچتا رہا اور غور کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سفیان کو سزا دینا ضروری ہے' اس نے اپنے جلاد کو بلایا اور کہا۔ ''صوفی سفیان ثوری کو میں قتل کرانا چاہتا ہوں۔''
جلاد نے مؤدبانہ عرض کیا۔ ''امیر المومنین کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں انہیں اسی وقت قتل کر دوں گا۔''
ابوجعفر نے کہا۔ ''لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ان کا خون زمین پر بہے۔''
جلاد نے عرض کیا۔ ''پھر انہیں کس طرح ہلاک کیا جائے؟''
ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''بڑھئی کو بلا، وہ ان کے لیے سولی کھڑی کرے گا اور تو سفیان کو پھانسی دے دے گا۔''

جلاد اسی وقت بڑھئی اور چند سپاہیوں کو لے کر سفیان کی تلاش میں نکل گیا۔
سفیان ایک خیمے میں اپنے ہم عصر دو مشہور صوفیوں کے ساتھ قیام فرما تھے۔ فضیل بن عیاض اور اپنے ہم نام سفیان عیینہ کے ساتھ جلاد انہیں تلاش کرتا ہوا جب ان کے خیمے میں پہنچا تو دیکھا سفیان ثوری سو رہے ہیں۔ ان کا سر فضیل بن عیاض کی ران پر اور دونوں پاؤں سفیان کی گود میں تھے۔
جلاد نے ان دونوں صاحبان سے کہا۔ ''حضرات! ہمیں خلیفہ نے سفیان ثوری کی تادیب کے لیے بھیجا ہے۔''
فضیل بن عیاض نے جواب دیا۔ ''ثوری ابھی سو رہے ہیں۔ انہیں بیدار ہو لینے دو۔''
جلاد نے اصرار کیا۔ ''جناب ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ انہیں بیدار کر دیجیے۔''
دونوں کی باتوں سے آپ کی آنکھ کھل گئی پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''
جلاد نے عرض کیا۔ ''جناب بڑھئی میرے ساتھ ہے اور امیر المومنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو گستاخی کی سزا دوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں وہاں آپ کو پھانسی دی جائے گی۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''بڑھئی سے کہہ سولی تیار کرے، میں آتا ہوں۔''
جلاد بڑھئی کے ساتھ باہر آ گیا اور سولی کھڑی کرنے لگا۔
سفیان نے کعبے کی طرف منہ کر کے اپنے رب کو مخاطب کیا۔ ''اے اللہ! کیا میں نے ابوجعفر سے واقعی گستاخی کی تھی؟ اگر میں نے غلطی کی ہے تو اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں لیکن اگر میں بے گناہ ہوں تو پھر مجھے اس سزا سے بچا۔''
جلاد اور بڑھئی ایک ساتھ خیمے میں داخل ہوئے اور سفیان کو مطلع کیا کہ ''سولی کھڑی کی جا چکی ہے۔ باہر چلیے تاکہ امیر المومنین کے حکم پر عمل کیا جائے۔''
آپ ان دونوں کے ساتھ باہر نکلے اور جلاد سے کہا۔ ''اگر میں تجھ سے یہ کہوں کہ مجھے سولی پر چڑھانے کا حکم دینے والا اللہ کے دربار میں طلب کیا جا چکا ہے کیونکہ میرا مقدمہ خدا کی عدالت میں پیش کیا جا چکا ہے۔''
جلاد نے کہا۔ ''آپ کچھ بھی کہیں میں آپ کو سولی پر چڑھا کر رہوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''نادان انسان! ضد نہ کر، اللہ نے تیرے امیر المومنین کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔''
جلاد ہنسا۔ ''آپ مجھ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''نادان! میں تجھ کو دھوکا نہیں دے رہا۔ خدا نے خلیفہ کی روح قبض کرائی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے جو تجھ سے جواب طلب کرے۔''
جلاد نے پوچھا۔ ''آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت کہ امیر المومنین اب اس دنیا میں نہیں ہیں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''تو ذرا دیر صبر کر اور توقف سے کام لے۔ میری بات کی صداقت کا تجھے خود ہی علم ہو جائے گا۔''
کچھ دیر بعد ہی چند گھڑسوار وہاں پہنچے اور جلاد کو مطلع کیا کہ ''امیر المومنین اچانک رحلت فرما گئے تم لوگ واپس چلو۔''
جلاد، بڑھئی اور سپاہی سفیان ثوری کے قدموں میں گر گئے۔ روتے ہوئے معافی مانگی۔ ''حضرت! ہم لوگ حکم کے پابند۔ جیسا حکم ملا تھا اس کی تعمیل کرنے آ گئے تھے۔ آپ ہمیں معاف فرما دیں۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ میری دعا ہے کہ خدا بھی تمہیں معاف کر دے۔''
خلیفہ ابوجعفر منصور کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے مہدی نے بار خلافت سنبھالا۔ سفیان کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، اس کا بڑا چرچا ہوا چنانچہ حج کے بعد جب آپ بغداد واپس پہنچے تو روپوشی اختیار کر لی کیونکہ انہیں یہ خبر مل چکی تھی کہ مہدی کو سفیان کی تلاش ہے۔
لوگوں نے پوچھا۔ ''سفیان! آپ مہدی سے چھپتے کیوں پھر رہے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''صرف اس لیے کہ وہ میرے سپرد کچھ خدمات نہ کر دے اور میں انہیں انجام نہ دے سکوں۔''
انہی میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو مہدی کے دربار میں آیا جایا کرتا تھا۔ آپ اس سے مہدی کا حال پوچھا کرتے تھے، وہ آپ کو ساری تفصیل سناتا رہتا تھا۔
ایک دن آپ نے اس شخص سے کہا۔ ''کیا تجھے مہدی کی صحبت میں کراہیت نہیں محسوس ہوتی؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں نے تو کبھی بھی کراہیت محسوس نہیں کی۔''
آپ نے فرمایا۔ ''لیکن میری بات یاد رکھ کہ مہدی کی بداعمالیوں میں تم سب کو شریک اور شامل سمجھا جائے گا۔''
اس شخص نے اپنے کانوں پر ہاتھ دھرے، بولا۔ ''واللہ میں مہدی کی بداعمالیوں سے بری ہوں، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔''
آپ نے غصے میں فرمایا۔ ''واللہ تو جھوٹا ہے کیا تو نے مہدی کی فضول خرچیاں نہیں دیکھیں؟ کیا تو نے اس کی قیمتی زرتار پوشاک پر اسے کبھی کچھ کہا؟ کیا تو نے مہدی سے یہ کہا کہ وہ اپنے نوکروں اور خدمت گاروں پر جو کچھ خرچ کررہا ہے وہ فضول خرچی ہے؟ کیا تو نے مہدی سے یہ کہا کہ وہ جو کچھ کررہا ہے ناجائز ہے اور بیت المال مسلمانوں کا ہے اور اس میں سے جو کچھ خرچ کیا جارہا ہے وہ خیانت ہے؟''
اس شخص نے کہا۔ ''بھلا یہ باتیں امیرالمومنین سے کون کہہ سکتا ہے؟''
آپ نے فرمایا۔ ''ہر وہ شخص کہہ سکتا ہے جو دولتِ ایمان سے مالا مال ہو۔''
اس شخص نے چڑ کر کہا۔ ''حضرت! پھر آپ ہی زحمت کریں اور خلیفہ سے یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ یوں بھی امیرالمومنین کو آپ کی بڑی تلاش ہے۔''
یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا، آپ نے فرمایا۔ ''اس شخص کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ میرا پتا مہدی کو ضرور بتادے گا اور کچھ دیر بعد اس کے آدمی میری تلاش یہاں تک آجائیں گے۔''
آپ کی بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ لوگوں نے مشورہ دیا۔ ''حضرت! آپ کہیں روپوش ہوجائیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''یہ وقت اظہار کلمہ الحق کا ہے۔ میں چھپ کر خود کو گناہ گار نہیں کروں گا۔''
کچھ دیر بعد خلیفہ کے سوار اور پیادے سفیان کو تلاش کرتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے اور کہا۔ ''حضرت! امیرالمومنین نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔''
آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں تم لوگوں کا انتظار ہی کررہا تھا، چلو چلتا ہوں۔''
آپ ان کے ساتھ مہدی کے دربار میں پہنچ گئے۔ وہاں وہ شخص بھی موجود تھا، وہ آپ کو دیکھ کر مسکرایا۔ آپ نے درباری آداب کو بالائے طاق رکھا اور السلام علیکم کہہ کر مہدی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔
مہدی نے وعلیکم السلام کہا۔ اس کے پیچھے وزیر برہنہ تلوار لیے کھڑا تھا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''امیرالمومنین حکم دیجیے کہ میں اس گستاخ کی گردن اڑادوں۔''
مہدی نے کہا۔ ''نہیں، میں نے انہیں اس لیے نہیں بلایا۔ ابھی تو میں ان سے چند باتیں کروں گا۔''
مہدی نے سفیان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''شیخ! لوگ کہتے ہیں کہ میرے والد ابوجعفر کا انتقال آپ کی بددعا سے ہوا۔ یہ بات کہاں تک سچ ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ بات غلط ہے کیونکہ میں نے اس کو کبھی بھی بددعا نہیں دی۔ وہ اللہ کی پکڑ کا شکار ہوگیا اور پھر اللہ کے ہاں کسی کا زور نہیں چلتا۔''
مہدی نے پوچھا۔ ''پھر آپ چھپتے کیوں پھر رہے تھے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''صرف اس لیے کہ میں دنیادار نہیں ہوں، اور دنیادار مجھ سے ازراہ حسد ناخوش ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ مجھے ذلیل وخوار کریں۔ ان حالات میں اگر وہ تیرے ذریعے مجھے ذلیل وخوار کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو تیرے نامہ اعمال میں کچھ گناہوں کا خوانخواہ اضافہ ہوجاتا۔''
مہدی نے کہا۔ ''اے سفیان! ایک بات اور۔ تم مجھ سے اِدھر اُدھر چھپتے پھرے لیکن اب تم میرے سامنے اور میرے قبضہ واختیار میں ہو۔ بتاؤ اب تم مجھ سے کس طرح بچ سکو گے۔ اب موقع ہے کہ میں تم سے تمہاری گستاخیوں کا انتقام لوں۔ تم میرے دربار میں کس طرح اکڑے ہوئے کھڑے ہو، تمہیں جلال شاہی کی کچھ بھی پروا نہیں۔''
سفیان ثوری نے جواب دیا۔ ''یہ درست ہے کہ تجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو مجھے قتل کردے یا چاہے تو مجھے چھوڑ دے۔ مگر یہ بھی یاد رکھ کہ ایک دوسرا حاکم بھی ہے جو تجھ سے ہی نہیں سب سے بڑا ہے۔ وہ زبردست قدرت والا عزیز ومنتقم ہے اور وہ حق وباطل میں بخوبی فیصلہ کرسکتا ہے۔''
وزیر نے آپ کا جواب سنا تو فرطِ غضب سے کانپنے لگا، بولا۔ ''امیرالمومنین! بے ادبی اور گستاخی کی حد ہوگئی، آخر تامل

کیوں۔ اس گستاخ اور بے ادب کے قتل کا حکم کیوں نہیں صادر فرماتے۔ میری برہنہ شمشیر اس کی گردن اتارنے کے لیے بے تاب ہے۔"

مہدی نے اپنے وزیر کی طرف دیکھا۔ "تم خاموش رہو اور میرے اور سفیان کے معاملے میں دخل مت دو۔ اگر میں ایسے انسانوں سے بدسلوکی کروں گا تو شقی اور ظالم کہلاؤں گا۔"

اس کے بعد مہدی نے اپنے حاجب سے ایک حکم نامہ لکھوایا۔ اس حکم کی رو سے سفیان ثوری کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا گیا تھا اور کوفے والوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ سفیان ثوری کے حکم کی بے چون و چرا تعمیل کریں۔ مہدی نے اس حکم نامہ پر دستخط کیے اور مہر خلافت ثبت کر کے سفیان کے حوالے کیا اور کہا۔ "اے سفیان! میری نظر میں تم اس منصب کے حق دار ہو اس لیے تم کو یہ منصب دے کر میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔"

سفیان ثوری حکم نامہ لے کر باہر نکلے، اسے پڑھا اور رونے لگے۔ بہ آواز بلند یہ حدیث پڑھی۔

"جو شخص لوگوں پر حاکم بنایا گیا وہ چھری کے بغیر ذبح کر دیا گیا۔"

آپ نے اس حکم نامہ کو پھاڑ کر دریائے دجلہ میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "خلیفہ مجھے قاضی بنا کر امامت کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈالنا چاہتا ہے اور مجھے عیوب اور جرائم کے جال میں پھنسانا چاہتا ہے۔"

اس کے بعد آپ روپوش ہو گئے۔ مہدی نے انہیں بہت تلاش کرایا۔ جب یہ نہیں ملے تو ان کی جگہ کسی اور کو قاضی کوفہ مقرر کر دیا۔

☆☆☆

کسی نے سفیان کو سمجھایا۔ "حضرت آپ اگر دربار سے راہ و رسم رکھیں تو اس سے مخلوق کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔ آپ ان کو ظلم کرنے سے باز رکھیں گے، نصیحتیں کریں گے اور ممنوعات سے روکیں گے۔"

آپ نے فرمایا۔ "خوب! گویا میں دریا میں کود کر اپنے آپ کو بھیگنے سے محفوظ رکھوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ دربار میں میری بڑی آؤ بھگت ہوگی اور میں ان کی طرف جھک جاؤں گا۔ اس طرح میں بھی انہی میں شامل ہو جاؤں گا۔"

ایک شخص نے آپ کے سامنے اپنی مصیبتوں کا رونا شروع کیا۔

آپ اس پر ناراض ہوئے اور فرمایا۔ "کیا تیری نظر میں مجھ سے زیادہ ذلیل کوئی اور نہیں تھا۔ جو اللہ کا شکوہ میرے سامنے شروع کر دیا۔ یہ جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے۔ اس پر صبر کر اور خدا کا شکر ادا کر، جس نے تجھ کو اتنے مصائب دیے کہ تو انہیں برداشت کرنے کا اہل نکلا۔"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ علما کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

ایک وہ جو اللہ اور اللہ کے حکم کا عالم ہوتا ہے۔ یہ اللہ سے ڈرتا ہے اور حدود کے اندر رہتا ہے۔

دوسرا وہ جو اللہ کا عالم تو ہوتا ہے مگر اس کے اوامر کا عالم نہیں ہوتا۔ یہ اللہ سے ڈرتا تو ہے مگر اس کے حدود سے تجاوز بھی کر جاتا ہے۔

تیسرا وہ جو اللہ کے احکام کا عالم تو ہوتا ہے مگر اللہ کا نہیں۔ یہ نہ تو اللہ سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اس کے حدود کا خیال رکھتا ہے۔

کسی ارادت مند نے آپ کی خدمت میں اشرفیوں کی دو تھیلیاں ارسال کیں اور یہ پیغام بھیجا کہ چونکہ آپ میرے والد کے دوست ہیں اور وہ فوت ہو چکے ہیں، ان کی ہدایت کے بموجب ان کی پاکیزہ کمائی میں یہ تھیلیاں ارسال ہیں۔ آپ ان کو اپنے اخراجات میں لائیے۔

آپ نے دونوں تھیلیاں واپس کر دیں اور جواب میں کہلا دیا۔ "صاحبزادے! آپ کے والد سے میرے تعلقات صرف دین کے لیے تھے، دنیا کے لیے نہیں، اس لیے تھیلیاں واپس ہیں۔"

آپ سفر کرتے ہوئے عقلان تشریف لے گئے۔ آپ وہاں تین دن تک رہے، اس دوران آپ کے پاس ایک شخص بھی ایسا نہیں آیا جو آپ سے کوئی مسئلہ پوچھتا۔ آپ کو اس پر بڑی حیرت ہوئی اور اپنے ساتھی سے فرمایا۔

"میرا اس شہر میں قیام ہو چکا۔ یہ عجیب شہر ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس شہر میں علم یا تو مر چکا ہے یا عنقریب مر جائے گا۔"

آپ نے عقلان کو چھوڑ دیا۔ واقعی عقلان سے کوئی عجوبہ روزگار ہستی نہیں اٹھی۔

ایک دن آپ نے ایک نوجوان کو دیکھا جو سرد آہیں بھرتا پھر رہا تھا۔ آپ نے اس کی آہ میں سوز محسوس کیا۔ اس کو روک کر پوچھا۔ ''نوجوان! یہ سرد آہیں کیوں بھرتے پھر رہے ہو؟ خیریت تو ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''اس کا تعلق میرے خدا سے ہے آپ کو میری آہ سے کیا غرض؟''

آپ نے فرمایا۔ ''بھائی! تیری آہ کی سوزش میں اپنے دل پر محسوس کررہا ہوں۔ میں تو اس آہ کا ترسا ہوا ہوں اور مدت العمر سے اس کی تمنا کررہا ہوں۔''

نوجوان خاموش ہو گیا۔

آپ نے فرمایا۔ ''نوجوان! میں نے چار حج کیے ہیں، میں ان چار حجوں کا اجر تجھ کو دینے پر تیار ہوں، اگر تو اپنی آہ کا اجر مجھے دیدے۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے؟ کیا دو اجروں کا تبادلہ ممکن ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''سادہ لوح نوجوان! بس تو ہاں کردے، بقیہ کام میرا ہے۔''

نوجوان نے سادگی سے جواب دیا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں، اگر ایسا ممکن ہو۔''

آپ اسی وقت وضو کر کے مصلے پر بیٹھ گئے اور رو رو کر، گڑگڑا گڑگڑا کر بارگاہ رب العزت میں عرض کرنے لگے۔ ''رب العالمین! میں اس نوجوان جیسی آہ کا ترسا ہوا ہوں۔ یہ نوجوان مجھے چار حجوں کے تبادلے میں اپنی آہ کا اجر دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ خدایا اس تبادلے کو ممکن بنادے۔''

وہ دیر تک روتے گڑگڑاتے رہے، آخر انہیں کچھ ایسا محسوس ہوا گویا ان کے دل کو قرار آ گیا ہے اور اضطراب دور ہو گیا، خوشی میں چلائے۔ ''خدا نے میری دعا قبول کرلی، اب میں خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی۔''

نوجوان سرد آہ بھرتا ہوا کہیں چلا گیا۔ آپ اس سے بہت متاثر ہوئے۔

آپ نے شادی کرلی اور چند سالوں میں صاحب اولاد بھی ہو گئے لیکن آپ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کھانے کے لیے بیٹھتے تو اپنے پالتو کتے کو اپنے سامنے بٹھالیتے اور اس کو روٹی کے ٹکڑے ڈالتے رہتے۔ پہلے کتا کھاتا اس کے بعد خود کھاتے۔ لوگ یہ عجیب و غریب تماشا دیکھتے لیکن خاموش رہتے کیونکہ وہ سفیان سے سوال جواب کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

آپ کے ایک عزیز نے جو یہ منظر دیکھا تو ان کی بیوی سے پوچھا۔ ''آخر سفیان تم لوگوں کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''یہ سوال انہی سے کرو، وہی اس کا جواب دیں گے۔''

عزیز نے کہا۔ ''آخر کبھی تو اس موضوع پر سفیان سے بات ہوتی ہو گی؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس موضوع پر اس گھر میں کسی نے بھی کوئی بات نہیں کی۔''

یہ عزیز سفیان کے پاس پہنچ گیا اور انہیں شرمندہ کرنے کی غرض سے بولا۔ ''سفیان! میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس کا جواب دیں گے؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''ضرور جواب دوں گا کرو سوال۔'' عزیز نے کہا۔ ''میں کیا ایک زمانہ یہ عجیب و غریب منظر ہر روز دیکھتا ہے کہ آپ کھانے میں ایک کتے کو تو شریک فرمالیتے ہیں لیکن بیوی بچوں کو شامل نہیں کرتے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''بھائی میرے! میری بیوی بچے میری عبادت میں حارج ہوتے ہیں جبکہ یہ کتا مجھ سے چند لقمے حاصل کر کے میری نگہبانی کرتا ہے اور میں بے فکری سے خدا کی عبادت میں مشغول رہتا ہوں۔''

آپ کے اس جواب نے اس شخص کو لاجواب کردیا۔ وہ منہ لٹکا کر آپ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

آپ کے پاس لوگ طرح طرح کے سوالوں کے ساتھ آتے اور جوابوں سے مطمئن ہو کر واپس چلے جاتے۔ کئی شخص دور دراز کا سفر کر کے آپ کے پاس آئے اور سوالات کرنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیا کوئی بادشاہ کسی زاہد سے بلند مرتبہ ہو سکتا ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''بالکل ہو سکتا ہے۔ زہاد کی صحبت اختیار کرنے والا بادشاہ اس زاہد سے بہتر ہے جس کو بادشاہ کا قرب حاصل ہو۔''

دوسرے نے سوال کیا۔ ''مخلوق میں کون لوگ مقبول ہوتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''پانچ قسم کے لوگ زیادہ ہر دلعزیز ہوتے ہیں۔ اول زاہد عالم، دوم فقیہہ صوفی، سوئم متواضع

تونگر، چہارم شاکر درویش، پنجم شریف سخی۔''
ایک شخص نے سوال کیا۔''انسان کس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے؟''
جواب دیا۔''اس کو جو زیادہ زخم لگاتا ہے اور اس کی دولت پر قابض ہو جاتا ہے۔''
ایک شخص نے پوچھا۔''یقین کا مفہوم کیا ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔''قلبی آواز کا نام یقین ہے۔ اہلِ یقین معرفت تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور یقین کا یہ مفہوم بھی ہے کہ ہر مصیبت کو منجانب اللہ تصور کرے۔''
کسی شخص نے پوچھا۔''رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ زیادہ گوشت خوروں کو خدا دشمن تصور فرماتا ہے آخر اس کا کیا مطلب ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔''یہاں گوشت سے مراد غیبت ہے۔ کیونکہ مسلمان کی غیبت کرنا ایسا ہے جیسے کسی نے مردار گوشت کھا لیا ہو اور اہل غیبت کو اللہ دشمن خیال کرتا ہے۔''
آپ نے اپنے ہم عصر ایک دوسرے صوفی سے فرمایا۔''حاتم! میں تمہیں چار چیزوں سے آگاہ کرتا ہوں جن کو لوگوں نے اپنی غفلت کی وجہ سے بھلا دیا ہے۔ اول یہ کہ لوگوں پر اتہام لگا کر برا بھلا کہنا۔ اس سے انسان احکام خداوندی سے غافل ہو جاتا ہے۔ دوم کسی مومن کے عروج پر حسد کرنا۔ یہ ناشکری کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ سوم ناجائز دولت جمع کرنا۔ اس سے انسان اپنی آخرت کو فراموش کر دیتا ہے۔ چہارم خدا کے ڈراوؤں سے خوفزدہ نہ ہونا۔ اس کے وعدوں سے مایوسی کا اظہار کرنا، اس سے کفر عائد ہو جاتا ہے اور یہ ساری چیزیں بہت ہی بری ہیں۔''
آپ ظہر کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ کے ساتھ آپ کے ارادت مند بھی تھے۔ انہوں نے ایک جگہ ایک سپاہی کو سویا ہوا دیکھا۔ کسی ارادت مند نے عرض کیا۔''یا شیخ! یہ سپاہی سویا ہوا ہے اور ظہر کی نماز کا وقت ہے۔ اگر اس کو جگا دیا جائے تو یہ بھی نماز باجماعت ادا کر لے گا۔''
آپ نے اسے منع کر دیا، فرمایا۔''اسے مت جگاؤ، سونے دو کیونکہ یہی اس کی عبادت ہے۔ اگر یہ جاگ گیا تو خلوق کو ستانا شروع کر دے گا۔''
کسی نے آپ سے کہا۔''سفیان! لوگ چلے گئے اور ہم پسماندہ گدھوں پر پیچھے رہ گئے۔''
آپ نے جواب دیا۔''یہ بھی بہت اچھے ہیں بشرطیکہ راہ پر ہوں۔''
آپ نے اپنے ایک ارادت مند کو خط میں لکھا۔
''بھائی جان! دیکھو اپنے آپ کو امیروں کے پاس جانے اور کسی چیز میں ان سے خلط ملط کرنے سے بچاؤ۔ تم سے کہا جائے گا کہ تم امیروں کی محبت میں رہ کر کمزوروں کی سعی سفارش کرو گے۔ کسی مظلوم کو بچا لو گے یا کسی ظلم کو موقوف کرا دو گے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ شیطان کے دھوکے ہیں۔ مولویوں نے اس فقرے کو امیروں سے نزدیک ہونے کی سیڑھی اور دنیا کو شکار کرنے کی وجہ بنایا ہے۔
اگر لوگوں کی نسبت مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ان کو علم سے خدا مقصود ہے تو میں ان کے گھروں میں جا کر علم سکھاتا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ان کا علم مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو پھسلائیں، لوگوں کو بہلائیں۔ وہ ہر جگہ یہی کہیں گے کہ حدثنا سفیان (حدیث بیان کی ہم سے سفیان نے) لیکن جب ان سے یہ کہا جائے کہ حدیث بیان کیجیے تو کہتے ہیں کہ نہ تو میں تم سے حدیث سننے کا اہل پاتا ہوں اور نہ ہی خود کو حدیث بیان کرنے کے لائق سمجھتا ہوں۔''
بخارا میں کوئی عزیز آپ کا فوت ہوا۔ اس کا ورثہ شرعی طور پر آپ کو پہنچتا تھا۔ قاضی نے مال وراثت امانتاً جمع کر کے آپ کو اطلاع بھجوا دی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ آپ اس ورثے کو قبول نہیں کریں گے مگر آپ بخارا روانہ ہو گئے۔ جب بخارا میں داخل ہوئے تو لوگوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور قاضی نے وہ مال آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے اس مال کو بیچ کر اشرفیاں لے لیں اور انہیں لے کر واپس چلے آئے۔
لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ حضرت زندگی بھر مال و زر کی مخالفت اور مذمت کرتے چلے آئے ہیں اور اب اشرفیوں کے دل دادہ ہو رہے ہیں۔
آپ نے جواب دیا۔''اس وقت میں اس کا جواب نہیں دوں گا لیکن وقت آنے پر اس کا جواب دوں گا ضرور۔''

آپ کے مخالفین نے طنزاً کہا۔ ''یہ ساری فضول باتیں ہیں ورنہ حقیقتاً آپ کے پاس اس کا کوئی جواب ہے ہی نہیں۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''صاحبان! ایسی بات نہیں ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا جواب وقت آنے پر دوں گا۔ آپ لوگ خوامخواہ بدظن نہ ہوں۔''
لوگ خاموش ہو گئے اور وقت کا انتظار کرنے لگے۔ آپ بصرے کے بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک دکان پر پرندے کو پنجرے میں بند دیکھا جو آپ کو دیکھ کر زور زور سے بولنے لگا۔ آپ دکان پر گئے اور پرندے سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''
وہ اور زور سے بولنے لگا۔
آپ نے دکاندار سے درخواست کی۔ ''بھائی! یہ پرندہ فریاد کر رہا ہے اس کو رہا کر دے۔''
دکاندار نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کو بڑے شوق سے پالا ہے پھر رہا کیوں کر دوں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''مجھ سے اس کی قیمت لے لے اور اسے آزاد کر دے۔''
کسی دوسرے دکاندار نے اس دکاندار سے پوچھا۔ ''کیا تو ان بزرگ کو جانتا ہے؟''
دکاندار نے نفی میں گردن ہلائی، جواب دیا۔ ''نہیں، میں ان سے واقف نہیں ہوں۔''
دوسرے دکاندار نے کہا۔ ''یہ سفیان ثوری ہیں۔ اس عہد کے نامور صوفی اور عالم حدیث۔''
دکاندار مرعوب ہو گیا اور اس نے پرندے کو اسی وقت رہا کر دیا۔ پرندہ اڑ کر دکان کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور سفیان کی طرف دیکھ کر آوازیں نکالنے لگا۔
آپ نے دکاندار سے پوچھا۔ ''اس پرندے کی قیمت بتا تاکہ میں ادا کر دوں۔''
دکاندار نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ مزید شرمندہ نہ کیجیے۔ جب تک میں آپ کو جانتا نہ تھا اس وقت یہ بات مجھے زیب دیتی تھی لیکن اب ایسی بات سوچنا تک میرے لیے گناہ ہے۔''
دکاندار نے آپ سے پرندے کی قیمت نہیں لی۔ پرندہ... کچھ دیر منڈیر پر بیٹھا رہا اس کے بعد اڑ گیا۔
سفیان نے اس پرندے کو اس وقت پھر دیکھا جب آپ وضو کر رہے تھے۔ جب تک آپ وضو کرتے رہے، وہ پرندہ دیوار پر بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ ہر اس وقت حاضر ہو جاتا جب آپ وضو کر رہے ہوتے۔

☆☆☆

جب کوئی آپ سے یہ کہتا کہ حضرت میں سفر پر جا رہا ہوں۔
تو آپ اس سے فرماتے کہ ''دیکھو اگر کہیں موت مل جائے تو میرے لیے خرید لینا۔''
آخری دنوں میں آپ کو پیچش کا عارضہ ہو گیا تھا۔ کسی نے حاکم بصرہ کو آپ کی بیماری سے مطلع کیا۔ حاکم بصرہ نے آپ کی تلاش شروع کر دی۔ آخر آپ کو حاکم بصرہ کے آدمیوں نے مویشیوں کے باڑے میں پایا۔ ان آدمیوں نے کہا۔ ''اے سفیان! آپ کو حاکم بصرہ نے بلوایا ہے۔ وہ آپ کا علاج کرانا چاہتا ہے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں زندگی بھر درباروں سرکاروں سے دور رہا ہوں۔ اب آخر وقت میں حاکم بصرہ کے پاس جا کر کیا کروں گا۔''
اس وقت آپ کی یہ حالت تھی کہ پیچش کی مروڑ آپ کو بہت زیادہ کرب میں مبتلا کیے ہوئے تھی اور آپ بار بار بیت الخلا جا رہے تھے۔ جب بیت الخلا سے نکلتے، وضو کرنے بیٹھ جاتے اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ لوگوں نے آپ سے کہا۔ ''حضرت! آپ کی حالت بہت نازک ہے اگر بار بار وضو نہ کریں تو یہ بہتر ہے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس لیے بار بار وضو کر رہا ہوں کہ کچھ پتا نہیں کس وقت خدا کے حضور طلبی ہو جائے اور میں بغیر وضو کے وہاں پہنچ جاؤں۔''
اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ ''لوگو! میں ہمیشہ موت کا خواہش مند رہتا تھا مگر آج معلوم ہوا کہ موت کتنی کٹھن اور اذیت ناک چیز ہے۔ لاٹھی ٹیک کر دنیا بھر میں سفر کرنے سے دشوار چیز موت ہے۔''
لوگوں نے کہا۔ ''حضرت! آپ کو کس بات کی فکر، جنت مبارک ہو۔''
آپ نے فرمایا۔ ''جنت کے مستحق تو اور ہی لوگ ہوں گے۔ میری وہاں تک رسائی کہاں؟''

ایک صوفی عبداللہ بن مہدی اس وقت آپ کے پاس ہی تھے۔ جب آپ حرکت کرنے کے قابل بھی نہ رہے تو عبداللہ سے کہا۔ ''اے ابن مہدی! میرا چہرہ زمین پر رکھ دو۔''

عبداللہ بن مہدی کا رقت سے برا حال ہو رہا تھا، روتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ ایسی خواہش کیوں کر رہے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اب میرا وقت بالکل قریب ہے۔''

عبداللہ بن مہدی نے آپ کا چہرہ زمین پر رکھ دیا اور آپ کے ارادت مندوں کو اطلاع دینے باہر چلے گئے۔ انہوں نے باہر نکل کر دیکھا تو وہاں ایک ہجوم نظر آیا۔ عبداللہ بن مہدی کو ان آنے والوں پر حیرت تھی، پوچھا۔ ''آپ لوگ یہاں کیوں اور کس کے پاس آئے ہیں؟''

ان لوگوں نے جواب دیا۔ ''جناب! ہمیں خواب میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ یہ سفیان ثوری کا آخری وقت ہے ان کے پاس پہنچ جاؤ۔''

عبداللہ بن مہدی نے ان سب کو اندر بلا لیا۔ اس وقت سفیان کی حالت بہت زیادہ نازک ہو چکی تھی۔

آپ نے بدقت تکیے کے نیچے سے اشرفیوں کی تھیلی نکالی اور عبداللہ ابن مہدی سے فرمایا۔ ''انہیں حاجت مندوں میں تقسیم کر دو۔''

ان میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو سفیان سے اختلاف رکھتے تھے مگر بادل ناخواستہ حاضر ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے آہستہ سے کہا۔ ''حضرت! آپ تو زندگی بھر دوسروں کو دولت جمع کرنے سے منع فرماتے رہے اور خود آپ نے اتنی ساری اشرفیاں جمع کر رکھی ہیں؟''

آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ''دوستو! یہ وہی اشرفیاں ہیں جو مجھے بخارا کے ایک متوفی کے ورثے سے ملی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک اشرفی بھی خرچ نہیں کی اور ان سے ایمان کے تحفظ کا کام لیا ہے کیونکہ جب شیطان مجھے ورغلاتا تھا کہ اب تم کہاں سے کھاؤ گے تو میں جواب دیتا کہ میرے پاس اشرفیاں موجود ہیں۔ جب شیطان مجھ سے کہتا کہ تمہیں کفن کہاں سے نصیب ہوگا۔ اس وقت بھی میں یہی جواب دیتا کہ میرے پاس اشرفیاں جو موجود ہیں۔ حالانکہ مجھے ان اشرفیوں کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن شیطانی وسوسوں سے نجات پانے کے لیے میں نے انہیں اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا۔''

باتیں کرتے ہی کرتے آپ نے ذرا سا سکوت اختیار کیا پھر کلمہ پڑھا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

جب آپ کا جنازہ اٹھا تو آزاد کیا ہوا پرندہ اچانک ایک طرف سے نمودار ہوا اور جنازے کے اوپر پرواز کرتا رہا پھر جب آپ کی تدفین عمل میں آ گئی تو وہ پرندہ آپ کے مزار ہی پر رہنے لگا۔

☆☆☆

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ ان کے فضل و کمال کے بے حد معترف تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر سفیان ابراہیم نخعیؒ (ابوحنیفہ کے استاد الاساتذہ) کے زمانے میں ہوتے تب بھی لوگ حدیث میں سفیان کے محتاج ہوتے۔''

امام احمد بن حنبلؒ بھی ان کے علم و فضل کے بڑے معترف تھے، کسی نے پوچھا۔ ''سفیان ثوری احفظ تھے یا سفیان عینیہ؟''

جواب دیا۔ ''سفیان ثوری احفظ تھے اور بہت کم غلطی کرتے تھے اور سفیان عینیہ حافظ تھے۔''

امام مالکؒ فرماتے تھے۔ ''عراق نے ہم پر درہم و دینار کی بارش کی لیکن اس نے سفیان ثوری کے بعد علم کی بارش شروع کر دی۔''

چونکہ آپ شریعت و طریقت میں کامل اور علوم و رسالت کے وارث تھے اسی وجہ سے لوگوں نے آپ کو امیرالمومنین کا خطاب دے دیا تھا۔

ماخذ

تاریخ اسلام	تمدن عرب	تاریخ ایران	تاریخ الخلفاء	قرون وسطیٰ اسلام	تاریخ فرشتہ
اکبر شاہ خان نجیب آبادی	ڈاکٹر گستاؤلی بان	مقبول بیگ بدخشانی	جلال الدین سیوطی	اسٹینلے لین پول	محمد قاسم فرشتہ

سلطان باہو علیہ الرحمۃ اللہ

ضیا تسنیم بلگرامی

کہتے ہیں کہ دولت تلاش کرنے والے لوگ اپنے باہر کے ماحول میں جستجو رکھتے ہیں جبکہ رشتوں کا احساس ڈھونڈنے والے اپنے اندر کی دنیا میں سفر کرتے ہیں۔ سلطان باہو کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ہونے کا احساس اور وجہ پانے کی جستجو میں اپنے معبود برحق کی رضا کو پالیا۔ اگرچہ یہ سفر آسان نہ تھا مگر جنہیں اللہ تعالیٰ اپنی محبتوں اور عنایتوں کے لیے چن لیتا ہے ان کے لیے ہر مشکل کو آسان بھی کردیتا ہے۔ لہٰذا آپ کے لیے بھی ہر مشکل راحت میں بدلتی گئی اور دنیا حیران ہوتی گئی۔

شکم مادر ہی میں ولایت سے سرفراز ہونے والے
ولی کا قصہ



برصغیر میں دریائے اٹک کے کنارے کالا باغ میں آباد ہونے والے اعوان خاندان کے کچھ لوگ پنڈ دادن خان اور احمد آباد میں مقامی کافروں سے معرکہ آرا ہوئے اور انہیں شکستیں بھی دیں اور حلقہ بگوش اسلام بھی کیا۔ یہاں تک کہ مغل فرماں روا شاہجہاں کا زمانہ آیا تو اس دین دار بادشاہ نے ان کی بڑی عزت کی اور انہیں مناصب اور عہدے دے کر شادماں وخوشحال کردیا۔

اعوان خاندان کے ایک بزرگ بازید محمد، شاہجہاں کے منصب داروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ بازید محمد کی نیکی اور علمیت کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ متبع شریعت فقیہہ اور عالم بھی تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان ہی کی ایک دین دار خاتون بی بی راستی سے شادی کرلی۔ بادشاہ نے انہیں کوہستان کا منصب دار بنا دیا۔ یہ کچھ عرصہ یہاں رہے پھر ملتان بھیج دیے گئے۔ ملتان میں ان کا دل لگ گیا۔ بادشاہ نے ایک بار پھر انہیں کوہستان بھیجنا چاہا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ ان سے بے حد خوش تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے انہیں شورکوٹ ضلع جھنگ میں ایک سالم گاؤں قہرگان اور پچاس بیگھہ زمین چند آباد کنوئیں بطور انعام دیے اور آخرکار بازید محمد نے یہیں سکونت اختیار کرلی۔

شورکوٹ میں آئے ہوئے انہیں زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ 1039ھ کا ذکر ہے۔ ماں نے اپنے بیٹے کا نام معلوم نہیں کیوں سلطان محمد باہو رکھ دیا۔ ولادت کے کچھ دنوں بعد بازید محمد کا انتقال ہو گیا اور سلطان محمد باہو کی ساری ذمے داری بی بی راستی پر آن پڑی۔

رمضان شریف کا مہینا آیا تو انہوں نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ انہیں اپنے بچے کا بڑا خیال تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ روزے رکھیں گی تو دودھ کم ہو جائے گا اور ان کا بیٹا بھوکا رہے گا مگر انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ شیرخوار سلطان محمد باہو دن میں دودھ نہیں پیتا لیکن افطار کے وقت ضرور پیتا ہے۔ بی بی راستی کئی دن تک یہ تبدیلی محسوس کرتی رہیں اور اس نتیجے پر پہنچیں کہ ان کا بیٹا مادرزاد ولی ہے جو ایام شیرخوارگی میں بھی روزے رکھ رہا ہے۔

جب سلطان باہو نے ہوش سنبھالا تو انہیں پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ ماں نے ان پر غیر معمولی توجہ دی اور لائق ترین اساتذہ کی نگرانی میں دے دیا۔ بہت جلد سلطان باہو کا شمار عالموں میں ہونے لگا۔ والدہ نے اپنے بیٹے میں ایک خاص بات یہ محسوس کی کہ یہ گھنٹوں مست و مستغرق بیٹھے رہتے اور کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ ماں اپنے بیٹے کی اس کیفیت کو بغور محسوس کر رہی تھیں۔ رات کو بیٹا ان کے قریب ہی سوتا تھا۔ ماں دیکھتیں کہ سلطان باہو بظاہر تو سو رہے ہیں مگر ذرا سی بھی آہٹ پر چونک کر دیکھنے لگتے۔

سلطان باہو عشا کی نماز پڑھ کر وظیفہ پڑھنے لگے۔ اس مشغلے میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ انہوں نے عالم رویا میں دیکھا۔ ایک بزرگ ان کے پاس آئے اور کہا۔ ''باہو! یہاں کیا کر رہا ہے، میرے ساتھ چل۔''

سلطان باہو نے پوچھا۔ ''کہاں؟''

جواب ملا۔ ''وہاں جہاں کی لوگ آرزو کرتے ہیں مگر نہیں پہنچ پاتے۔''

باہو نے پھر سوال کیا۔ ''آخر کہاں؟''

پھر جواب ملا۔ ''اگر تجھ سے یہ پوچھا جائے کہ تیرے دل میں سب سے زیادہ کس کی چاہ ہے اور تو کس کا دیدار کرنا چاہتا ہے تو کیا جواب دے گا؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''آپ کے سوال کا ایک ہی جواب ہے۔ میں عاشق صادق ہوں اور میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مجھے رسول مقبول ﷺ کا دیدار میسر آجائے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔''

ان بزرگ نے فرمایا۔ ''اس وقت میں تجھ کو وہیں لے جانا چاہتا ہوں۔ بس اب دیر نہ کر۔ اٹھ اور میرے ساتھ ہو لے۔ تیری تمنا اسی وقت پوری ہو جائے گی۔''

سلطان باہو کے پورے وجود پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔ وہ ان بزرگ کے ساتھ ہو لیے اور ان کے پیچھے پیچھے یوں چلنے لگے کہ پاؤں رکھتے کہیں تھے اور پڑتے کہیں تھے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کے کانوں نے جو کچھ سنا ہے، وہ سچ ہے۔

کچھ دیر بعد وہ بزرگ سلطان باہو کو ایک ایسے دربار میں لے گئے جہاں ایک ہجوم پھیلا ہوا تھا اور اس ہجوم میں جو نورانی شکل موجود تھی، ان کے چہرے کا جاہ و جلال اور باوقار جمال سلطان باہو کو مرعوب کرنے لگا۔ انہوں نے اس نورانی پیکر کو دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

ان بزرگ نے سلطان باہو کو حکم دیا۔ ''باہو! یہ دربار نبوی ﷺ ہے۔ مؤدب ایک طرف کھڑا ہو جا اور انتظار کر کہ تیری بابت کیا حکم ہوتا ہے۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔''

سلطان باہو دہشت زدہ ہو رہے تھے۔ اٹک اٹک کر پوچھا۔ ''حضرت! میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے اور مجھے کچھ پتا نہیں کہ میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔''

بزرگ نے فرمایا۔ ''اپنے حواس پر قابو رکھ۔ یہاں سے جو کچھ تجھے ملنے والا ہے، اس سے تُو ایک بلند مرتبہ حاصل کرلے گا۔''

سلطان باہو ایک طرف مؤدب کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر بعد دربار نبوی ﷺ سے اعلان ہوا۔ ''سلطان باہو کو بلایا جائے اور اس سے پوچھا جائے کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟''

سلطان باہو کی گھگی بندھ گئی تھی۔ ہکلا ہکلا کر جواب دیا۔ ''ایک غلام اپنے آقا سے کیا چاہتا ہے؟ اب میں اپنی زبان سے کیا عرض کروں۔''

دربارِ نبوی ﷺ سے ارشاد ہوا۔ ''تُو جو کچھ چاہتا ہے، عطا ہوا... تو اپنی ماں کا شکرگزار ہو جس نے تیرا نام باہو رکھ دیا۔ یاہو اور باہو میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے۔''

سلطان باہو کو اپنے جسم میں اور روح میں ایک چمک اور ایک لہر سی محسوس ہوئی۔ خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا میں اپنی مراد کو پہنچ گیا؟ کیا میں نے جو چاہا تھا اسے پالیا؟''

جواب ملا۔ ''اب تو واپس جاسکتا ہے۔ میں نے تجھے بیعت کیا۔ تیرا مرتبہ بلند کیا۔''

سلطان باہو پر وجدانی... کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ بے ہوش ہوکر گر گئے۔ کتنی دیر بے ہوش رہے، انہیں کچھ پتا نہ تھا لیکن جب ہوش آیا تو وہ اپنے بستر پر پڑے تھے اور ماں ان پر جھکی ہوئی پوچھ رہی تھیں۔ ''باہو! ہوش میں آ...... سچ بتا یہ خوشبو کہاں سے آرہی ہے؟''

سلطان باہو کو اپنی ماں کی آواز صاف نہیں سنائی دے رہی تھی۔ بہ مشکل آنکھیں کھول کر اپنے ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ ماں سے پوچھا۔ ''ماں! میں کہاں ہوں؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''اپنے بستر پر...... میرے پاس، میرے اپنے کمرے میں۔''

سلطان باہو نے زور سے سانس... کھینچی، پوچھا۔ ''ماں! کیا وہ خوشبو جو میں محسوس کررہا ہوں، میری ناک سونگھ رہی ہے، آپ بھی محسوس کررہی ہیں...... آپ بھی سونگھ رہی ہیں؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''ہاں میرے لعل، وہ خوشبو میں بھی محسوس کررہی ہوں، میں بھی سونگھ رہی ہوں۔ یہ عجیب سی خوشبو میں نے اپنی زندگی میں آج تک نہیں سونگھی۔''

سلطان باہو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، بولے۔ ''ماں! یہ کیا ہوگیا...... ابھی ابھی میں رسول اللہ ﷺ کے دربار میں تھا۔ میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور بے ہوش ہوگیا۔ آہ! میں اتنی جلدی کیوں بے ہوش ہوگیا۔ میں رسول اللہ ﷺ کے دربار میں تادیر کیوں نہیں رہا؟''

ماں نے سانس زور سے.... کھینچی اور جواب دیا۔ ''یہ عجیب خوشبو ہمیں یہ بتا رہی ہے کہ جس دربار کا تو ذکر کررہا ہے، وہ یہیں موجود ہے پھر جدائی کیا معنی؟''

سلطان باہو نے کہا۔ ''نہیں ماں! ایسی بات نہیں ہے۔ وہ دربار یہاں نہیں ہے بلکہ یہ خوشبو جو ہم دونوں سونگھ رہے ہیں، اس دربار سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔''

ماں نے اپنے بیٹے کی پیشانی چوم لی، بولیں۔ ''بے شک، میں تیرے جواب سے مطمئن ہوں۔ بخدا اس دربار سے آنے والے بھی اسی طرح معطر ہوجاتے ہیں۔ میں کتنی نادان اور کم عقل ہوں جو یہ کہہ بیٹھی کہ وہ مقدس اور معطر دربار یہیں موجود ہے۔''

سلطان باہو افسردہ اور ملول ہوکر بیٹھ گئے۔ ماں کو بھی بے حد ملال تھا۔ کئی دن بعد سلطان باہو نے ایک بار پھر رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا اور درخواست کی کہ یارسول اللہ ﷺ میری روحانی تربیت کون کرے گا؟

جواب ملا۔ ''میں نے تجھ کو محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے سپرد کیا۔'' اس کے بعد سلطان باہو کا ہاتھ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ میں دے دیا۔

ایک بار پھر سلطان باہو کی خواب گاہ خوشبو سے معطر ہوگئی۔ یہ خوشبو ماں نے بھی محسوس کی اور انہیں اب اس کا شدت

سے یقین ہوگیا کہ ان کا بیٹا سلطان باہو آئندہ ایک بلند پایہ انسان ثابت ہوگا۔ انہوں نے بیٹے کو حکم دیا۔ ''اب تجھ کو کسی ولی کامل کی بیعت اختیار کرلینی چاہیے۔''

سلطان باہو نے عرض کیا۔ ''کیا رسول مقبول ﷺ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بعد بھی کسی کی بیعت ضروری ہے؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹے باہو! یہ دنیا ہے عالم اسباب۔ یہاں باطنی اور بشری معاملات کوئی نہیں جانتا۔ دنیا ظاہری اسباب پر نظر رکھتی ہے۔ اس لیے تیرا ولی کامل سے بیعت کرنا ضروری ہے۔''

سلطان باہو ماں کے استدلال کے آگے مجبور اور بے بس ہو گئے، بولے۔'' آپ کا ارشاد بجا، میں کسی ولیِ کامل کو ضرور تلاش کروں گا۔'' پھر کچھ سوچ کر عرض کیا۔ ''اور جہاں تک میری ناقص عقل کام کر رہی ہے، مجھے ولیِ کامل کی تلاش میں کہیں جانا نہیں پڑے گا۔ وہ تو میرے سامنے ہی موجود ہے۔''

ماں نے پوچھا۔ ''یعنی تو کیا کہنا چاہتا ہے؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو ولی کامل سمجھتا ہوں کیوں نہ آپ ہی سے بیعت ہو جاؤں۔''

ماں نے کہا۔ ''بیٹے! بات یہ ہے کہ عورتوں کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ کسی کو بیعت کریں۔ اس لیے میں مجبور ہوں۔''

سلطان باہو نے مایوسی سے عرض کیا۔ ''ماں! آپ ہی فرمائیں کہ پھر میں مرشد کو کہاں تلاش کروں؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''مشرق کی طرف، بس اس طرف چلے جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔''

سلطان باہو نے اسی وقت گھر چھوڑ دیا اور مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ جہاں سے بھی گزرتے لوگوں سے یہی پوچھتے کہ اس نواح میں کوئی ایسا بزرگ ہے جو انسانوں کی ظاہری اور باطنی راہنمائی کر سکے اور ہر جگہ سے یہی جواب ملتا۔ ''ہاں، ایک شخص ہے بس ایک شخص......شاہ حبیب اللہ صاحب۔''

سلطان باہو پوچھتے۔ ''وہ کہاں ہیں؟ ان سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملتا۔ ''دہلی سے پہلے کسی بھی قصبے میں ان سے ملاقات ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تبلیغ دین کے لیے دوروں پر رہتے ہیں۔''

چنانچہ ایک جگہ سلطان باہو کی ملاقات شاہ حبیب اللہ سے ہو گئی۔ یہ شاہ صاحب سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی خدمت میں عرض کیا۔ ''حضرت! مجھے میری ماں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی صحبت میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے؟''

شاہ حبیب اللہ نے پوچھا۔ ''میں کس طرح یقین کروں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، اس میں جذبۂ صادق بھی کارفرما ہے۔''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ جس طرح چاہیں، میں یقین دلانے کو تیار ہوں۔''

شاہ حبیب اللہ نے پوچھا۔ ''شورکوٹ میں تیری جاگیر ہے یا نہیں؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''ہے کیوں نہیں مگر اس سے آپ کا مطلب؟''

شاہ حبیب اللہ نے کہا۔ ''اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ جو جاگیردار ہو جس کے پاس زمینیں ہوں، جائداد ہو، اس کے پاس دنیا کے بکھیڑوں کی کوئی کمی نہیں اور جو دنیا کے بکھیڑوں میں پھنسا ہو وہ اللہ سے کیا لو لگائے گا۔''

سلطان باہو سناٹے میں آگئے کہ یہ کس آزمائش میں ڈال دیا۔

شاہ حبیب اللہ نے متردد دیکھا تو مسکرا کر فرمایا۔ ''خاموش کیوں ہو گیا...... کیا سوچنے لگا؟ دنیا کا بکھیڑا ایسی ہی چیز ہے جو انسان کو سوچ میں ڈال دیتا ہے۔ تو بھی کیا کرے، مجبور ہے۔''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ میں نے جب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ علائقِ دنیا سے پیچھا چھڑانا ہے تو پھر فکر کس بات کی۔ آپ مجھ کو موقع دیجیے، میں آج ہی شورکوٹ واپس جا رہا ہوں۔ دوبارہ جب حاضری دوں گا تو میں دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کر چکا ہوں گا۔''

شاہ حبیب اللہ نے کہا۔ ''بہتر ہے، میں تیرا انتظار کروں گا۔''

سلطان باہو اسی دن شورکوٹ واپس چلے گئے۔ ماں نے واپس آتا ہوا دیکھا تو پوچھا۔ ''کہو بیٹے کیا خبر لائے؟ کام بنایا

نہیں؟ مرشد ملا یا نہیں؟''
سلطان باھو نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے مرشد کو پالیا ہے۔''
ماں نے کہا۔ ''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ مرشد ابھی تک تجھے نہیں ملا۔''
سلطان باھو نے حیرت سے پوچھا۔ ''ماں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، اگر شاہ حبیب اللہ مرشد نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟''
ماں نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ وہ مرشد تو ہیں مگر تیرے مرشد نہیں ہیں۔''
سلطان باھو نے عرض کیا۔ ''اگر وہ میرے مرشد نہیں ہیں تو انہوں نے یہ کیوں کہا کہ میں دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرلوں؟ اس کے بعد ان سے ملوں تاکہ وہ بیعت لے کر علوم باطنی سکھائیں۔''
ماں نے کہا۔ ''انہوں نے یہ بات ہرگز نہیں کہی کہ پہلے تو دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرلے، اس کے بعد ان سے بیعت ہوکر علوم باطنی حاصل کرے۔ انہوں نے صرف یہ کہا ہے کہ پہلے تو دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کر اس کے بعد ان سے مل۔''
سلطان باھو کو یاد آیا کہ واقعی شاہ حبیب اللہ نے یہی کہا تھا۔ ماں کے قدموں میں گر کر عرض کیا۔ ''ماں! آپ تو خود ولی ہیں۔ مجھے اور کسی ولی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''
ماں نے جواب دیا۔ ''لیکن افسوس! جیسا کہ پہلے میں کہہ چکی ہوں کہ عورتوں سے بیعت ہونے کا حکم نہیں دیا گیا ہے تو پھر میں تجھ کو کس طرح بیعت کرلوں؟''
سلطان باھو نے کہا۔ ''ماں! میں کیا کروں؟ میرے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے، آپ اس سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن میں آپ سے بیعت نہیں ہوسکتا۔''
ماں نے جواب دیا۔ ''سردست تو یہ کر کہ تجھ کو شاہ حبیب اللہ نے جو حکم دیا ہے تو اس پر عمل کر...... اللہ جو کچھ کرے گا اچھا ہی کرے گا۔''
سلطان باھو نے کہا۔ ''شاہ صاحب نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرکے ان کے پاس پہنچوں تو وہ میرے لیے کچھ کریں گے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا حکم ہے؟''
ماں نے جواب دیا۔ ''اس سلسلے میں میرا کیا حکم چلے گا۔ شاہ صاحب نے جو حکم دیا ہے، اس پر عمل کرو۔''
سلطان باھو نے عرض کیا۔ ''اگر میں شاہ صاحب کے حکم پر عمل کروں گا تو آپ کا کیا ہوگا؟''
ماں نے کہا۔ ''بیٹے! تو میری فکر نہ کر۔''
سلطان باھو نے اپنا سب کچھ راہِ خدا میں دے کر فراغت حاصل کرلی اور تہی دست و تہی داماں حبیب اللہ کی خدمت میں روانہ ہوگئے۔
کئی دن بعد جب یہ شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ سلطان باھو نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ نے جو کچھ فرمایا تھا، اس پر عمل درآمد کرکے آگیا ہوں۔ اب تو آپ مجھے بیعت کرلیں۔''
شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''باھو! میں خوش ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا تھا تو نے اس پر ہو بہو عمل کرکے مجھے شاد ماں کیا لیکن افسوس کہ میں تجھ کو بیعت نہیں کرسکتا۔''
سلطان باھو نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ آخر کیوں؟''
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''کیا تیری ماں نے تجھ کو کچھ بھی نہیں بتایا؟''
باھو نے کہا۔ ''انہوں نے بتایا تو تھا کہ میں کچھ بھی کروں گا مگر آپ مجھ کو بیعت نہیں کریں گے۔''
شاہ صاحب نے کہا۔ ''بے شک! تیری ماں روشن ضمیر ہے۔ تو جس مرتبے کا مالک ہے، میں اس کا اہل نہیں کہ تیری تربیت کروں۔ بہرحال تو دہلی چلا جا۔ وہاں تجھ کو شیخ عبدالرحمٰن قادری ملیں گے تو ان کے پاس چلا جا۔ وہی تیری تربیت کرسکیں گے۔ ورنہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔''
باھو نے مایوسی سے عرض کیا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب میں دہلی جاؤں اور وہاں دربدر کی ٹھوکریں کھا کر میں شیخ عبدالرحمٰن قادری کو تلاش کرتا پھروں۔''
شاہ صاحب نے متانت سے جواب دیا۔ ''بے شک، بے شک، میں جو کہہ رہا ہوں، اس کو بطورِ خاص ذہن نشین کرلے کیونکہ یہ خشتِ اول ہے۔ اگر پہلی اینٹ ہی غلط کردی گئی تو پوری عمارت میں کجی آجائے گی اور پھر کوئی طاقت بھی اس کو سیدھا اور

مضبوط نہیں کر سکے گی۔"
باہو چپ ہو گئے، کچھ دیر بعد پوچھا۔"حضرت! آپ نے میری بابت کیا فیصلہ کیا؟"
شاہ صاحب نے جواب دیا۔"میں نے کہہ جو دیا کہ یہاں سے تجھ کو دہلی جانا ہے۔ وہاں تو شیخ مرشد کو بتائے گا کہ تجھ کو میں نے ان کی خدمت میں بھیجا ہے اور کچھ نہیں بتائے گا تو تجھے خود ہی مصیبتوں میں گرفتار ہو جانا پڑے گا۔"
سلطان باہو دو دن شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر دہلی چلے گئے۔ ابھی یہ دہلی میں داخل ہی ہوئے تھے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور بڑی متجسسانہ نظریں ڈال کر پوچھا۔"نوجوان! تمہارا نام کیا ہے؟"
"تم میرا نام جان کر کیا کرو گے؟" باہو نے پوچھا۔
اجنبی شخص نے جواب دیا۔"میں شیخ عبدالرحمٰن قادری کا مرید ہوں اور ان ہی کے ایما پر میں یہاں آیا ہوں۔ میں شیخ جی کے پاس کیا منہ لے کر جاؤں گا۔"
باہو نے کہا۔"آپ لوگ خود بھی بہت جانتے ہیں۔ کیا میرے لیے کوئی خاص حکم لے کر آئے ہو؟"
اجنبی شخص نے کہا۔"ابھی ابھی پیرومرشد نے مجھے حکم دیا تھا کہ شورکوٹ کا سلطان باہو آرہا ہے۔ اس کو عزت واحترام سے میرے پاس لایا جائے۔"
سلطان باہو نے سوال و جواب کا سلسلہ بند کر دیا اور شیخ عبدالرحمٰن قادری کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ شیخ عبدالرحمٰن قادری نے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حجرے سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔ جب کوئی نظر نہ آیا تو بولے۔"یہ باہو آخر رہ کہاں گیا۔ اتنی دیر میں تو میرے پاس آجانا چاہیے تھا۔"
ابھی ان کا فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ سلطان باہو ان کے پاس پہنچ گئے اور مؤدبانہ سلام عرض کیا۔ شیخ قادری نے انہیں بڑی دعائیں دیں۔ انہوں نے پوچھا۔"باہو! کیا تیری ماں تیرے لیے کافی نہیں تھی؟"
باہو نے جواب دیا۔"تھی کیوں نہیں لیکن انہوں نے مجھے بیعت کرنے سے منع کر دیا تھا۔"
شیخ قادری نے مسکرا کر کہا۔"بے شک اس کو انکار ہی کر دینا تھا۔ خیر، اب تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"
باہو نے جواب دیا۔"میں اپنے رب کی تلاش میں نکلا ہوں اور جب تک اس کو نہ پالوں یا اس کے خاص اشارے سمجھ نہ لوں، میں یہیں رہوں گا۔ واپس نہیں جاؤں گا۔"
شیخ قادری نے بڑی محبت سے کہا۔"اچھا اگر یہ بات ہے تو، تو اسی وقت میرے ساتھ حجرے میں چل۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی مرشد سے واسطہ پڑا تھا۔"
باہو اسی وقت مرشد کے ساتھ ان کے حجرے میں چلے گئے۔ وہاں شیخ قادری نے ذرا سی دیر میں سلوک کے مدارج طے کرا دیے۔ باہو کو ذرا سی دیر میں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ صاحب کمال ہو چکے ہیں۔
دوسرے دن باہو اپنی حالت اور مقام کا پتا چلانے کے لیے باہر نکلے اور بازاروں میں گھومنے پھرنے لگے۔ ایک جگہ باہو نے ایک نابینا شخص کو اپنے اعصا کے سہارے چلتے دیکھا تو اس کے پاس پہنچ گئے اور اس کے داہنے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھا۔"اے شخص تو پیدائشی نابینا ہے؟"
نابینا نے ایک سرد آہ بھری اور عرض کیا۔"ہاں جناب! میں پیدائشی نابینا ہوں۔"
باہو نے جواب دیا۔"یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ بینائی ابھی آجاتی ہے۔" اس کے بعد شیخ مرشد سے اجازت لیے بغیر باہو نے کچھ پڑھ کر اس کی آنکھوں پر دم کیا اور کہا۔"ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔"
نابینا چند قدم ہٹ کر کھڑا ہوا تو اس کی بند آنکھوں تلے لاتعداد جگنو نظر آنے لگے۔ اس شخص نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا تو اس کو کسی بات کا یقین ہی نہیں آیا۔ وہ چپ چاپ خاموش کھڑا رہا۔
آخر باہو نے پوچھا۔"اے شخص! تیرا کیا حال ہے؟"
اس نے جواب دیا۔"پیرومرشد! اب مجھ کو نظر آرہا ہے۔ دکھائی دے رہا ہے۔ میری آنکھوں تلے روشنیاں رقص کر رہی ہیں۔"
باہو نے کہا۔"اگر تجھ کو تیری بینائی واپس مل گئی ہے تو، تو اپنے رب کا شکر ادا کر۔"
وہ شخص سجدے میں گر گیا۔



کئی دن بعد باہو نے ایک اور شخص کو گھسٹ گھسٹ کر چلتے دیکھا۔ اس شخص کی ایک ٹانگ فالج زدہ تھی جو سوکھ کر بیکار ہو گئی تھی۔ باہو نے اس سے پوچھا۔ ''یہ تیری ٹانگ کو کیا ہوا؟''

اس شخص نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''جو کچھ ہو گیا ہے کیا تجھ کو نظر نہیں آ رہا؟ میرا آدھا دھڑ فالج نے ناکارہ کر دیا ہے۔''

باہو نے ہنس کر کہا۔ ''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر یہ تو بتا کہ تو نے اس کا علاج کیوں نہیں کرایا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کا بہت علاج کرایا مگر تھک ہار کر چپ ہو رہا۔ کسی دوا نے فائدہ ہی نہیں کیا تو میں نے صبر کر لیا اور اس کی رضا کے آگے خاموشی اختیار کر لی۔''

باہو نے کہا۔ ''کیا میں تیری ٹانگ ٹھیک کر دوں؟''

اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔ ''تو میری ٹانگ کو ٹھیک کر دے گا؟''

باہو نے جواب دیا۔ ''ہاں! میں تیری ٹانگ ٹھیک کر سکتا ہوں۔''

اس شخص نے چڑ کر کہا۔ ''کیا تو خدا ہے؟''

باہو نے جواب دیا۔ ''میں خدا تو نہیں ہوں لیکن خدا کا بندہ ضرور ہوں اور خدا نے مجھے ایسی خوبی عطا فرمائی ہے کہ میں تیری ٹانگ ٹھیک کر سکتا ہوں۔''

اس شخص نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر انتظار کس بات کا۔ میں بھی تو تیری کرامت دیکھوں۔ خالی خولی باتیں ہی کر سکتا ہے یا وہ کام بھی کر سکتا ہے جس کا تو دعوے دار ہے۔''

باہو نے جواب دیا۔ ''میں تیری فالج زدہ سوکھی ٹانگ اسی وقت درست کر سکتا ہوں۔''

وہ شخص عاجز آیا ہوا تھا۔ ''تب پھر کرنا، انتظار کس بات کا؟''

باہو نے چپکے چپکے بارگاہ ایزدی میں مناجات کی اور پھر درخواست کی۔ ''اے میرے رب! اس مجبور شخص کی ٹانگ درست فرما دے۔ اپنے محبوب ﷺ کے صدقے میں۔''

اس کے بعد آپ نے اس شخص سے کہا۔ ''میں تیرے حق میں دعا کر رہا ہوں۔ اثر کے لیے چند دن درکار ہیں۔ اگلے ہفتے ملنا۔''

وہ شخص تو مایوس تھا ہی، بولا۔ ''اگر یہ کہتے ہو تو انتظار کر لوں گا۔ حالانکہ امید تو نہیں۔''

چنانچہ ایک ہفتے بعد جب وہ دوبارہ آپ سے ملا تو اس کے پاؤں کا لنگ دور ہو چکا تھا۔ وہ فرطِ عقیدت سے آپ کے قدموں میں گر گیا۔ فالج زدہ حصے میں دورانِ خون جاری ہو چکا تھا۔ جب اس واقعے کی اطلاع اطبا کو ہوئی تو انہوں نے اس پر یقین کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو عجز و تحیر کا اظہار کیا۔

☆☆☆

سلطان باہو کی کرامات کا چرچا ہونے لگا۔ لوگوں نے ان کے مرشد عبدالرحمٰن قادری سے عرض کیا کہ باہو کو روکیے۔ اس نے کشف و کرامات کو عام کر دیا ہے جس پر بھی نظر ڈال دیتا ہے، اس کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

مرشد نے اسی وقت سلطان باہو کو طلب کیا۔ اس وقت مرید اور مرشد کے پاس وہ لوگ بھی موجود تھے جنہیں سلطان باہو سے حسد تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج خبر لی جائے گی اور وہ اس کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر سکیں گے۔

مرشد نے پوچھا۔ ''کیوں باہو! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

سلطان باہو نے حیرت سے سوال کیا۔ ''آپ کیا سن رہے ہیں؟ ذرا وضاحت بھی فرما دیں تو نوازش ہو گی۔''

مرشد نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے تو نے کشف و کرامت کو عام کر دیا ہے...... کیا یہ درست ہے؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''آپ نے جو کچھ سنا ہے، وہ درست سنا ہے۔ آپ نے مجھ پر ایسی نظرِ کرم ڈالی کہ میں خاک تھا پاک ہو گیا۔ مٹی تھا سونا ہو گیا۔ بے کار تھا، کارآمد ہو گیا۔ نالائق تھا لائق ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ میں نمایاں انقلاب محسوس کیا، تبدیلیاں پائیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں کچھ ہو گیا ہوں۔ بس یہ دیکھنے کے لیے کہ میں کیا ہو گیا ہوں اور میں کیا کچھ کر سکتا ہوں، چھوٹے چھوٹے تجربے کرنے لگا ہوں۔ ان تجربوں میں کامیاب ہوا۔ میرے حاسد اس کو برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے آپ سے شکایت کر دی۔ اگر میں خطاکار ہوں تو سزا کا حق دار ہوں۔ حاضر ہوں، سزا سنائیں میں بھگتنے کو تیار ہوں۔''

اس جواب نے مرشد کو بے حد خوش کر دیا۔ حاضرین پر نظر ڈالی اور فرمایا۔ ''تم سب نے سلطان باہو کا جواب سن لیا۔ اب کیا کہتے ہو؟ اس کو کیا سزا ملنی چاہیے؟''

لوگوں کے منہ بند ہو چکے تھے پھر بھی جو حسدِ مجسم تھے، انہوں نے عرض کیا۔ "ہم پیرو مرشد کو کیا مشورہ دیں گے۔ آپ نے سلطان باہو کو نعمتِ خاص مرحمت فرمائی۔ انہوں نے اس نعمت کو عام کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ گستاخی ہے۔ اب اس کی کیا سزا ہو سکتی ہے، آپ خود ہی تجویز فرمائیں۔"

مرشد نے جواب دیا۔ "بے شک سلطان باہو سزا کا مستحق ہے اس نے جو کچھ کیا ہے، اس کی میرے پاس یہ سزا ہے کہ اس نعمتِ خاص میں مزید اضافہ کر دیا جائے۔" پھر سلطان باہو سے کہا۔ "جا میں نے تجھے زبان کی شیرینی اور عرفان بخش دیا۔ تیرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ لوگوں کے دلوں میں گھر کریں گے اور تیرے کلام کی تاثیر انسانوں کو تیرا والہ و شیدا بنا دے گی۔"

حاسدوں کے چہرے اتر گئے۔ سلطان باہو کو اب تک جو کچھ ملا تھا، اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اس کے بعد مرشد نے حاضرین سے کہا۔ "جس نے دوسروں کی فکر کی اور اپنے اعمال سے غافل ہوا، وہ کہیں کا بھی نہ رہا۔ لوگو، اپنی فکر کرو، اپنے اعمال پر نظر رکھو۔"

لوگوں کی سرزنش ہو گئی تھی اس لیے وہ کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گئے۔ عبدالرحمٰن قادری نے جب یہ سمجھ لیا کہ حاسد اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئیں گے تو انہوں نے سلطان باہو کو بلا کر حکم دیا۔ "باہو! اگر تم خوشی سے یہاں رہنا چاہو تو شوق سے رہو اور اگر شورکوٹ جانا چاہو تو اس کی بھی میری طرف سے اجازت ہے۔"

سلطان باہو نے عرض کیا۔ "آپ مجھے کیوں رخصت کرنا چاہتے ہیں؟"

مرشد نے جواب دیا۔ "مجھے جو کچھ دینا تھا، تمہیں دے دیا۔ اس میں مزید اضافہ تم عبادت و ریاضت سے کرو۔ میرا کام ختم ہوا۔"

سلطان باہو بہ چشمِ نم شورکوٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ آپ کی ماں نے بیٹے کو جس حال میں پایا اس سے بہت خوش ہوئیں۔ جو زمین بچ رہی تھی، اس پر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ ہر کام خود کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ شورکوٹ میں ارادت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔ آپ کی تعلیمات اور عرفان کا شہرہ ہونے لگا۔

سلطان باہو زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اس لیے علماء ان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ کم پڑھا لکھا شخص عوام میں اتنا مقبول کیوں ہو گیا۔ بعض عالم آپ کے پاس محض اس لیے آتے کہ آپ کے علم و فضل کا امتحان لیں۔

ایک دن ایک عالم آپ کے پاس آیا۔ بظاہر وہ ارادت مند بن کر آیا تھا لیکن وہ حقیقتاً آپ کا امتحان لینے آیا تھا۔

اس نے آپ سے دورانِ گفتگو پوچھا۔ "میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ فقر کی بابت آپ کی رائے معلوم کروں۔ کیونکہ فقر کے بارے میں مختلف صوفیائے کرام نے مختلف معنی بتائے ہیں۔ فقر سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "تم تو عالم ہو۔ مجھ سے فقر کے معنی پوچھ رہے ہو۔ پھر بھی اگر تم اس کے معنی مجھ سے معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو، فقر میں تین حرف ہیں۔ ف ق ر۔ ف سے فنائے نفس، ق سے قہرِ نفس اور ر سے رضا...... یہ رضائے الٰہی اسی طرح سے ف سے فخر، ق سے قرب اور ر سے راز ہے۔ یہ مراتب انہیں حاصل ہوتے ہیں جو فقرِ محمدی ﷺ حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ مراتب حاصل نہ ہوئے تو پھر ف سے فضیحت، ق سے قہرِ خدا اور ر سے رُو مراد ہے۔"

عالم آپ کی زبان سے یہ سب سن کر سکتے میں آ گیا۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ایک کم پڑھا لکھا شخص کہہ رہا ہے۔

عالم نے ایک سوال اور کیا۔ پوچھا۔ "حضرت! آپ کی نظر میں فقیر کی کیا تعریف ہے؟"

سلطان باہو نے جواب دیا۔ "پہلے تمہیں مرشد کی بابت پوچھنا چاہیے تھا۔"

عالم نے کہا۔ "اگر مرشد کی تعریف جاننا ضروری ہے تو پہلے اس کی تعریف فرما دیجیے۔"

سلطان باہو نے جواب دیا۔ "مرشد تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اول مرشد مرشدِ کامل۔ یہ طالب کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔ دوم مرشدِ ناقص جو طالب کے حق میں زحمت ہوتا ہے۔ ان دو کے علاوہ ایک مرشد اور ہے۔ یہ تیسرا مرشد دنیاوی مراعات اور مناصب حاصل کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور یہاں تک ترقی حاصل کر لیتا ہے کہ مرتبۂ فرعون بھی اس کے لیے ایک معمولی مقام ہوتا ہے۔ ان تین کے علاوہ ایک چوتھی قسم کا مرشد بھی ہوتا ہے۔ یہ مرشدوں کی ذلیل ترین قسم ہے۔ یہ مرشد نہ تو مراتبِ دنیا ہی حاصل کرتا ہے اور نہ ہی اسے مقاماتِ معرفت کا علم ہوتا ہے۔ یہ مرشد دونوں جہاں کی ذلت اور رسوائی اپنے سر لیتا ہے۔"

سلطان باہو کی عالمانہ باتوں نے عالم کو زچ کر کے رکھ دیا۔ وہ خود کو سلطان باہو سے اعلیٰ و افضل سمجھ کر آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سلطان باہو کو اپنی عالمانہ باتوں سے اتنا مرعوب اور متاثر کر لے گا کہ باہو ان سے درخواست کریں گے کہ عالم انہیں اپنا

مرید کرے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا تھا۔
سلطان باھو نے بولنا شروع کیا۔ ''لوگو! خدا کی طرف آؤ۔ اپنے دلوں سے غرور وتکبر کو نکال دو۔'' وہ بولتے بولتے خاموش ہو گئے مگر پھر اچانک بولنے لگے: ''مگر افسوس کہ خدا کی طرف آنا کیا معنی۔ وہ اس سے بھاگتے اور گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ ان پر معرفتِ الٰہی کی جھلک تک نہیں پڑی۔ مگر وہ اپنے آپ کو عارف اور صاحب حضور جانتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ درحقیقت بے معرفت اور مقامِ حضور سے کوسوں دور ہیں۔ یہ اپنے کشف وکرامت اور بدعت واستدراج میں مغرور رہتے ہیں۔ یہ دنیائے دوں اور سیم وزر میں شب وروز خراب اور پریشان رہتے ہیں۔''
اب عالم سرنگوں وشرمسار ہو چکا تھا۔ بولا۔ ''حضرت! اب برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ مجھے اپنے مریدوں اور ارادت مندوں میں شامل فرمالیں۔''
سلطان باھو نے فرمایا۔ ''رسولِ مقبول ﷺ کی متابعت اختیار کر۔ اس کے بعد کسی اور کی ضرورت نہیں رہے گی۔ زندگی بھر اس حقیقت کو ذہن نشین رکھ کہ جو شخص بھی رسول اللہ ﷺ کی متابعت کے بغیر کسی اور شخص یا شے کی راہبری اور پیشوائی پر بھروسا کرے گا وہ خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔''
عالم نے سوال کیا۔ ''میں نے ایسے صوفی بھی دیکھے ہیں جن کے کئی افعال شرعِ محمدی ﷺ کے خلاف ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اگر کسی صوفی کا ایک فعل بھی شرعِ محمدی ﷺ کے خلاف ہے تو وہ صوفی نہیں بلکہ شیطان ہے۔ اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہیے۔''
عالم نے دوسرا سوال کیا۔ ''حضرت! آپ کی باتوں نے مجھے مست ومسحور کر رکھا ہے۔ آپ الفاظ ومعانی پر سے نقاب اتارتے چلے جارہے ہیں۔ ابھی چند سوال اور باقی ہیں جو میرے دل ودماغ میں کلبلا رہے ہیں۔ براہِ کرم یہ بھی بتاتے چلیے کہ یہ سخاوت کیا چیز ہے اور اس کا مقصد اور مطلب کیا ہوتا ہے؟''
سلطان باھو نے جواب دیا۔ ''سخاوت کرنے سے خلق اللہ کا حق ادا ہو جاتا ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحبِ مال کو اللہ کے مقابلے میں اپنے مال سے کتنی محبت ہے؟''
عالم نے پوچھا۔ ''مزید کچھ یا بس؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''فقر اور معرفتِ الٰہی دریائے رحمت کی موجیں ہیں اور سخاوت اور کرم وہ صفات ہیں جو پل کی طرح خدا سے ملا دیتی ہیں۔''
عالم سر دھنتا رہا۔ وہ وجدانی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ''حضرت! میں ایک بار پھر مرشد کی طرف آتا ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ مرشد کی باطنی باتوں سے مریدوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟''
سلطان باھو نے جواب دیا۔ ''پیر ومرشد میں اتنی باطنی قوت ضرور ہونی چاہیے کہ وہ اس کی مدد سے اپنے مریدوں کی بروقت خبر گیری کر سکے اور ان کو گناہ ومعصیت سے روک سکے اور جب کوئی مرید جاں کنی کی حالت میں مبتلا ہو تو اس نازک وقت میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے دعا اور عرض کر سکے...... لیکن جو مرشد اس نازک وقت سے صحیح وسالم نہ گزار سکے، وہ پیر ومرشد نہیں ہو سکتا۔''
عالم نے عرض کیا۔ ''اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ پیری اور مرشدی بہت مشکل چیزیں ہیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''بے شک، اس میں کیا شک۔ پیری مریدی کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ ایک راز ونیاز سرّ واسرار ہے۔''
عالم نے کہا۔ ''حضرت! کوئی نصیحت؟''
آپ نے فرمایا۔ ''اے عالم! یاد رکھو کہ دنیا والے دنیا اور مال وزر کے غلام ہوتے ہیں لیکن فقیر جو عارف باللہ بھی ہو، مال وزر اور دنیا کو غلام بنا کر رکھتا ہے۔ حرص وحسد سے دور رہ کیونکہ ان کا انجام آخر کار ذلت وخواری ہوتا ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ کامران وبامراد رہے تو چاروں نفسوں کے پرندوں کو ذبح کردے۔''
عالم نے حیرت سے پوچھا۔ ''چاروں نفسوں کے پرند کیا ہوتے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''شہوت کا مرغ، حرص کا کوا، زینت کا مور اور حسد کا کبوتر۔''
عالم نے عرض کیا۔ ''اب میں اس در کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھے اپنی حضوری سے دور نہ کیجیے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میری حضوری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اللہ کا قرب اور اس کی حضوری حاصل کرنے کی فکر کر۔''

☆☆☆

آپ کھیتی باڑی خود کرتے تھے۔ آپ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ لوگوں نے ان کے بارے میں عجیب عجیب تصور قائم کر رکھے تھے۔ آپ کے پاس آنے والوں میں ان کی اکثریت تھی جو آپ سے کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں دنیادار بھی تھے اور دین دار بھی۔

آپ تاروں کی چھاؤں میں نکل جاتے اور زمینوں پر ہل خود چلاتے۔ ایک دن کہیں دور دراز سے ایک شخص آپ سے ملنے آیا۔ اس شخص نے سنا تھا کہ سلطان باہو جو چاہتے ہیں، وہ ہو جاتا ہے۔ جس پر نظر ڈال دیتے ہیں، وہ کامل ہو جاتا ہے۔ یہ شخص سونے چاندی کا عاشق تھا۔ اس کی یہی ہوس شورکوٹ کھینچ لے گئی۔ جب یہ گھر پہنچا اور سلطان باہو کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا وہ کھیت میں ہوں گے۔ یہ پتا پوچھتا ہوا کھیت پہنچ گیا۔ اس نے دور ہی سے کسی کو ہل چلاتے دیکھا تو ایک راہ گیر سے پوچھا۔ ''اے بھائی! کیا تم یہیں کے رہنے والے ہو؟''

راہ گیر نے کہا۔ ''ہاں، میں یہیں رہتا ہوں۔ کیا بات ہے؟''

اس شخص نے پوچھا۔ ''تب پھر تم سلطان باہو سے بھی واقف ہو گے؟''

راہ گیر نے کہا۔ ''ہاں، میں ان سے بھی واقف ہوں اور یہاں کون ایسا ہے جو سلطان باہو سے واقف نہ ہو۔''

اس شخص نے کہا۔ ''مجھے سلطان باہو کی کشش کھینچ لائی ہے۔ ان کے گھر گیا تھا، معلوم ہوا کھیتوں میں گئے ہیں۔ میں انہی کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک آ گیا ہوں۔ براہ کرم تم مجھے ان کے پاس پہنچا دو۔''

راہ گیر نے کھیت میں ہل چلاتے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ رہے سلطان باہو، جاؤ کھیت میں ان سے مل لو۔''

آنے والے نے حیرت سے سلطان باہو کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تو یہ ہیں سلطان باہو...... لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

راہ گیر نے پوچھا۔ ''یقین کیوں نہیں آ رہا؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ اتنا بڑا آدمی یوں ہل نہیں چلا سکتا۔ کیا ان کے مرید اور ارادت مند ان کے لیے یہ کام نہیں کر سکتے؟''

راہ گیر نے کہا۔ ''سلطان باہو کہتے ہیں کہ جب رسول ﷺ بھی خود محنت کیا کرتے تھے تو انہیں بھی اپنا کام خود کرنا چاہیے۔ وہ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو یہ زحمت نہیں دیتے۔''

اجنبی خاموش ہو گیا۔ راہ گیر نے اپنی راہ لی۔ سلطان باہو تپتی دھوپ میں ہل چلا رہے تھے۔ سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اجنبی شخص نے سوچا کہ یہ شخص کسان تو ہو سکتا ہے مگر کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ یقیناً لوگوں نے خوش عقیدگی میں بہت کچھ مشہور کر رکھا ہے۔ اگر یہ صاحب کرامت ہیں تو اپنی کرامت کے بل پر ہل چلائے بغیر زمین کو جوت بو کیوں نہیں دیتے۔ انہی خیالوں میں وہ پریشان اور ہلکان ہو گیا اور آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ ان سے ملے بغیر ہی واپس جانا چاہیے کیونکہ جو شخص خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا، وہ دوسروں کے لیے کیا کرے گا۔

اس شخص نے واپسی کا فیصلہ کیا اور جدھر سے آیا تھا اسی طرف واپس ہو گیا۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ کسی نے اسے آواز دی۔ ''اے شخص! کہاں چلا، ذرا ادھر تو آ۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سلطان باہو اسے بلا رہے تھے۔ اس نے دور ہی سے اشاروں سے پوچھا۔ ''کیا میں......؟ آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں تجھ ہی سے مخاطب ہوں۔ میرے پاس آ۔ تجھ سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

وہ شخص آپ کے پاس پہنچ گیا۔ بولا۔ ''فرمائیے، مجھے کیوں یاد فرمایا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''تو کتنی دور سے میری تلاش میں آیا ہے اور افسوس کہ جب میرے پاس پہنچا تو مجھ سے ملے بغیر ہی واپس جا رہا ہے۔''

اس شخص نے بات بنانی چاہی۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ اپنے کام میں مشغول ہیں۔ شام کو ملاقات کر لوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں، میں جانتا ہوں کہ تُو کیوں واپس جا رہا تھا۔''

اس نے پوچھا۔ ''میں کیوں واپس جا رہا تھا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تو نے سوچا جو شخص خود ہل چلا رہا ہو اور اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے یہ کام نہ لے سکتا ہو، وہ کسی اور کے کیا کام آئے گا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''لیکن یہ بات نہیں ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ تو اتنی دور دراز سے آیا اور ملے بغیر ہی واپس جانے لگا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو مال و زر کا شیدا ہے اور میرے پاس سونے چاندی کی ہوس میں آیا ہے۔''

اس شخص نے سونے چاندی کی بات سنی تو انکار نہ کر سکا۔ بولا۔ ''حضرت! میں ایک دنیادار آدمی ہوں۔ میرے لیے سونا چاندی ہی سب کچھ ہے۔ پھر اگر میں نے اس کی ہوس کی ہے تو کیا غلط کیا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ادھر میرے پاس آ اور تھوڑی دیر میرا ہل چلاتا رہ، مجھے پیشاب کی حاجت ہو رہی ہے۔''

اس شخص نے آپ کے ہاتھ سے ہل لے لیا اور چلانے لگا۔ آپ کچھ دیر بعد جب واپس آئے، استنجے کے دو ڈھیلے آپ کے ہاتھ میں تھے۔ آپ نے ان ڈھیلوں کو اجنبی کی طرف کر دیا۔ پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟ کچھ جانتا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''جانتا ہوں، یہ استنجے کے ڈھیلے ہیں اور غالباً اس وقت انہی دونوں سے آپ نے طہارت فرمائی ہے۔''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''بالکل ٹھیک...... میرے نزدیک سونے چاندی کی یہی حیثیت ہے۔'' اس کے بعد آپ نے انہیں زمین پر دے مارا۔ فرمایا۔ ''ان ڈھیلوں کے ریزے سمیٹ لو۔ تو جس شے کی تلاش میں آیا تھا، حاضر ہے۔''

اس شخص نے زمین پر سونا بکھرا دیکھا۔ ڈھیلوں کے ذرات سونے میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ڈری سہمی نظروں سے سلطان باہو کی طرف دیکھا اور پھر سونے کے ذرّے سمیٹنے لگا۔ جب وہ سمیٹ چکا تو آہستہ سے پوچھا۔ ''اب آپ کا کیا حکم ہے؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''تیرا کام ہو چکا...... اور سونا درکار ہو تو وہ بھی فراہم کیا جا سکتا ہے۔''

اس شخص کو اتنا زیادہ سونا مل چکا تھا کہ مزید کی خواہش نہ رہی۔ بولا۔ ''اب میں جا سکتا ہوں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے تجھے روکا تو نہیں ہے۔ میرے پاس جو کچھ لینے آیا تھا، وہ تجھے مل چکا ہے۔ تو واپس جا سکتا ہے۔''

وہ شخص چلا گیا لیکن راستے بھر مبہوت و حیرت زدہ رہا۔

☆☆☆

سلطان باہو نے کئی شادیاں کیں اور آپ کو شاعری سے خاص شغف تھا۔ شاعری کئی زبانوں میں کرتے تھے۔ فارسی، اردو اور پنجابی لیکن پنجابی زبان میں بہت کچھ کہا ہے۔ پوری شاعری عرفان اور تصوف سے مالا مال ہے۔

آپ نے اپنے ایک مرید سے فرمایا۔ ''میری ماں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو کہ انہوں نے میرا نام باہو رکھا جو ایک نقطے سے یاہو ہو جاتا ہے۔''

ایک جوگی کو آوارہ و سرگرداں جو دیکھا تو پوچھا۔ ''تو نے یہ جوگ کیوں اختیار کر رکھا ہے؟''

جوگی نے جواب دیا۔ ''باہو! میں جس کی تلاش میں سرگرداں ہوں، تم بھی جانتے ہو۔ ہر کسی کو اس کی تلاش ہے۔ میں نے اسی کی خاطر جوگ لیا مگر افسوس کہ ابھی تک اسے نہیں پا سکا۔''

سلطان باہو نے پنجابی کی بیت میں جوگی کو جواب دیا۔

اندر ہُو تے باہر ہُو دَم ہُو دے نال جلیندا ہُو
ہُو دا داغ محبت والا ہر دَم پیا سڑیندا ہُو
جتھے ہُو کرے رُشنائی چھوڑ اندھیرا ویندا ہُو
دوہیں جہان غُلام اس باہُو جو ہُو سہی کریندا ہُو

(اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے یا ہو تو اسے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ ہو کی محبت کا داغ ہر دم جلائے رکھ کیونکہ یہ جہاں جلوہ افروز ہو وہاں سے تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ اے باہو جس نے ہو (وحدت) کو سمجھ لیا، دونوں جہاں اس کے غلام ہو گئے)

جوگی نے پوچھا۔ ”باہو! مجھے وہ بات بتاؤ جس سے میں اس کو پالوں جس کی تلاش میں نکلا ہوں۔ تم عرفان حاصل کر چکے ہو اور میں اس کی جستجو میں ہوں۔ تم منزل پر کھڑے ہو، میں مسافر ہوں اور حالت سفر میں پتا نہیں کب منزل پاؤں اور منزل تک پہنچوں گا بھی یا نہیں۔“

باہو نے اپنی دوسری بیت سنائی۔

یار یگانہ ملسی تینوں جے سر دی بازی لائیں ہو
عشق اللہ وچ ہو مستانہ ہو سدا الاہیں ہو
نال تصور اسم اللہ دے دم نوں قید لگاویں ہو
ذاتے نال جاں ذاتی رلیا تد باہو نام سدائیں ہو

(دیار تجھے اس وقت ملے گا جب تو سر دھڑ کی بازی لگا دے اور اللہ کے عشق میں مست ہو کر ہو، ہو پکارتا پھرے۔ اللہ کے تصور کے ساتھ دم کو قید لگائے۔ تو باہو! اس وقت کہلا سکے گا جب تو ذاتِ کبریا میں مدغم ہو جائے گا)

جوگی نے پوچھا۔ ”باہو! اگر میں نمازیں پڑھنا شروع کر دوں تو میں اپنی منزل پالوں گا؟“

سلطان باہو نے اس سوال کا جواب بھی بیت میں دیا۔ فرمایا۔

عاشق پڑھن نماز پرم دی جیں وچ حرف نہ کوئی ہو
جیہا کیہا نیت نہ سکے اتھے درد مند دل ڈھوئی ہو
اکھاں نیر تے خون جگر دا وضو پاک سزوئی ہو
جیبھ نہ ہلے ہونٹھ نہ پھڑکن خاص نمازی سوئی ہو

(عاشق ایسی نماز پڑھتے ہیں جس میں کوئی حرف نہیں ہوتا۔ یہ ایسی نماز ہے جسے ہر کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ صرف دردمند ہی پڑھ سکتے ہیں کیونکہ اس نماز کے لیے آنکھوں کے آنسو اور جگر کے خون سے وضو کیا جاتا ہے اور اس نماز میں نہ تو زبان ہوتی ہے اور نہ ہونٹ پھڑکتے ہیں)

جوگی نے ہو کا نعرہ بلند کیا اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

آپ تریسٹھ سال تک زندہ رہے اور رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آخر کیم جمادی الثانی 1102ھ میں آپ نے وصال فرمایا۔ کسی شاعر نے آپ کی تاریخِ وفات اپنے اس شعر سے نکالی۔

کاشف اسرار الحق اہلِ دیں

1102ھ

گشت تاریخ وصالش با یقین

کسی اور نے ”ابدی غلام باہو“ کہہ کر تاریخِ وفات نکالی۔

1102ھ

وصال کے بعد شورکوٹ کے قریب دریائے چناب کے کنارے قہرگان نامی گاؤں کے قلعے میں دفن کیا گیا لیکن تقریباً اٹھتر سال (78) کے بعد 1180ھ میں جب چناب میں طغیانی آئی تو آپ کو پانی سے بچانے کے لیے مزار سے نکالا گیا۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آپ کا جسدِ مبارک اور کفن جوں کا توں تھا۔ اس میں ذرا سی بھی خرابی نہیں آئی تھی۔ آپ کو وہاں سے نکال کر دوسری جگہ دفن کر دیا گیا۔

1336ھ میں ایک بار پھر طغیانی کا خطرہ لاحق ہوا اور ایک بار پھر آپ کے جسدِ مبارک کو ایک تیسری جگہ دفن کر دیا گیا۔

یہ ماہ محرم تھا۔ چنانچہ آپ کا عرس ماہ محرم میں ہوتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ماخذات

تاریخ مبارک شاہی - یحییٰ بن احمد سرہندی
آثار الصنادید - سر سید احمد خان
تاریخ فرشتہ - محمد قاسم فرشتہ
عہد سلاطین دہلی - صلاح الدین ناسک
تاریخ فیروز شاہی - شمس سراج عفیف
طبقات اکبری - نظام الدین احمد

خواجہ باقی باللہ

تسنیم بلگرامی

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا محض تاریکی اور تضادات کا مجموعہ ہے اور یہ چاند، سورج محض روشنی کے وہ استعارے ہیں جو انسان کو اپنے اندر کے اندھیرے دور کرنے پر اکساتے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی ایسے ہی انسانوں سے تھا۔ جن کا پیغام اور تعلیمات کے اثرات ایسی ہی تاریکی دور کرنے پر متوجہ کرتے رہے۔ مخلوق خدا کو آپ سے فیض حاصل ہوتا رہا کہ یہی باری تعالیٰ کی منشا تھی۔

اللہ کے پیغام کے امین، روشنی کے مینار ایک ولی کی روداد



سمرقند کے قاضی عبدالسلام خجی اپنے زمانے کے عالم باعمل اہل فضل وصفا اور صاحب وجد وحال بزرگ تھے۔ یہ تلاش معاش میں اپنا وطن چھوڑ کر کابل پہنچے اور وہیں شادی کرلی۔ یہیں ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ قاضی عبدالسلام نے اپنے بیٹے کا نام سید رضی الدین محمد باقی رکھ دیا۔ یہ صحیح النسب حسینی سادات کا خاندان تھا۔ بیٹے کی پیدائش 971 بمطابق 1563ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ سن ہجری کا یہ سال تاریخ میں یادگار ثابت ہوگا اور پیدا ہونے والا بچہ خواجہ باقی باللہ کے نام سے شہرت اور حضرت خواجہ مجدد الف ثانی کے پیر و مرشد ہونے کا شرف حاصل کرے گا۔

قاضی عبدالسلام اپنے بیٹے کی پیشانی بہت غور سے دیکھتے تھے انہیں بیٹے کی پیشانی میں ایسا نور دکھائی دیتا جس کی شعاعیں ششں

جہت پر محیط تھیں اور جس کی زد میں امیر و غریب، عوام و خواص، راعی و رعایا، حاکم و محکوم اور خورد و کلاں تھے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتے رہتے۔ ''بیوی! معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے گویا میرے گھر میں ایک آفتاب اتر آیا ہے اور ''عنقریب'' اس کی توانائی اور روشنی سے ایک زمانہ مستفیض ہوگا۔'' بیوی اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ... ملا دیتی اور دل سے یہی دعا مانگتی کہ خدا شوہر کی زبان مبارک کرے۔

جب خواجہ محمد باقی پانچ سال کے ہوگئے تو باپ نے کابل کی مشہور درس گاہ خواجہ سعد کے مکتب میں داخل کروا دیا۔ یہاں قرآن پاک حفظ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی ضروری مسائل بھی حفظ کرتے رہے۔ دس سال کی عمر میں عربی کی تعلیم شروع کی اور مکتب سے فارغ ہوکر اپنے عہد کے مشہور عالم مولانا صادق حلوائی کی شاگردی اختیار کی۔ مولانا کی صحبت میں خواجہ محمد باقی کی صلاحیتیں اجاگر ہونے لگیں۔ استاد کو اپنے ہونہار اور غیر معمولی شاگرد میں معلوم نہیں کیا نظر آیا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر ماوراءالنہر چلے گئے وہاں بھی تحصیل علم کا عمل جاری رہا اور تیس سال کی عمر میں خواجہ محمد باقی کا شمار جید علما میں ہونے لگا۔

اب خواجہ محمد باقی کا کسی ایک جگہ دل نہیں لگتا تھا۔ طبیعت تصوف و سلوک کی طرف مائل رہنے لگی اور اس عہد کے نامی گرامی اولیاء کی صحبتوں میں حاضریاں دینے لگے۔ علم تو حاصل کیا ہی تھا اب کمالات باطنی کا اکتساب بھی شروع ہوگیا۔ اس جہد و سعی میں انہوں نے بلخ، بدخشاں، ماوراءالنہر کے دوسرے شہروں اور ہندوستان کے اکثر مقامات کا سفر کیا۔ خواجہ محمد باقی مراقبے میں چلے جاتے اور اللہ کی یاد میں دنیا و مافیہا کو بالکل بھلا دیتے۔

دوران سفر آپ لاہور پہنچ گئے۔ تنہائی کی تلاش میں یہ معلوم نہیں کہاں کہاں پہنچ جاتے۔ میدان، کوہستان، ویرانہ، قبرستان کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں خواجہ باقی نہ جاتے ہوں۔ آپ کی ماں کابل میں تھیں اور بیٹے کی جدائی کے غم میں آنسو بہاتی رہتی تھیں۔ کسی نے انہیں اطلاع دی کہ لاہور میں سے آپ کے بیٹے کو دہلی میں دیکھا تھا۔ کھویا کھویا کسی شے کی تلاش میں گم ادھر ادھر پھر رہا تھا۔

ماں کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھ جاتے۔ ''اے اللہ العالمین! میرے بیٹے پر رحم فرما اور جس شے کی تلاش میں وہ سرگرداں ہے اس سے اس کو نواز دے۔''

دوسری طرف لوگ خواجہ سے کہتے۔ ''جناب، آپ کی ماں آپ کے لیے بہت بے قرار رہتی ہے۔ آپ جلد از جلد اس تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔''

خواجہ باقی جواب دیتے۔ ''ہاں جب میں اس کو پا جاؤں گا تو ضرور اپنے گھر جاؤں گا۔ ابھی تو اس کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔'' لوگ ان پر ہنسنے لگتے۔ جنہیں خواجہ باقی سے دلچسپی ہوگئی تھی وہ ان کا پیچھا کرتے اور یہ دیکھ کر حیران اور پریشان ہوجاتے کہ ابھی تو خواجہ باقی آبادی میں ہیں اور کچھ دیر بعد ویرانے میں پہنچ گئے۔ ابھی تو انہیں جنگل میں دیکھا گیا تھا مگر کچھ ہی دیر بعد وہ قبرستان میں نظر آتے پھر دیکھنے میں آتا کہ کوئی شخص کوہستانی سلسلوں میں محو سفر ہے۔ جب پاس جا کر پہچاننے کی کوشش کی جاتی تو یہ خواجہ باقی نکلتے۔

کسی شخص نے ان کا راستہ روک لیا اور پوچھا۔ ''جناب! یہ چکر کیا ہے؟ کیا آپ کے پاؤں میں آبلے نہیں پڑ جاتے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''آبلے پڑ کیوں نہیں جاتے!''

اس شخص نے کہا۔ ''اگر آبلے پڑ جاتے ہیں تو آپ یہ صحرا نوردی ترک کیوں نہیں فرماتے؟''

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ''جس کو تم صحرا نوردی کہتے ہو وہ کسی شے کی تلاش کا با مقصد سفر ہے اور اس تلاش میں چونکہ شوق کی آگ مشتعل ہے اس لیے تکلیفوں اور اذیتوں کا خیال یا احساس تک نہیں ہوتا۔''

اس شخص نے پوچھا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں؟''

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ''بالکل پوچھ سکتے ہو۔ میں اس کا جواب دوں گا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''تو آپ سمجھ لیں کہ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ کس شے کی طلب آپ کو آوارہ و سرگرداں کیے ہوئے ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''کسی ولی کامل کی تلاش۔ کسی مرد کامل کی جستجو لیکن یہ کہیں مل ہی نہیں رہا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''جب وہ ابھی تک نہیں ملا تو آگے کیا امید کہ وہ مل ہی جائے گا۔''

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ''تو اس شوق کو کیا جانے۔ کوشش اور تلاش میرا فرض ہے اب وہ ملے یا نہ ملے یہ میری قسمت۔ اگر میری طلب صادق ہے تو میں اس کو پا کر رہوں گا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''ایک بات میری بھی مانیے۔ آپ اپنے گھر واپس جائیں جہاں آپ کی ماں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جس

مردِ کامل کی آپ کو تلاش ہے وہ اگر مل بھی گیا تو اس سے آپ کو حاصل کیا ہوگا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ناصح تو بہت مل جاتے ہیں لیکن ہمت افزائی کرنے والا ایک بھی نہیں ملتا۔ تیری نصیحتوں کا شکریہ، میں تلاش اور جستجو جاری رکھوں گا۔"

اس شخص نے برا سا منہ بنایا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔ "غریب اس کی تلاش میں ہے جس کا وجود ہی نہیں۔ مردِ کامل، اس دنیا میں ایک چیز بھی کامل نہیں پھر یہ مردِ کامل کہاں ملے گا۔ آپ پر اللہ اپنا رحم کرے۔" خواجہ باقی کو اس شخص کے سوال جواب سے بڑی اذیت پہنچی مگر صبر سے کام لیا۔

اس طلب اور جستجو میں آپ کو کیچڑوں اور دلدلوں سے بھی گزرنا پڑا مگر آپ باز نہ آئے۔

ایک دن اسی صحرا نوردی میں انہوں نے ایک ننگ دھڑنگ شخص کو برفانی علاقے میں سفر کرتے دیکھا، اس پر موسم کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ خواجہ باقی اس حیرت انگیز مشاہدے سے متاثر ہو کر اس فقیر کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ "اے اللہ کے ولی! میں کچھ عرصے آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔"

درویش نے چونک کر خواجہ باقی کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر اپنی راہ لی۔ خواجہ باقی اس کے پیچھے چل پڑے۔ درویش نے پلٹ کر خواجہ باقی کو دیکھا اور دوڑنا بھاگنا شروع کر دیا۔ گویا وہ ان سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا۔ آپ نے اس کا پیچھا کیا اور خود بھی دوڑنے لگے۔ دونوں بھاگتے بھاگتے پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد درویش ایک چٹان پر کھڑا ہو گیا اور ایک پتھر تان کر خواجہ کے پاس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

خواجہ باقی کو ڈر لگا کہ کہیں یہ ننگ دھڑنگ شخص انہیں زخمی نہ کر دے۔ انہوں نے دور ہی سے کہا۔ "بابا! میں نے کیا خطا کی ہے جو پتھر تان رکھا ہے؟"

درویش نے غصے میں کہا۔ "تو میرا پیچھا کیوں کرتا ہے؟"

خواجہ نے جواب دیا۔ "میں نے آپ کا پیچھا نہیں کیا، میں تو آپ کی صحبت میں رہنے کا متمنی ہوں۔"

درویش نے تنک کر کہا۔ "لیکن میں تیری صحبت میں نہیں رہنا چاہتا۔"

خواجہ باقی کو بڑا دکھ پہنچا، بولے۔ "بابا! زبردستی کی بات نہیں ہے میں تو عاجزانہ درخواست کر رہا ہوں۔ اگر آپ صحبت میں رہنے کی اجازت دیں گے تو آپ کے پاس رہ لوں گا ورنہ مجبوری ہے۔"

درویش نے کہا۔ "میں تجھ کو اپنے پاس رہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

خواجہ باقی لاجواب ہو کر جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد عرض کیا۔ "اچھا جناب! میں آپ کے پاس نہیں آؤں گا لیکن دور دور رہ سکتا ہوں۔"

درویش نے پوچھا۔ "وہ کیوں...... میں تو تیرے سائے تک سے نفور ہوں۔"

خواجہ باقی نے عرض کیا "میں نے ایک بات آپ کی مان لی ایک بات آپ میری مان لیجیے۔"

درویش نے سکوت اختیار کیا۔ آپ نے اسے درویش کی رضامندی سمجھا اور درویش سے دور دور رہنے لگے۔ اب درویش نے مستقلاً چلنا اختیار کیا.... کبھی تیز تیز اور کبھی آہستہ آہستہ۔ خواجہ باقی عاجز آ گئے لیکن انہوں نے بھی اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ اس درویش کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

ایک دن درویش نے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ برف پر ننگے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ خواجہ باقی نے بھی اس کی اتباع میں بھاگنا شروع کر دیا لیکن سرد ہوائیں انہیں پریشان کر رہی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ گر گئے، درویش نے انہیں مڑ کر گرا ہوا جو دیکھا تو زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا۔ "میرا مقابلہ کرے گا۔ بڑا آیا مقابلہ کرنے والا۔ اب میں دیکھوں گا تو میرا کس طرح پیچھا کرتا ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں اس راہ میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر آپ کی صحبت میں رہنا نہیں چھوڑوں گا۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھے آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔"

درویش نے ہنس کر کہا۔ "اٹھ اٹھ، میں آگے جا رہا ہوں۔ میرا پیچھا کر۔ یوں لیٹے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ شاباش جلدی سے کھڑا ہو جا۔"

خواجہ باقی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ درویش نے پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ خواجہ باقی بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ کافی

دیر بعد درویش ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ وہاں ایک درخت کے سوا جو درخت تھے وہ چھوٹے چھوٹے تھے اور ان کے سائے میں کھڑا نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ خواجہ باقی درویش سے کچھ فاصلے پر آسمان تلے کھڑے ہو گئے۔

درویش نے بڑی محبت سے انہیں اپنے پاس بلایا۔ "وہاں کیوں کھڑا ہے میرے پاس درخت کے سائے میں آجا۔"

خواجہ باقی نے درویش کو سوالیہ اور اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ درویش نے کہا۔ "میری صورت کیا دیکھتا ہے میں نے کہہ جو دیا کہ میرے پاس آجا۔"

خواجہ باقی ہمت کر کے درویش کے پاس چلے گئے اور اس کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہو گئے۔ درویش نے پہلے تو انہیں مسکرا کر دیکھا۔ اس کے بعد ایک زوردار پتھر خواجہ باقی کے منہ پر رسید کر دیا۔ خواجہ باقی چکرا کر گر گئے۔ گرتے ہی درویش نے انہیں ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا۔ خواجہ باقی نے بچنے کی کوشش نہیں کی کہا۔ "میں آپ کو پسند کرتا ہوں آپ مجھ کو جان سے مار دیں میں اس کو اپنے حق میں اعزاز سمجھوں گا۔"

درویش نے سر پر ایک ہاتھ اور رسید کر دیا اور کہا۔ "اگر یہ تیرے حق میں کوئی اعزاز ہے تو میں اس اعزاز سے تجھ کو روز ہی نواز سکتا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں آپ کی مار کو بھی اعزاز ہی سمجھ سکتا ہوں۔"

درویش کو ہنسی آ گئی، کہا۔ "بھائی تو تو مزے کا انسان ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں کیا خاک مزے کا انسان ہوں۔"

درویش نے ان کی گدی پر ایک ہاتھ رسید کر دیا اور پوچھا۔ "کہو بیٹا کیسی رہی، مزہ آیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں آپ کی ہر مصیبت برداشت کروں گا لیکن آپ کی رفاقت نہیں چھوڑوں گا۔"

درویش نے کہا۔ "تو اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے چلا جا اور جو کرنا ہے اپنے طور پر کر۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں اپنا وقت اس وقت تک برباد کرتا رہوں گا جب تک آپ اپنا وقت برباد کرتے رہیں گے۔"

درویش نے پوچھا۔ "اچھا بتا تو چاہتا کیا ہے؟"

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ "بابا! مجھے درویش کامل کی تلاش تھی سو وہ آپ کی شکل میں مل گیا۔ اب میں آپ کے ذریعے خدا کو تلاش کروں گا۔"

درویش زور زور سے ہنسنے لگا۔ "خدا کو...... کس خدا کو...... ؟ یہ کون ہے...... ؟ میری تو اس سے ملاقات نہیں ہوئی، ورنہ ہی میں اس سے واقف ہوں۔"

خواجہ کو درویش کی باتیں اچھی نہیں لگیں، بولے۔ "تعجب ہے کہ آپ خدا کے بارے میں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔"

درویش نے کہا۔ "ہاں میں خدا کے بارے میں ایسی باتیں کر رہا ہوں۔ اگر وہ کہیں موجود ہے تو اس سے ملاقات ہونا چاہیے تھی مگر ہمیں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو یہ کہتا کہ اس نے خدا کو دیکھا یا اس سے ملاقات کی ہے اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ نہیں ہے...... لا الہ۔"

خواجہ باقی کے دل پر چوٹ سی لگی کہ جس شخص کے پیچھے انہوں نے اتنا وقت برباد کیا وہ کیسی کافرانہ اور ملحدانہ باتیں کر رہا ہے۔

درویش نے کہا۔ "اب تو تجھے میری حقیقت معلوم ہوئی۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

خواجہ باقی نے یوں محسوس کیا گویا اندر سے کوئی انہیں سمجھا رہا ہے کہ خواجہ باقی درویش کی باتوں میں قطعی نہ آنا۔ یہ فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھتا ہے جو ایسی روش اختیار کرتے اور ایسی باتیں کرتے ہیں کہ دنیا ان سے دور دور رہے۔ یہ بھی تجھے بھگانے کی خاطر ایسی باتیں کر رہا ہے۔ خواجہ باقی نے کہا۔ "بابا! میں نے ایک بار جب یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ کو نہیں چھوڑوں گا تو میری خوش قسمتی یا بدقسمتی کہ مجھے آپ سے کچھ ملتا ہے یا نہیں، میں بہرحال آپ ہی کے ساتھ رہوں گا۔"

درویش آگ بگولا ہو گیا۔ "او سگِ دنیا، لالچی انسان! تیری سمجھ میں میری باتیں کیوں نہیں آ رہی ہیں۔ کیا میں سمجھانے میں ناکام رہا ہوں؟"

آپ نے فرمایا۔ "میں سگِ دنیا بھی ہوں اور لالچی انسان بھی مگر میں رہوں گا آپ کے ساتھ ہی۔"

درویش نے چڑ کر کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو آ میرے ساتھ چل، میں بھی تیری ہمت اور حوصلے کا اندازہ لگائے لیتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "بسم اللہ، میں تیار ہوں۔"

درویش پہلے تو تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ آپ نے بھی اسی کی طرح چلنا شروع کر دیا پھر درویش نے بھاگنا شروع کر دیا آپ بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگے۔ درویش بھاگتے بھاگتے ایک مکان میں گھس گیا۔ خواجہ باقی نے بڑی ہمت کی کہ مکان میں داخل ہو جائیں لیکن ان کی ہمت نہیں پڑی اور دروازے پر بیٹھ کر درویش کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

بڑی دیر ہو گئی مگر درویش باہر نہیں نکلا۔ خواجہ باقی کو شبہ گزرا کہ نہیں یہ مکان درویش کے کسی رشتے دار کا تو نہیں کیونکہ اگر یہ کسی غیر کا گھر ہوتا تو درویش کو دھکے دے کر نکالا جا چکا ہوتا۔ خواجہ باقی نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ خواجہ باقی نے ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک جوان مشتنڈا نمودار ہوا اور تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "کیا بات ہے، تمہیں کس سے ملنا ہے؟"

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ "تقریباً ایک گھنٹا پہلے اس مکان میں ایک درویش داخل ہوا تھا۔ میں اس کے انتظار میں باہر کھڑا ہوں۔"

جوان نے طنزاً کہا۔ "بھائی کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ یہاں تو کوئی درویش نہیں آیا اور پھر وہ یہاں کیا لینے آئے گا۔ کہاں وہ درویش اور کہاں یہ میرا گھر۔ اس کا میرا گھر سے کیا تعلق۔"

خواجہ باقی کو بڑا دکھ ہوا کہ درویش انہیں دھوکا دے کر چلا گیا۔ اب وہ مایوس ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ ابھی وہ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ کسی نے پیچھے سے قہقہہ لگایا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہی درویش کھڑا ہنس رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "بس دیکھ لیا تیرا عشق، تیری طلب صادق، میں نے تو تیرا ساتھ چھوڑا نہیں اور تو ہے کہ میرے بغیر واپس جا رہا ہے۔"

خواجہ باقی تیزی سے درویش کی طرف مڑے اور فوری طور پر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ انہیں دل کے اندر سے ایک آواز سنائی دی۔ "خواجہ باقی! درویش کو پہچاننے کی کوشش کر، یہ تجھے آزمائش میں ڈال رہا ہے۔"

یہ درویش کے پاس گئے اور کہا۔ "بابا! مجھے پریشان نہ کیجیے میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔"

درویش نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ "ہوں .... تو میرا ساتھ کیوں نہیں چھوڑے گا۔ میں پتھر مار مار کر تیری جان لے لوں گا۔ آخر تو سمجھتا کیا ہے خود کو۔"

خواجہ باقی نے درویش کی ایک نہ سنی اور اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ درویش نے پتھر اٹھا کر مارنا شروع کر دیے۔ خواجہ باقی کا سر اور جسم کے مختلف حصے لہولہان ہو گئے۔ درویش انہیں زخمی کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ خواجہ باقی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ درویش بھاگ کر ایک جھونپڑی میں گھس گیا۔ خواجہ باقی بھی اس کے ساتھ ہی اندر چلے گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ درویش چھوٹی سی چوکی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس نے خواجہ باقی کو دیکھتے ہی کہا۔ "خواجہ محمد باقی آگے آؤ میرے قریب۔"

خواجہ باقی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن وہ درویش کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

درویش نے چوکی چھوڑ دی اور خواجہ باقی کو حکم دیا۔ "باقی باللہ چوکی پر بیٹھ جاؤ۔"

خواجہ باقی نے پوچھا۔ "باقی باللہ .... یہ کیا فرمایا آپ نے۔ باقی باللہ کون؟"

درویش نے جواب دیا۔ "تو ہے باقی باللہ۔ میں نے تجھ کو خواجہ باقی باللہ کر دیا۔"

خواجہ باقی کو درویش کی کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہا۔ "بابا! کہاں تو آپ مجھ سے بیزار تھے اور کہاں یہ عالم ہے کہ مجھے باقی باللہ کا لقب مرحمت فرما رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

درویش نے کہا۔ "خواجہ باقی! جب تو میرے پاس آیا تھا میں نے تجھے پہچان لیا تھا لیکن میں تجھ کو پختہ کرنا چاہتا تھا۔ تیرے ایمان اور تیرے یقین کو طفلانہ کافرانہ باتوں سے پرکھنا چاہتا تھا۔ تیری طلب صادق کی آزمائش مقصود تھی پھر میں نے تجھے گالیاں دیں اور پتھروں سے لہولہان کر دیا اور اس طرح میں تیرے پائے ثبات کی استقامت دیکھ رہا تھا۔ تو سارے ہی امتحانات سے بخیر و خوبی گزر گیا اور اس کا مستحق ٹھہرا کہ میں تجھے باقی باللہ کے لقب سے نواز دوں۔"

خواجہ نے وفورِ جذبات میں کہا۔ "میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

درویش نے کہا۔ "شکریہ میرا نہیں اپنے رب کا ادا کر۔"

خواجہ باقی باللہ درویش کے اصرار پر چوکی پر بیٹھ گئے۔ درویش نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر خواجہ باقی باللہ کو دعائیں دیں اور پھر جھونپڑی کے کسی گوشے سے مٹھائی لا کر خواجہ باقی کا منہ میٹھا کیا۔ اس کے بعد درویش نے انہیں اپنی صحبت میں

اٹھنے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ خواجہ باقی کو چند دنوں میں ہی یہ محسوس ہونے لگا کہ درویش کوئی معمولی شخص نہیں ہے اس نے ریاضت اور مجاہدے کی ایسی تربیت دی کہ خواجہ باقی کا باطن منور ہوگیا۔ ایک دن درویش نے ان سے کہہ دیا کہ "بابا باقی باللہ! میری ذات سے تمہیں جو فیضان حاصل ہو رہا ہے اس میں تمہاری اماں کی دعاؤں کا بڑا ہاتھ ہے۔"

خواجہ باقی نے پوچھا۔ "میری ماں کی دعاؤں سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

درویش نے جواب دیا۔ "باقی باللہ! تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہے اور دن رات تیرے حق میں یہ دعا کر رہی ہے کہ خدا تجھ کو تیرے مقصد کی حصولیابی میں جلد از جلد کامیاب کرے۔" خواجہ باقی باللہ کو رونا آ گیا۔ انہیں اپنی ماں کی یاد آ گئی تھی۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد درویش نے آپ کو شہر جانے کی اجازت دے دی۔ آپ لاہور واپس پہنچے اور لوگوں میں گھل مل گئے۔ انہیں اپنی ذات میں نمایاں تغیر محسوس ہونے لگا تھا پھر یہ باتیں دوسرے بھی محسوس کرنے لگے۔

ایک مسجد میں آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے جو شخص محو نماز تھا اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پر کسی کی نظریں پڑ رہی ہیں لیکن پھر یہ سوچ کر اس واہمے کو دل سے نکال دیا کہ ان کے سامنے جو شخص بھی ہوگا اس کی پشت سامنے ہوگی لیکن کچھ ہی دیر بعد اس شخص نے پھر یہی کیفیت محسوس کی۔ بے اختیار اس کی نظریں اپنے سامنے کھڑے ہوئے خواجہ باقی باللہ پر پڑیں اور وہ یہ دیکھ کر لرز گیا کہ خواجہ باقی باللہ اس کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا منہ قبلہ رو تھا مگر پشت سے وہ کس طرح دیکھ رہے تھے۔ اس کیفیت کو اس نے دیکھ تو لیا مگر بیان نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ناقابل فہم بات اس کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔

نماز پڑھ چکنے کے بعد یہ شخص خواجہ باقی باللہ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ "حضرت! میں آپ سے اس حد تک واقف ہوں کہ آپ غیر ملکی ہیں۔ کیا ہیں، کون ہیں میں نہیں جانتا مگر کچھ ایسی بات بھی ہے جو میرے لیے معما ہے اور میں اگر چاہوں بھی تو اس کو پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میرا نام خواجہ محمد باقی ہے، سمرقند میرا وطن ہے۔ میں خود کابل میں پیدا ہوا۔ تلاش حق میں سیاحت کر رہا ہوں۔ مرد کامل کی تلاش مجھے ادھر ادھر بھگائے پھر رہی ہے، اس کے علاوہ کیا جاننے کی خواہش ہے بیان کرو تا کہ اس کو بھی بیان کر دیا جائے۔"

اس شخص نے رک رک کر کہا۔ "خواجہ محترم! جب آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے میں آپ کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح پوچھوں، اپنا مفہوم کس طرح واضح کروں؟"

آپ نے نظریں نیچی کر لیں اور کہا۔ "اے شخص! جو کچھ تو نے دیکھا اس کو اپنے تک ہی رکھ۔ چرچا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو مجھ سے کیا پوچھنے والا ہے۔"

اس شخص نے کہا۔ "جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ آپ سے میں کیا پوچھنے والا ہوں تو آپ اس کا تسلی بخش جواب دے کر میری پریشانی دور کر دیجیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اے شخص! ریاضت اور مجاہدے کے بعد اگر خدا کی مہربانی شامل حال ہو جائے تو ایسا وقت آجاتا ہے کہ انسانی سینہ جوش انوار سے ابلنے لگتا ہے اور یہ نور ہر بُن مو سے اٹھنے، چھلکنے لگتا ہے جس سے دیکھنے والا یہی محسوس کرتا ہے کہ اس کو دیکھا جا رہا ہے۔"

وہ شخص خاموش ہوگیا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے اس شخص سے کہا۔ "کیا تو نماز کے لیے مسجد چلے گا؟"

اس نے جواب دیا۔ "ضرور چلوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "پھر آ میرے ساتھ چل۔" یہ دونوں ایک ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔ وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ آج وہ آپ کے برابر کھڑا ہوا تھا۔ نماز پڑھنے کے دوران اس شخص نے آپ کے سینے سے نکلتی ہوئی ایسی آواز سنی کہ کانپ گیا۔ دل دہل گیا، بہ مشکل نماز ادا کی اور آپ سے پہلے ہی مسجد سے نکل گیا۔

جب آپ نماز پڑھ کر باہر نکلے تو اس شخص کو منتظر پایا۔ آپ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، کس کا انتظار ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ آج میں کل سے زیادہ پریشان ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "وہ کیوں، خیریت تو ہے، وجہ؟"

اس نے جواب دیا۔ "محترم خواجہ! کل تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ آپ پشت سے مجھے دیکھ رہے ہیں لیکن آج میں نے آپ کے اندر سے کچھ عجیب و غریب آوازیں سنیں، ایسی آوازیں کہ میرا دل دہل گیا۔ آخر یہ کیا ہے..... آپ کیا ہیں اور یہ سب آپ ہی کے ساتھ کیوں پیش آ رہا ہے؟"

آپ نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر خاموش رہے اس کے بعد فرمایا۔ "اے شخص، کیا میں نے یہ بات کل ہی نہیں بتا دی تھی کہ میرا سینہ جوشِ انوار سے ابل رہا ہے۔ یہ ابال جو آواز پیدا کر رہا تھا۔ وہی تو نے سن لی اور اس سے بلاوجہ پریشان ہو رہا ہے۔"

وہ شخص آپ کے قدموں میں گر گیا اور رقت زدہ لہجے میں درخواست کی۔ "محترم خواجہ! آپ مجھے شرفِ بیعت سے سرفراز فرمائیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس لائق نہیں ہوں۔"

اس شخص نے مزید اصرار کیا مگر آپ انکار ہی کرتے رہے اور بالآخر آپ نے لاہور کو چھوڑ دیا اور ماوراءالنہر واپس چلے گئے۔ وہاں ماں بھی کابل سے پہنچ چکی تھیں۔ ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور آپ ماں کے سینے سے لگے خوشی کے آنسو بہاتے رہے۔

آپ کو یہاں پہنچ کر یہ محسوس ہونے لگا کہ کسی بزرگ کے دستِ حق کی ظاہری بیعت بہت ضروری ہے، اس کے بغیر منزل پانا مشکل ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں بہت سارے بزرگوں کی بابت سوچا لیکن کسی طرف طبیعت نہیں راغب ہوئی۔ آخر اس عہد کے نامور ترین صوفی خواجہ امکنگی پر نظرِ انتخاب پڑی اور انہیں شدت سے ایسا لگا کہ خواجہ موصوف انہیں بلا رہے ہیں۔ آپ نے عالم تصور ہی میں جواب دیا۔ "پیر و مرشد! میں آیا۔ آپ میرا انتظار کیجیے۔"

ایک دن آپ علی الصباح اٹھے اور نماز فجر ادا کر کے خواجہ امکنگی کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ وہاں خواجہ امکنگی پہلے ہی سے آپ کے منتظر تھے۔ وہ اپنی خانقاہ سے باہر نکلے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ خواجہ باقی باللہ۔ اب تک کہاں رہے؟"

خواجہ باقی باللہ نے جواب دیا۔ "جب آپ یہ جانتے ہیں کہ میں باقی باللہ ہوں تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں ابھی تک کہاں تھا؟"

خواجہ امکنگی نے فرمایا۔ "باقی باللہ! میں نے جو پوچھا ہے اس کو تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

خواجہ باقی باللہ نے اپنی پوری داستان انہیں سنا دی اور کہا۔ "بس اس درویش نے میری کایا پلٹ دی اور اب میں جو کچھ ہوں اسی درویش کا فیض ہے۔"

خواجہ امکنگی نے فرمایا۔ "ہاں وہ شخص تیری تربیت کی خاطر ادھر بھیجا گیا تھا، اس نے اپنا فرض بہت اچھی طرح پورا کیا۔"

خواجہ باقی باللہ نے عرض کیا۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ مجھ کو کسی دست حق پرست کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر میں بیکار محض ہوں۔"

خواجہ امکنگی نے فرمایا۔ "خواجہ باقی باللہ! تو میری خانقاہ میں شب و روز رہ سکتا ہے۔ تو جو کچھ چاہتا ہے مجھ سے مل جائے گا انشاءاللہ۔" خواجہ باقی باللہ اسی وقت خانقاہ میں داخل ہو گئے۔

خواجہ امکنگی نے خواجہ باقی باللہ کو اپنے مریدوں میں شامل کر لیا..... اب تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ شب و روز خواجہ امکنگی کے پاس رہتے رہے۔ آخر ایک دن خواجہ باقی باللہ نے پوچھا۔ "پیر و مرشد! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اب مجھے کہاں رہنا چاہیے؟"

خواجہ امکنگی نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد جواب دیا۔ "فرزندِ من! تو ہندوستان واپس جا، وہاں بڑی ضرورت ہے۔ خدا تیری مدد کرے گا۔"

خواجہ باقی باللہ نے پوچھا۔ "مجھے کب روانہ ہو جانا چاہیے؟"

خواجہ امکنگی نے جواب دیا۔ "میں تو کہتا ہوں تو اسی وقت ہندوستان چلا جا ویسے تیری مرضی، میں حکماً یا جبراً تجھے نہیں بھیج رہا ہوں۔"

خواجہ باقی باللہ یہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ماں نے پوچھا۔ "کہو بیٹا! کیا خبر لائے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ماں! میں ہندوستان واپس جا رہا ہوں کیونکہ....."

ماں نے بات کاٹ دی۔ پوچھا۔ "میں پوچھ رہی ہوں کہ تو ہندوستان کیوں جا رہا ہے، وہاں تجھ کو کس نے بھیجا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ماں یہ میرے پیر و مرشد کا حکم ہے، ماں میں سب کچھ ٹال سکتا ہوں لیکن اپنے پیر و مرشد کا کہنا

نہیں ٹال سکتا۔"

ماں رونے لگیں، بولیں۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں ایک بار پھر تجھ سے جدا ہو جاؤں گی۔ افسوس کہ میں تجھ کو روک بھی نہیں سکتی کیونکہ تجھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے نہیں میرے لیے مانگا ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "ماں، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔"

ماں نے جواب دیا۔ "بیٹے! میں نے خدا سے یہ دعا مانگ رکھی ہے کہ تو میرے بیٹے محمد باقی کے لیے وہی کر، جو اس کے حق میں بہتر ہو کیونکہ میں اس میں خوش ہوں، جو میرے بیٹے کے لیے بہتر ہو۔"

ماں کے پاس سے رخصت ہو کر خواجہ باقی باللہ دوبارہ اپنے پیر و مرشد خواجہ امکنگی کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ "حضرت! میں نے اپنی ماں سے ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ لیکن اب جو میں نے خود کو ٹٹولا تو میں نے اپنے آپ کو اس لائق نہیں پایا، اب میں اس پس و پیش میں ہوں کہ ہندوستان جاؤں یا نہ جاؤں۔"

خواجہ امکنگی نے فرمایا "یہ وسوسۂ شیطان ہے۔ تمہیں ہندوستان جانا ہے کیونکہ یہ حکم ربی ہے۔ تم اس سلسلے میں استخارہ دیکھ لو، خدا کی مرضی واضح ہو جائے گی۔"

خواجہ باقی باللہ نے اپنے پیر کے مشورے پر استخارہ دیکھا۔ انہوں نے عالم رویا میں دیکھا ایک طوطا ان کے سامنے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا اگر یہ طوطا شاخ سے اڑ کر ان کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ جائے گا تو میں اس کا یہ مفہوم لوں گا کہ ہندوستان کا سفر خدا کی مشیت ہے۔ ابھی آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ طوطا اڑا اور آپ کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ گیا۔ آپ نے اپنا لعاب دہن طوطے کی چونچ میں ڈال دیا اور طوطے نے آپ کے منہ میں شکر ڈال دی، یہ شکر وہ کہاں سے اور کس طرح لایا تھا، کچھ پتا نہ تھا۔

آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے اس کا یہ مطلب لیا کہ طوطا خالص ہندوستانی پرندہ ہے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ میرا ہند جانا حکم ربی ہے، لعاب دہن کا یہ مطلب ہے کہ میں ہندیوں کو اپنی باتوں سے حق کی طرف لے آؤں گا اور طوطے کے شکر دینے کا یہ مطلب ہے ہندیوں کی طرف سے مجھ کو جو جواب ملے گا وہ بہت خوشگوار ہوگا۔

خواجہ باقی باللہ نے اپنا خواب خواجہ امکنگی سے بیان کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "عزیز من! طوطا خالص ہندی پرندہ ہے، ہند میں کوئی شخص تجھ سے روحانی فیض حاصل کرے گا اور تو اس سے فیض یاب ہوگا۔"

آپ نے اسی وقت سفر کی تیاری شروع کر دی اور کچھ دنوں بعد آپ کابل پہنچے یہ آپ کی جائے مولد اور وطن تھا، کچھ دن کابل میں رہ کر آپ نے ہندوستان کا رخ کیا اور لاہور میں قیام فرمایا۔ لاہور کے علما اور فضلاء نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے فیض حاصل کیا، آپ نے اس شہر میں ایک سال قیام فرمایا۔ اس کے بعد دہلی روانہ ہو گئے۔ اس دوران آپ نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ آپ سے پہلے آپ کی شہرت دہلی پہنچ چکی تھی۔

آپ جس قافلے میں سفر کر رہے تھے اس میں ایک شخص پیدل چل رہا تھا۔ آپ کچھ دور تک تو گھوڑے پر سوار رہے لیکن پھر اس پر سے اتر پڑے اور اس شخص کو اپنا گھوڑا پیش کر دیا۔

اس نے کہا۔ "میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ گھوڑے پر تو میں بیٹھوں اور آپ پیدل چلیں۔ مجھے معاف رکھیے اور مجھ پر رحم کیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ حکم ربی ہے۔ تو اس پر بیٹھ جا..... میں گھوڑے کے ساتھ پیدل چلوں گا۔"

اس شخص نے شرمندہ ہو کر عرض کیا۔ "حضرت! میں یہ جرأت کس طرح کروں، لوگ جنھے دیکھ کر مجھ کو ہلاک کر دیں گے اور میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے اس کا حل نکال لیا ہے تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جا، میں اپنے چہرے پر چادر ڈال لوں گا اور تیرے گھوڑے کے ساتھ پیدل چلوں گا۔ اس طرح کوئی مجھ کو پہچان بھی نہ سکے گا۔"

آپ نے اس شخص کو اتنا مجبور کیا کہ وہ آپ کی بات ماننے پر آمادہ ہو گیا۔ آپ نے اس شخص کو اپنے گھوڑے پر بٹھا دیا اور اپنے منہ پر چادر ڈال کر خود پیدل چلنے لگے۔ جب منزل قریب آنے لگی تو آپ نے اس شخص کو گھوڑے سے اتار لیا اور اس پر خود سوار ہو گئے۔ منزل پر قیام کیا اور اس شخص سے کہا۔ "ایسا میں نے اس لیے کیا ہے کہ قافلے کے لوگ یہ نہ جان سکیں کہ میں نے پیدل سفر کیا ہے۔"

منزل پر قیام کے بعد جب پھر قافلہ روانہ ہوا تو آپ نے وہی طریقہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ دلی میں داخل ہو گئے۔ یہاں آپ کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ قیام کہاں فرمائیں۔ آپ نے دریائے جمنا کے کنارے قلعہ فیروز آباد کی عظیم الشان مسجد کو اپنے لیے پسند فرمایا۔ یہ بڑی پُرفضا جگہ تھی۔

آپ کی شہرت پروقار انداز میں اس طرح پھیلی جیسے سورج کی کرنیں اس کے طلوع ہونے کے بعد چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ یہ شہرت چھوٹی بستیوں سے بڑی بستیوں تک اور وہاں سے امراء اور شاہی محلات میں داخل ہو گئی۔ یہ دور اکبری کا واقعہ ہے۔ اکبری دور کا وہ حصہ جس میں شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی۔ مغل فرماں روا اکبر کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ بادشاہ خود اپنے عہد کا مجتہد ہے اور اس کو کسی سے فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں۔ اکبر نے ملحدانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ آپ نے اپنے معتقدوں، نیازمندوں اور مریدوں کو شریعت کی پابندی اور سنت نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہونے کی بار بار نصیحت فرمائی اور انہیں پراثر تحریروں سے اسلامی ذمے داریوں کا احساس دلایا۔ آپ کے نیازمندوں اور عقیدت مندوں میں جو لوگ شامل ہوئے تھے ان میں شیخ فرید بخاری، عبدالرحیم خانخاناں، مرزا قلیج خان، صدر جہان جیسے امرائے شاہی بھی شامل تھے۔

آپ اس عہد کے علماء اور دین دار متقی لوگوں کو سنت نبوی ﷺ اور شریعت مصطفوی ﷺ کی پابندی پر آمادہ اور مجبور کرتے رہتے تھے، اپنے مریدوں کو مرید کرنے سے پہلے شریعت کے احیا اور تبلیغ پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور کسی کسی کو تو بڑے اصرار اور طویل آزمائش کے بعد مرید کرتے تھے۔

1008 ھ بمطابق **1599** ء میں خواجہ باقی کی خدمت میں سرہند سے ایک ایسا شخص دہلی آیا جس کے چہرے اور باتوں سے آدمی مرعوب اور دم بخود رہ جاتا تھا۔ یہ شخص "حج بیت اللہ" کے لیے اپنے گھر سے نکلا تھا۔ دہلی میں قیام کیا تو کسی نے اس شخص سے خواجہ باقی باللہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ بزرگ شریعت محمدی ﷺ اور سنت نبوی ﷺ کے زبردست داعی اور مبلغ ہیں۔ یہ صاحب اشتیاق ملاقات میں قلعہ فیروز آباد کی مسجد میں خواجہ باقی کے پاس پہنچ گئے اور اجازت لیے بغیر اندر چلے گئے۔ اس وقت خواجہ باقی باللہ تسبیح پڑھ رہے تھے۔

آنے والا ایک طرف اطمینان سے بیٹھ گیا اور ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا کچھ دیر بعد باقی باللہ نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا، پوچھا۔ "کہو، کہاں سے آنا ہوا؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "جناب! میں سرہند سے آیا ہوں اور "حج بیت اللہ" کو جارہا ہوں، میں نے لوگوں سے آپ کا ذکر سنا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا چیز تھی جو مجھے آپ کے پاس کھینچ لائی۔"

خواجہ باقی باللہ نے کہا۔ "بیٹھو، ہم آپس میں تبادلۂ خیال کیوں نہ کریں۔"

یہ شخص آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں اتنے گھل مل گئے کہ جیسے ازل سے ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ سرہند سے آنے والا شخص آپ سے درخواست کر رہا تھا کہ "آپ مجھے بیعت فرمائیں۔"

خواجہ باقی باللہ نے فرمایا۔ "ایک شرط پر مرید کروں گا۔"

سرہندی نے پوچھا۔ "کون سی شرط؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرے بعد تم میری اولاد کی تربیت کرو گے۔"

سرہندی نے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "تب پھر آجاؤ، بسم اللہ، دیر کس بات کی ہے۔"

آپ نے اس سرہندی کو اپنا مرید کرلیا بعد میں یہ سرہندی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ "میں نے استخارے میں جس ہندی طوطے کو دیکھا تھا اور جس کی چونچ میں، میں نے لعاب دہن ڈالا تھا اور طوطے نے میرے منہ میں شکر ڈال دی تھی وہ شیخ احمد تم ہو۔ تم مجھ سے روحانی تربیت حاصل کرو گے اور میری اولاد تم سے روحانی فیض حاصل کرے گی۔"

اس کے بعد شیخ احمد سرہندی حج کرنے چلے گئے۔

وہ انوار کا سیل جو سینے میں موجزن تھا اور ہر بن مو سے ابلنے لگا تھا مرتکز ہو کر آنکھوں میں ٹھہر گیا۔ آپ اپنی نظریں نیچی رکھتے اور کسی شے یا شخص کو بغور نہ دیکھتے کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو وہ چیز یا شخص اس کا متحمل نہ ہو سکے گا۔

آپ کی خانقاہ میں آنے جانے والوں کا ہجوم رہنے لگا لیکن ان میں ملاقات کم کسی سے ہوتی تھی۔

ایک دن ایک فوجی سردار آپ کے پاس آیا۔ دروازے پر آپ کا خادم کھڑا تھا۔ فوجی سردار نے خادم سے پوچھا۔ "کیا خواجہ صاحب اندر موجود ہیں ؟"

خادم نے جواب دیا۔ "ہاں جناب موجود ہیں، جائیے۔ مل لیجیے جا کر۔"

فوجی نے اپنے گھوڑے کی لگام خادم کو تھما دی اور خود اندر چلا گیا۔ خواجہ باقی اس وقت اندر موجود نہیں تھے۔ کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے۔ فوجی اندر بیٹھ کر آپ کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد آپ واپس آئے اور اپنے خادم کو اس حال میں کھڑا دیکھا کہ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی اور گھوڑا بار بار دم ہلا ہلا کر پاؤں پٹخ رہا تھا۔ آپ نے خادم سے پوچھا۔ "یہ کس کا گھوڑا ہے؟"

خادم نے بے اختیار آپ کی طرف دیکھا۔ آپ بھی اس سے پوری طرح متوجہ تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں تو خادم تڑپ گیا، گھوڑے کی لگام چھوڑ دی۔ گریبان چاک کر ڈالا اور لباس کو تار تار کر کے جسم سے دور کر دیا۔ آپ نے گھبرا کر پوچھا تو یہ کیا کر رہا ہے؟ ہوش میں آ۔"

خادم نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور بار بار یہی رٹ لگائے رکھی۔ "ہائے مار دیا۔ ہائے قتل کر دیا۔ ہائے میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟"

آپ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "اے شخص ہوش میں آ، تجھ کو میری عدم موجودگی میں محتاط رہنا تھا، مجھ سے نظریں نہیں ملانا چاہیے تھیں۔"

خادم نے ناچنا شروع کر دیا۔ خانقاہ کے لوگوں نے اس میں بڑی دلچسپی لی اور اس کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد یہ شخص ایک طرف چلا گیا۔ آپ نے اس کی تلاش میں آدمی چھوڑے مگر اس کا کہیں پتا نہ چلا۔ اس کی کئی دن تک تلاش جاری رہی مگر اس کا دور دور تک پتا نہ تھا اور وہ ایسا لاپتا ہوا کہ پھر کہیں نظر ہی نہ آیا اور ہمیشہ کے لیے ناپید ہو گیا۔ آپ کو اس کی گمشدگی کا دکھ ہوا۔

کئی روز بعد جمعے کے دن آپ نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔ اس وقت بھی سیلِ نور آنکھوں میں مرتکز تھا اور آپ قوت میں پہاڑ ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ مسجد میں داخل ہوئے۔ اس وقت امام خطبہ شروع کر چکا تھا۔ آپ اگلی صف میں چلے گئے۔ امام نے خطبہ پڑھتے پڑھتے آپ کی طرف دیکھا، آپ نے بھی اسے دیکھا۔ امام کی حالت غیر ہو گئی وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا اور چیخنے چلانے لگا۔

کچھ دیر لوگوں نے انتظار کیا کہ امام ہوش میں آئے تو بقیہ خطبہ پورا کرے مگر اس کو ہوش نہ آیا۔ آخر نمازیوں نے ایک دوسرا خطیب کھڑا کر دیا۔ اس نے خطبہ پڑھا اس کے بعد نماز ادا کی گئی۔

آپ رات کو تہجد کے لیے کھڑے ہو گئے۔ کئی گھنٹے بعد جب بستر پر آئے تو انہوں نے اپنے بستر پر ایک بلی کو سوئے ہوئے دیکھا۔ آپ نے یہ سوچ کر اس کو نہیں بیدار کیا کہ وہ آپ ہی بیدار ہو جائے تو بہتر ہے مگر کافی دیر تک انتظار کے بعد جب بلی اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تو آپ بستر سے الگ سردی میں کھڑے رہے۔ فجر کی اذان کے بعد بلی چلی گئی لیکن آپ بستر میں جانے کے بجائے مسجد میں تشریف لے گئے اور وہاں نمازِ فجر ادا کی۔ خواجہ باقی اپنی ذات سے جانور تک کو اذیت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

☆☆☆

آپ اپنے معتقدین میں بیٹھے کسی مسئلے پر غور و خوض فرما رہے تھے کہ چند مہمان اندر داخل ہوئے۔ آپ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے، یہ گرمی کے دن تھے۔ آپ نے مہمانوں کو خانقاہ میں ٹھہرایا۔ لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ مہمان بھوکے تھے آپ کچھ دیر تو مہمانوں سے باتیں کرتے رہے مگر پھر مہمانوں نے کھانے کی خواہش کی۔ آپ نے خادم سے پوچھا۔ "بول، کھانے کا انتظام کس طرح کیا جائے؟ کہاں سے کیا جائے؟"

خادم نے عرض کیا۔ "جنابِ والا! یہیں پڑوس میں ایک نانبائی رہتا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے بات کروں؟"

آپ نے خادم کو اجازت دے دی۔ "جا، چند روٹیاں اور نہاری لے آ جو معاوضہ مانگے گا دے دیا جائے گا۔"

خادم فوراً بھاگا بھاگا نان بائی کے پاس پہنچا اور کہا۔ "بھائی! ہمارے پیر و مرشد خواجہ باقی باللہ کے ہاں چند مہمان آ گئے ہیں اس وقت گھر میں کچھ بھی نہیں ہے پیر و مرشد نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ چند روٹیاں اور نہاری لے آؤں۔ تیری بڑی مہربانی ہو گی اگر نہاری اور روٹیوں کا انتظام کر دے گا۔"

نانبائی نے پوچھا۔ "میں یہ چیزیں ضرور فراہم کیے دیتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ تمہارے پیر و مرشد مجھ کو اس کا معاوضہ کیا دیں گے؟"

خادم نے عرض کیا۔ "جو مانگو گے، دے دیں گے۔"

نانبائی نے کہا۔ ''اگر میں تمہارے پیرومرشد سے دہلی کی حکومت مانگوں تو؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''میں یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا دے سکیں گے اور کیا نہیں دے سکیں گے۔ مگر انہوں نے مجھ سے کہا یہی تھا کہ تم نہاری اور روٹیوں کے معاوضے میں جو چیز مانگو گے تمہیں دی جائے گی۔''

نانبائی نے کہا۔ ''لیکن تمہاری بات پر کس طرح یقین کرلوں، میں تو یہ وعدہ خواجہ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

خادم نے کہا۔ ''تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ تم نہاری اور روٹیاں لے کر میرے ساتھ چلو، میں اگر یہی بات ان کی زبان سے کہلوا دوں تو تم کھانے کی چیزیں انہیں دے دینا لیکن اگر وہ حیص بیص کریں تو تمہیں اس کا اختیار ہوگا کہ کھانے کا سامان انہیں دو یا نہ دو۔''

نانبائی کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''اچھا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، تمہاری تجویز مناسب ہے۔''

نانبائی نے روٹیاں تیار کیں اور بکی ہوئی نہاری میں سے کئی آدمیوں کے لیے نہاری نکالی اور دونوں چیزیں لے کر خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

آپ نے خادم سے پوچھا۔ ''کیا کھانے کا سامان مل گیا؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''جی پیرومرشد مل گیا مگر کھانے کے ساتھ ہی نانبائی بھی آگیا ہے وہ اس کے معاوضے میں معلوم نہیں کیا لینا چاہتا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس کو بٹھاؤ ابھی اس کی بھی سن لوں گا۔''

نانبائی نے عرض کیا۔ ''جناب! میں اس شرط پر کھانے کا سامان لے کر آیا ہوں کہ آپ اس کا وہ معاوضہ ادا کریں گے جس کا میں مطالبہ کروں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے یہ وعدہ کیا تھا اور اس وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔''

نانبائی کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک آگئی۔ پوچھا۔ ''کیا سچ؟ میں جو معاوضہ مانگوں گا ملے گا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے ایک بار کہہ جو دیا۔''

نانبائی نے روٹیاں اور نہاری آپ کے حوالے کر دی اور سرشار لہجے میں بولا۔ ''بجا! میں آپ سے ایک ایسی چیز مانگوں گا کہ دنیا حیران رہ جائے گی اور پھر میں دیکھوں گا کہ خواجہ باقی باللہ اور ایک نانبائی میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔''

خواجہ باقی باللہ نے اپنے مہمانوں کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ ان سب نے اس لذیذ کھانے کو بڑے شوق سے کھایا۔ نانبائی ایک طرف بیٹھ گیا اور مہمانوں کی فراغت کا منتظر رہا۔ جب سب کھانا کھا چکے تو آپ نے نانبائی کو اپنے پاس بلوایا اور پوچھا۔ ''ہاں تو بتا کہ تجھ کو کھانے کے معاوضہ میں کیا دے دیا جائے؟''

نانبائی نے عرض کیا۔ ''کیا اجازت ہے کہ میں جو چاہوں مانگ لوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بات کو طول نہ دے، جو کچھ مانگنا ہے مانگ میں نے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔''

نانبائی آپ کی شکل دیکھنے لگا۔ آخر کچھ دیر بعد بولا۔ ''آپ مجھ کو بھی اپنے جیسا بنا دیجیے۔''

آپ پریشان ہوگئے اور نانبائی سے کہا۔ ''بھائی! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تو اس کے علاوہ کچھ مانگ لے۔''

نانبائی نے شکایتاً کہا۔ ''واہ جناب! میں نے جو مانگ لیا، مانگ لیا۔ میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے جو کچھ بھی تجھے دینے کا وعدہ کیا تھا، اس پر اب بھی قائم ہوں اور قائم رہوں گا لیکن میری خواہش ہے کہ تو اس کے علاوہ کچھ مانگ لے۔''

نانبائی نے عرض کیا۔ ''میں کچھ اور کیوں مانگ لوں، آخر اس میں کیا مضائقہ ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس میں مضائقہ یہ ہے کہ جو کچھ تو مانگ رہا ہے وہ حیثیت سے زیادہ ہے۔ جس برتن میں جتنی سمائی ہوتی ہے اگر اس میں اس سے زیادہ بھر دیا جائے تو اس کے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ یا تو زیادہ شے چھلک کر بہہ جائے گی یا برتن ہی ٹوٹ جائے گا۔''

نانبائی نے کہا۔ ''جناب آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، میں جو کچھ مانگ رہا ہوں، مجھ کو وہی ملنا چاہیے ورنہ جانے دیجیے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے، میں صبر کرلوں گا۔''

آپ نے سکوت اختیار کیا۔ کچھ دیر بعد فرمایا۔ ''افسوس کہ میں تیرا دشمن نہیں ہوں لیکن تو بضد ہے تو میں اپنا وعدہ ضرور پورا

کروں گا۔"

نانبائی بے حد خوش تھا، بولا۔" مجھے آپ سے یہی امید تھی۔"

خواجہ باقی باللہ حجرے میں جاتے ہوئے بولے۔" میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔"

نانبائی ان کے پیچھے پیچھے حجرے میں داخل ہوگیا۔ خادم اور مہمان دونوں کی تکرار اور بحث مباحثے کو بڑے غور سے سنتے رہے تھے، اب وہ بید کھ رہے تھے کہ دیکھیے ہوتا کیا ہے؟

کچھ دیر بعد حجرے کا دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے دو خواجہ باقی باللہ نمودار ہوئے، شکل صورت، لباس، وضع قطع کسی بات میں سرمو فرق نہ تھا۔ ہاں بس چلنے میں فرق تھا۔ انداز میں فرق تھا۔ ایک تو ہوشیار تھا دوسرا مدہوش اور بے خود تھا۔ وہ پاؤں کہیں رکھتا مگر پڑتا کہیں تھا۔ دوسروں نے انہیں اس طرح پہچانا کہ جو ہوشیار تھا وہ خواجہ باقی باللہ تھے اور جو مدہوش اور بے خود تھا وہ نانبائی تھا۔

نانبائی باہر آتے ہی ڈھیر ہوگیا۔ خواجہ باقی باللہ نے اس کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا۔" اے شخص! کیا میں نے تجھ کو آگاہ نہیں کر دیا تھا کہ برتن میں اس کی سمائی سے زیادہ بھر دیا جائے وہ چھلک جاتا ہے یا برتن ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ تو چھلک بھی رہا ہے اور ٹوٹ جانے کا بھی احتمال ہے۔"

مہمانوں نے کہا۔" خواجہ! اس کے لیے کچھ کیجیے۔"

آپ نے فرمایا۔" اب میں کیا کر سکتا ہوں جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اللہ اس پر رحم کرے۔"

نانبائی کی حالت سکر و بے ہوشی تین دن قائم رہی۔ اس عجیب و غریب واقعے کی اتنی شہرت ہوئی کہ دیکھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ تین دن بعد نانبائی چل بسا، برتن ٹوٹ گیا۔

☆☆☆

آپ نے دو شادیاں کیں، دونوں سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ آپ نے بڑے لڑکے کا نام خواجہ عبیداللہ رکھا جو بعد میں خواجہ کلاں کہلائے، دوسرے کا نام خواجہ عبداللہ رکھا جو خواجہ خورد کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ ہمیشہ اس بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ اگر دل کو اطمینان، یک سوئی اور حضور قلب سے ہمکنار کرنا ہے تو بقدر ضرورت پاکیزہ اور حلال کھانا چاہیے، فضول اور بیہودہ بات چیت سے بچا جائے اور دنیا کے طالبوں سے دوری اختیار کی جائے۔

کسی نے پوچھا۔" اگر میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ ذکر میں گزار دوں تو؟"

آپ نے جواب دیا۔" اگر تو ہزار سال ذکر کرتا رہے مگر تیرا کھانا حلال مال کا نہ ہو تو یاد رکھ تیرا روحانی مقصد کبھی بھی حاصل نہ ہوگا۔"

طبیعت میں سادگی اتنی تھی کہ کتنا ہی ناپسندیدہ کھانا مسلسل کھلایا جاتا آپ کو کھانے میں ذرا بھی ملال نہ ہوتا اور کھاتے رہتے۔ یہی حال لباس کا تھا۔ جیسا مل جاتا پہن لیتے۔ لیکن بنیادی شرط یہ تھی کہ وہ صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو۔

ایک دن آپ نے مریدوں اور ارادت مندوں کو جمع کر کے فرمایا۔" لوگو! عجیب بات ہے کہ میں نے مراقبے میں دیکھا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا کوئی نامی گرامی شخص رحلت کر رہا ہے۔"

ایک مرید نے پوچھا۔" کیا مراقبے میں آپ نے اس بزرگ کی صورت دیکھی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔" میں نے اس کی صورت بھی دیکھی ہے لیکن اس کو پہچان نہیں سکا۔"

سنیچر کے دن 25 جمادی الآخر 1012ھ کو عصر کے بعد قلعہ فیروز شاہ میں آپ ..... بلند آواز میں اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہو گئے۔ اور دو تین گھڑی کے بعد آپ اسی عالم میں عالم قدس چلے گئے۔ آپ کا مزار قبرستان قدم شریف میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اب یہ جگہ درگاہ خواجہ باقی باللہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے وفات سے پہلے ہی یہ وصیت کر دی تھی کہ آپ کے مزار پر چھت، گنبد یا قبر نہ تعمیر کی جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی۔

آپ کی تاریخ وفات۔" بحر معرفت بود" 1012ھ اور" نقشبند وقت" 1012ھ سے نکلتی ہے۔

ماخذات

سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دارا شکوہ، طبقات الکبریٰ علامہ شعرانی، تذکرۃ الاولیاء شیخ فرید الدین عطار، انوار اولیاء، رئیس احمد جعفری، خزینۃ الاصفیاء مفتی غلام سرور لاہوری



فضل رحمٰن

ضیا تسنیم بلگرامی

اتباع رسولؐ اور خدا کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنے کے لیے کسی بھی انسان کو اپنے نفس کی قربانی دینا پڑتی ہے اور جو نفس پر اپنی بادشاہت قائم کرلیتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ فاتح قرار پاتا ہے مگر اس معراج پر پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی... اور جو اسے پالیتے ہیں وہ یقیناً اللہ کے مقرب بندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی اسی قافلے سے تھا جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں اور دنیاداروں کو آخرت کا احساس دلاتے ہیں۔

سنت رسولؐ اور احادیث کے قدردان ایک ولی کا ماجرا

یوپی (بھارت) کے قصبہ سندیلہ میں 1209ء میں اہل اللہ نامی بزرگ کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ خاندان صدیقی تھا اور یہ لوگ فیروز شاہ کے زمانے میں وارد ہند ہوئے تھے۔ یہ اللہ والے اپنی بزرگ اور علمیت میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب یہ بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام تاریخ سے نکالا گیا۔ فضل رحمٰن...... معلوم نہیں کہ نام رکھنے والوں کو یہ خیال کیوں آیا کہ مستقبل کی عظیم اور تاریخی شخصیت کا نام تاریخ سے نکالا جائے۔

فضل رحمٰن جب اس لائق ہونے کہ باہر نکل کر بچوں میں کھیلیں تو لڑکوں نے انہیں بڑی عزت دی۔ یہ عزت انہیں اپنے بزرگوں سے پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی۔ بزرگ بچوں کی عزت کریں، تو یہ غیر معمولی بات ہے۔

بچوں کے ساتھ کھیلتے تو اس میں بھی رکھ رکھاؤ رہتا۔ سنجیدگی اور مستقل سوچ۔ بچے شور و غل کرتے، یہ شور و غل سے پرہیز کرتے۔ لڑکے اپنے ساتھیوں کو مارتے پیٹتے مگر فضل رحمٰن مار پیٹ میں کوئی حصہ نہ لیتے۔ دوسرے بچوں میں غضب کی دنیاداری پائی جاتی تھی مگر ان میں دنیاداری کا جوش و خروش نہیں ملتا تھا۔

بچے سڑک پر کھیل رہے تھے۔ ایک بھاگتا تھا اور دس اس سے بچتے پھرتے تھے۔ اسی عالم میں فضل رحمٰن بھی اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ میں مشغول تھے۔ سارے بچے اِدھر اُدھر روپوش ہو چکے تھے اور اس بات کو بھی جان چکے تھے کہ صرف فضل رحمٰن ہی چھپنے والے بچوں کو تلاش کریں گے۔ آپ بچوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ میں مشغول تھے۔ اس وقت وہ سڑک پر تھے انہیں سواریوں کی آمد و رفت کا کچھ خیال نہ تھا۔ اچانک ایک بیل گاڑی دوڑتی ہوئی آتی نظر آئی۔ فضل رحمٰن کسی اور ہی دُھن میں تھے۔ انہوں نے بیل گاڑی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ گاڑی کی ٹکر نے فضل رحمٰن کو گرا دیا اور جب تک وہ سنبھلتے گاڑی کا پہیہ ان کے جسم پر سے گزر گیا۔ کان کا کچھ حصہ کٹ کر خاک میں مل گیا۔ بچوں نے اس حادثے کی بابت جانا تو شور کر دیا۔ ہر طرف سے لوگ دوڑے، بزرگوں نے انہیں گود میں اٹھالیا اور گھبرا کر پوچھنے لگے۔ ”فضل رحمٰن ٹھیک تو ہو، کچھ بولو تو، پہیہ کہاں پر سے گزر گیا؟“

فضل رحمٰن کے ہوش و حواس بالکل بجا تھے۔ انہوں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں سے گزر گئی تھی گاڑی۔“

ایک بزرگ نے سر کو چاروں طرف سے دیکھا، سر پر مٹی کے نشانات موجود تھے اور ایک کان کٹ چکا تھا، وہاں سے خون جاری تھا۔ گھر والے زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ ان کے دل میں موجود یہ اندیشہ انہیں پریشان اور مایوس کر رہا تھا کہ اگر گاڑی کا پورا پہیہ سر پر سے گزر چکا ہے تو بچہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں لیکن بچہ اپنے ہوش و حواس میں تھا اور سوال کرنے والوں کو نہایت سکون و اطمینان سے جواب دے رہا تھا۔ ان میں جو اہلِ نظر تھے انہوں نے بچے کی حیثیت اور مرتبے کا اندازہ لگالیا تھا۔ گھریلو دواؤں سے خون روکا گیا اور فضل رحمٰن کو آرام کی خاطر بستر پر لٹا دیا گیا۔ اب کھیل کود بند، ہر وقت ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی بزرگ ضرور رہتا تھا۔

آٹھ سال کی عمر میں آپ ہردوئی کے قصبہ ملّاواں سے کہیں جا رہے تھے، والد... ان کے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھ میں طوطے کا پنجرہ تھا۔ دونوں پیدل سفر کر رہے تھے۔ ان کے دونوں طرف کھیت تھے۔ کاکن کے درخت لہلہا رہے تھے۔ طوطے نے کاکن کے خوشے جو دیکھے تو ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ والد صاحب نے ہنس کر طوطے کو تسلی دی۔ ”میں سمجھ گیا تو کیوں بول رہا ہے؟ چالاک پرندے! شاید تو کاکن مانگ رہا ہے۔“

اس کے بعد ان کے والد نے کاکن کے خوشوں کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن توڑنے سے پہلے آٹھ سالہ فضل رحمٰن نے باپ کو ٹوک دیا۔ ”باوا جان! خوشے مالک کی مرضی اور اجازت کے بغیر ہرگز نہ توڑیے گا۔“

شاید باپ نے ان کی بات سنی نہیں کیونکہ وہ کسی اور ہی دھن میں تھے۔ کاکن کے خوشے توڑتے ہوئے بے خیالی میں کہا۔ ”یہ پرند بھی کتنا چالاک ہوتا ہے اگر آزاد ہوتا تو کتنے ہی خوشوں کو برباد کر دیتا۔“

فضل رحمٰن نے ایک بار پھر باپ کو منع کیا۔ ”باوا جان! میں کیا کہہ رہا ہوں، میری بات تو سنیے۔“

اتنی دیر میں باپ نے کئی خوشے توڑ کر پنجرے میں ڈال دیے تھے۔ بے خیالی میں بیٹے سے پوچھا۔ ”ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟“

فضل رحمٰن نے کہا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”میں نے کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں کیا۔“

فضل رحمٰن نے کہا۔ ”آپ کو کھیت کے مالک کی مرضی کے بغیر یہ خوشے نہیں توڑنے چاہیے تھے۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”تم پریشان مت ہو، کھیت کا مالک اس وقت یہاں کہیں موجود نہیں ہے۔ کسی دن اس سے اجازت بھی لے لیں گے۔“

فضل رحمٰن نے کہا۔ ''کسی دن کیا، آپ کو ابھی اسی وقت آج ہی اس کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔''

باپ نے کہا۔ ''فضل رحمٰن! ضد مت کر، جب میں نے یہ کہہ دیا ہے کہ میں کھیت کے مالک سے کل یا پرسوں تک اس کی اجازت لے لوں گا تو تم کیوں پریشان ہورہے ہو؟''

لیکن فضل رحمٰن اپنی بات پر اڑے رہے، کہا۔ ''باواجان! آپ نے سب سے بڑی غلطی کی ہے، اس لیے غلطی کو فوراً ہی معافی اور اجازت مانگ کر پاک وصاف کر لیجیے کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ معلوم نہیں کب موت آجائے اور یہ گناہ ساتھ ہی چلا جائے۔''

باپ کو جانے کی جلدی تھی اور بیٹے کو اجازت اور معافی مانگنے کی جلدی تھی۔ باپ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''بیٹے! کیا تم مجھ سے واقف نہیں ہو؟ جو اس قسم کی نصیحتیں کررہے ہو۔''

فضل رحمٰن نے عرض کیا۔ ''باواجان! میں یہ بات بالکل نہیں پسند کرتا کہ کسی کی املاک کو......''

باپ نے اپنی بزرگی اور بڑے پن کی انا میں فضل رحمٰن کی بات نہیں مانی اور وہاں سے چل پڑے، کافی دور چلنے کے بعد باپ کو احساس ہوا کہ وہ اکیلے چل رہے ہیں۔ پلٹ کر جو دیکھا تو پتا چلا کہ فضل رحمٰن کا کن کے کھیت کے پاس چپ چاپ کھڑے ہیں۔ باپ نے چیخ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے فضل رحمٰن! وہاں کیوں کھڑے ہو؟''

فضل رحمٰن نے جواب دیا۔ ''باواجان! میں اس وقت تک یہیں کھڑا رہوں گا جب تک کھیت کا مالک آنہیں جاتا۔ میں اس سے آپ کی طرف سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

باپ کو غصہ آگیا۔ ''تو میری بات پر یقین کیوں نہیں کررہا؟''

فضل رحمٰن نے جواب دیا۔ ''باواجان! بات یقین کی نہیں، وقت اور اس کی نزاکت کی ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا اور کس ملک میں وصال پائے گا۔''

باپ نے پوچھا۔ ''تو گویا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟''

فضل رحمٰن نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ سے جو کہہ دیا ہے، میں اس پر ثابت قدمی سے عمل کروں گا۔''

باپ سے بھی نہیں چلا گیا، بیٹے کے پاس واپس چلے آئے، کہا۔ ''تم بلاوجہ ضد کررہے ہو۔ کھیت کا مالک معلوم نہیں کب آئے گا۔ ہم یہاں اس کا کب تک انتظار کریں گے۔''

فضل رحمٰن نے کہا۔ ''تب پھر آپ ایسا کیجیے کہ ان خوشوں کو پنجرے سے نکال کر کھیتوں میں ڈال دیں۔''

باپ نے یہ تجویز پسند کی اور کا کن کے خوشوں کو پنجرے سے نکال کر کھیت میں پھینک دیا۔ اس کے بعد آپ اپنے والد کے ساتھ آگے روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو بڑی پریشانی لاحق ہوگئی۔ گھر کا نظام ہی درہم برہم ہوگیا۔ پھر اسی دوران ملک میں قحط پڑ گیا اور ہر طرف بھوک نے عبرتناک منظر پیش کرنے شروع کردیے۔ ماں نے بیٹے سے پوچھا۔ ''بیٹے! ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''لوگوں سے اجتناب، عزیزوں اور رشتے داروں سے پرہیز۔''

ماں اس جواب سے بہت خوش ہوئیں، پوچھا۔ ''کیوں؟ تُو نے یہ مشورہ کیوں دیا آخر؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ماں! رشتے داروں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو قحط سالی کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے مگر اس سے ہماری قناعت اور خودداری کو بڑا نقصان پہنچے گا۔''

ماں نے پوچھا۔ ''پر گزر اوقات کس طرح ہوگی؟''

گھر میں ایک درخت لگا ہوا تھا۔ آپ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اس درخت کے پتے اور چھال کو ابال ابال کر کھایا جاسکتا ہے۔''

ماں نے بیٹے کو سینے سے لگالیا اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا، بولیں۔ ''مجھ کو تجھ سے اسی جواب کی امید تھی۔ خدا تجھے جزائے خیر دے۔ تو نے بھی غریبی کی شرم رکھ لی۔''

اس کے بعد آپ کی ماں نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ درخت کی چھال اور پتے ابال ابال کر خود کھائے اور بیٹے کو بھی کھلائے۔

آپ نے تعلیم حاصل کی اور دہلی کا سفر اختیار کیا۔ دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل شروع کر دی۔ ان دنوں شاہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور یہ ایک دن میں دو دو جزو بخاری کے پڑھا کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''برخوردار! یہاں کتنے عرصے قیام کا ارادہ ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''صرف ایک ماہ۔''

شاہ عبدالعزیز نے فرمایا۔ ''صرف ایک ماہ! لیکن صرف ایک ماہ میں کیا پڑھو گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں مجبور ہوں کیونکہ میری والدہ نے مجھے ایک ماہ دہلی میں ٹھہرنے کی اجازت دی ہے، میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''افسوس کہ اگر تم صرف چار ماہ میرے پاس رہ جاتے تو میں تمہیں کچھ سے کچھ بنا دیتا۔'' اس کے بعد فرمایا۔ ''اب تم مولوی اسحاق سے پڑھ لیا کرو۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بہتر ہے، میں انہی سے پڑھ لیا کروں گا۔''

اور انہوں نے مولوی اسحاق سے پڑھنا شروع کر دیا اور ٹھیک ایک ماہ بعد اپنے گھر واپس چلے گئے۔

جب آپ دوبارہ دہلی تشریف لے گئے تو معلوم ہوا شاہ عبدالعزیز محدث وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے اس بار بھی مولوی اسحاق سے علم حدیث حاصل کیا۔

دہلی میں حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں شاہ محمد آفاق کو بڑی شہرت حاصل تھی اور عشق الٰہی کے مارے ہوئے یہاں حاضریاں دیتے تھے اور اپنے عشق میں اور آگ لگا لیتے تھے۔ آپ بھی شاہ محمد آفاق کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگے۔ شاہ صاحب ان سے بے حد التفات فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنی خواتین کا پردہ تک ختم کرا دیا تھا۔

آپ نے جو کچھ پڑھا تھا، استعداد اس سے کہیں زیادہ تھی، یہاں تک کہ اس عہد کے لوگ متفقہ طور پر انہیں شبلی و جنید کا ہم پلہ قرار دیتے تھے۔ آپ نے پہلی شادی کی مگر دو بیٹوں کی پیدائش کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس دوران آپ نے ایک مسجد میں سکونت اختیار کی۔ اس مسجد میں ایک موذن کے سوا کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ موذن بھی اذان دے کر چلا جاتا تھا۔ آپ نے اس مسجد کو آباد کیا اور نماز پڑھانے لگے۔ اس مسجد میں ایک تعزیہ رکھا ہوا تھا، آپ نے فرمایا۔ ''مسجد میں تعزیہ کا کیا کام، اس کو یہاں سے ہٹا دیا جائے۔''

گنج مراد آباد کے خوانین کو تعزیوں سے عقیدت تھی، انہیں یہ بات گراں گزری اور انہوں نے مزاحمت کی۔

ایک خان نے لکھنؤ کے نواب کو خفیہ خط لکھا، اس میں اس نے لکھا۔ ''حضور نواب کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں فضل رحمٰن نامی ایک نوجوان تعزیوں کی بے حرمتی کیا کرتا ہے اگر اس نوجوان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی تو حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے۔''

لکھنؤ کے نواب نے اپنی فوج کو بھیجا اور حکم دیا کہ فضل رحمٰن نامی نوجوان کو فوراً گرفتار کر کے یہاں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ فوج کا ایک دستہ گنج مراد آباد پہنچا اور مولانا کو گرفتار کر کے ان کے پاؤں میں بیڑی ڈال دی اور مراد آباد سے ملیح آباد لے گئے۔ آپ کی گرفتاری کی خبر دور دور تک پہنچ گئی۔ ان دنوں ریاست گوالیار میں محمد جعفر خاں نامی ایک معزز شخص میر منشی تھے اور ان کا تعلق سندیلہ سے تھا۔ انہوں نے جب یہ خبر سنی تو نواب صاحب کو ایک خط لکھا، اس میں انہوں نے اس نوجوان کے مقام اور مرتبے سے نواب صاحب کو مطلع کیا تھا اور بتایا تھا کہ مولانا فضل رحمٰن کے نانا ہم سب کے استاد تھے اور آپ کے بھی۔ کیا آپ اپنے استاد کے نواسے پر ظلم کر کے خوش ہوں گے؟ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ مولانا کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ غلط ہے۔

اس خط نے بڑا کام کیا۔ نواب نے ان کی رہائی کا فرمان جاری کر دیا۔ آپ کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں اور آپ یہاں سے گنج مراد آباد واپس تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی مرحوم بیوی کے چچا رہتے تھے، وہ مولانا کے مقام سے آگاہ تھے۔ ان

کی ایک بھتیجی کنواری بیٹھی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی بھتیجی کا عقد مولانا سے کر دیں مگر لڑکی کے بھائی مخالفت کرنے لگے، بولے۔ "ہم اپنی بہن کی شادی اس فقیر سے نہیں ہونے دیں گے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

لیکن چچا نے یہ شادی کرادی۔ شادی کے بعد پریشانی کا دور شروع ہوا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ مہینوں اروی ابال ابال کر کھاتے رہے۔ آپ سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سختی سے عمل کرتے تھے، یہاں تک کہ جب آپ نے محنتِ شاقہ اور ریاضت مسلسل سے نمایاں ترین مقام حاصل کر لیا تو کسی نے آپ سے پوچھا۔ "حضرت! یہ بلند مقام آپ نے کس طرح حاصل کیا؟"

فرمایا۔ "سنتِ نبویہؐ پر عمل پیرا ہونے سے۔" پھر مزید فرمایا۔ "غوث ہو یا قطب، اگر وہ خلافِ شرع زندگی گزارتا ہے تو وہ کچھ بھی نہیں۔"

آپ کو سنت کا بے حد خیال رہتا تھا۔ آپ سے کسی نے پوچھا۔ "حضرت! آپ یہ فرمائیں کہ آپ کے وصال کے بعد چہلم و چہارم ہونا چاہیے یا نہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں ہونا چاہیے۔"

سوال کیا گیا۔ "کیوں؟ ایسا تو ہوتا چلا آیا ہے پھر ہم کیوں نہ کریں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "صحابہؓ کا یہ فعل نہ تھا۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے ایسا اس لیے نہیں کیا تھا کہ رسول اللہؐ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ہمارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات نمونہ ہے کسی اور کی نہیں۔"

کسی نے سوال کیا۔ "حضور والا! انتقال کے بعد مزار پر عرس ہونا چاہیے یا نہیں؟"

جواب دیا۔ "نہیں کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہونا چاہیے کہ جب سنو کہ فضل رحمٰن کا انتقال ہو گیا تو چار قل پڑھ کر بخش دینا، بس اتنا ہی کافی ہے، عرس وغیرہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔"

ایک ارادت مند نے کہا۔ "دوسرے بزرگوں کا عرس تو ہوتا ہے پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بس کہہ جو دیا کہ میری قبر پر میلا نہیں لگنا چاہیے۔"

آپ حدیث بڑی عقیدت اور محبت سے پڑھا کرتے تھے۔

آپ کے حالات یک بیک بدل گئے اور ہر طرف سے مال و زر آنے لگا لیکن آپ کو اس سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔

ایک بار کساد بازاری کی وجہ سے چاروں طرف مالی پریشانیاں لاحق ہو گئیں، آپ نے اپلے خریدنے شروع کر دیے۔ لوگوں نے پوچھا۔ "آپ اپلوں کا کیا کریں گے؟"

جواب دیا۔ "آس پاس والوں کو آگ کی ضرورت رہتی ہے۔ میں نے ان کے لیے مزید سامان یہ کر دیا کہ جب وہ یہاں سے آگ لے کر جاتے ہیں تو اس آگ کے لیے یہ اپلے بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اس طرح ان کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔"

ایک بار کسی کی طرف سے آپ کی خدمت میں پانچ سو روپے نذر میں آئے۔ آپ نے اسی وقت اعلان کر دیا کہ میرے حجرے کی دیوار گرنے والی ہے اس لیے بستی کے لوگوں میں اعلان کر دو کہ جسے مزدوری کرنا ہو، وہ پھاوڑا اور کدال لے کر میرے پاس آ جائے۔

پاس پڑوس کے شرفاء کدال پھاوڑے لے کر پہنچ گئے۔ وہاں تو ہر چیز مضبوط تھی۔ کسی کو ذرا سا ہاتھ بھی نہیں لگانا پڑا اور چشم زدن میں سارا روپیا تقسیم کر دیا اور ہاتھ جھاڑ کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

آپ کے پاس ارادت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ انگریز حکومت کو تشویش رہنے لگی۔ حکومت نے الہٰ آباد ہائی کورٹ کو اس کام پر مقرر کیا۔ اس نے ایک تحقیقاتی افسر آپ کے پاس بھیج دیا۔ یہ افسر انگریز تھا۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچا، اس وقت حیدرآباد دکن کے نواب خورشید جاہ بھی آپ کے پاس آئے ہوئے تھے۔ انگریز تحقیقاتی افسر نے آپ کے حالات کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کے بعد آپ سے پوچھا۔ "جناب! کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کے پاس اس قدر لوگ کیوں آتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ ''توبہ کرنے۔ یہ سارے لوگ میرے سامنے مجھے گواہ بنا کر توبہ کرتے ہیں، اگر تم چاہو تو تم بھی شرک سے توبہ کر کے مجھے گواہ بنالو۔ میں تمہیں بھی مسلمان بنانے کو تیار ہوں۔''

آپ نے جس نرم لہجے میں بات کی تھی، اس نے انگریز افسر کو بہت متاثر کیا، بولا۔ ''بابا صاحب! آپ درویش آدمی ہیں اگر آپ پسند کرو تو ہم آپ کا کچھ مدد کرنے کو تیار ہے۔ یعنی آپ اپنی خانقاہ کو بہت بڑا بنالیں۔''

آپ نے انگریز افسر کا شکریہ ادا کیا، فرمایا۔ ''میرے لیے میرا حجرہ اور اس میں اللہ کا ذکر کافی ہے۔''

انگریز تحقیقاتی افسر یہاں سے بہت خوش ہو کر گیا۔

لکھنؤ کے مطبع مصطفائی میں آپ دورانِ سفر قیام فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک بار آپ نے اسی مذکورہ پریس میں قیام کیا اور اس طرح کئی دن تک قیام فرمارہے۔ اتفاق سے انہی دنوں میر صائب علی نامی ایک ہم وطن بھی مصطفائی پریس میں ٹھہرے۔ آپ سے بھی ملاقات کی۔ آپ ایک ایک شخص کا نام لیتے اور پوچھتے۔ ''بھائی وہ شخص ابھی زندہ ہے؟''

دوسری طرف سے جواب ملتا۔ ''جی حضرت! وہ زندہ ہے۔''

آپ پھر کسی کا نام لیتے اور پوچھتے۔ ''کیا وہ شخص ابھی زندہ ہے؟''

ادھر سے جواب ملتا۔ ''ہاں زندہ ہے۔''

آپ نے کئی ناموں کے بعد ارشاد فرمایا۔ ''اللہ انہیں سلامت رکھے۔ معلوم نہیں کس کی دعاؤں کا اثر ہے کہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہیں۔''

میر صائب نے ایک صاحب سے کہا۔ ''آپ ذرا میاں جی سے فرما دیجیے کہ گھر میں پیسوں کی سخت ضرورت ہے، خرچ منگوایا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''توبہ واستغفار! کتنے فضول ہیں یہ لوگ کہ ان کا خرچ ہی پورا نہیں ہو رہا۔''

کسی نے پوچھا۔ ''اس میں قابلِ اعتراض کیا بات ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں گھر والوں کو سولہ سیر باجرہ اور سولہ سیر جوار دے آیا ہوں پھر اتنی جلدی ختم ہوجانے کا سبب؟''

انہی دنوں شرف الدولہ نے انہیں کئی ہزار روپے دیے تھے۔ آپ ان روپوں کو حاجت مندوں اور ضرورت مندوں میں کئی دن تک تقسیم فرماتے رہے۔ آخر میں ڈیڑھ سو روپے بچ گئے، خیال تھا یہ رقم دے دیں گے لیکن آپ نے یہ رقم بھی نہیں دی۔ ضرورت مندوں کے لیے بچائے رکھی۔ آخر میں اس رقم سے آپ نے احادیثِ نبویؐ کے چند نسخے خرید لیے اور ان نسخوں کو حاجت مندوں میں مفت تقسیم کر دیا۔

ایک دن کسی نے آپ سے عرض کیا۔ ''حضرت! اودھ کے ایک بزرگ کو کیمیا کا شوق ہے۔ آپ دعا فرما دیجیے وہ اس میں کامیاب ہوجائیں۔''

آپ نے دعا کی۔ ''خدا انہیں اس میں ناکام کرے۔''

عرض کرنے والے نے کہا۔ ''حضرت! یہ کیا دعا فرمائی آپ نے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ اس کے حق میں میری دعا ہے کیونکہ جس دل میں کیمیا کا شوق ہوگا اس میں نسبتِ الٰہی قرار پذیر نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ اپنے دل میں اللہ کو رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے دل سے شوقِ کیمیا جاتا رہے۔''

اس شخص نے پوچھا۔ ''اور حضرت! دستِ غیب کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ اس سے بھی بدتر ہے کیونکہ کسی نبی، فقیر اور درویشِ کامل نے ایسے امور کی تمنا نہیں کی۔''

☆☆☆

امروہے کے مولوی محب اللہ خاں صاحب کا رامپور کے دربار سے تعلق تھا اور نواب رامپور سے ان کے مراسم تھے۔ ایک دن ان سے نواب کلب علی خاں نے یہ کہا۔ ''ہمیں بڑی تمنا ہے کہ مولوی فضل رحمٰن محدث ہمارے ہاں

تشریف لائیں۔"

مولوی محب اللہ خاں نے پوچھا۔"ان کی کیا ضرورت پیش آ گئی نواب صاحب ؟"

نواب صاحب نے فرمایا۔"میرے پاس سب اہلِ علم اور ہر فن کے استاد جمع ہو چکے ہیں، اگر ان میں مولانا فضل رحمٰن بھی شامل ہو جائیں تو خوب ہو کیونکہ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے صحبت یافتہ بھی ہیں۔"

مولوی محب اللہ خاں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔"میں کوشش کروں گا کہ انہیں یہاں لے آؤں اگر میں انہیں لے آؤں تو آپ ان کی خدمت میں نذرانہ کیا پیش کریں گے؟"

نواب صاحب نے جواب دیا۔"ایک لاکھ روپے یہ حقیر سا نذرانہ ان کی خدمت میں پیش کروں گا۔"

مولوی محب اللہ خاں صاحب مراد آباد روانہ ہو گئے اور وہاں مولانا سے ملاقات کی۔ مولانا نے توحید پر گفتگو شروع کر دی۔ محب اللہ خاں نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا، بولے۔"مولانا! اگر آپ رامپور تشریف لے چلیں تو کیسا رہے؟"

مولانا بدستور توحید ہی پر بولتے رہے۔

آخر ایک بار پھر مولوی محب اللہ خاں نے کہا۔"حضرت! میں کب تک آپ کو نواب کلب علی خاں کی پیشکش سناتا رہوں گا، کوئی جواب تو دیجیے خدارا۔"

آپ نے نہایت بے نیازی سے فرمایا۔"محب اللہ خاں صاحب! میاں لاکھ پر ڈالو خاک۔ مجھے کہاں درباروں میں لے جا کر خوار کراؤ گے۔ اس قسم کی باتوں میں نواب کلب علی خاں کا دماغ خوب لگتا ہے، اللہ اس کو خوش و خرم رکھے۔"

ایک دن خبر گرم ہوئی کہ لیفٹیننٹ گورنر آپ کے پاس یہ دیکھنے جائے گا کہ زیارت کے لیے آنے والوں کے ہجوم شوق کو اپنی نظروں سے دیکھے۔

لیفٹیننٹ گورنر آپ کے پاس بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گیا۔ لیفٹیننٹ گورنر کی بیوی اس کے ساتھ تھی، وہ کھڑی ہوئی تھی کیونکہ مولانا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

لیفٹیننٹ گورنر نے کہا۔"مولانا! میں نے آپ کے پاس کئی بار آنا چاہا لیکن محض اس لیے رک گیا کہ میں آپ کی اجازت اور خواہش کے بغیر یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔"

آپ نے جواب میں فرمایا۔"میں فقیر آدمی ہوں، سامانِ دنیا بالکل نہیں رکھتا۔ اسی لیے دنیاداروں سے ملتے ہوئے شرم سی محسوس کرتا ہوں۔ اب اسی کو دیکھ لو، تم اپنی بیوی کے ساتھ یہاں آئے ہو مگر کرسی نہ ہونے کی وجہ سے میں بٹھا نہیں سکتا۔"

مولانا کی نظر اپنے کمرے میں رکھے ہوئے ایک خالی گھڑے پر پڑ گئی، آپ نے اس کو الٹا کر کے بچھوا دیا اور عورت سے کہا۔"نیک بخت! تو اس پر بیٹھ جا۔"

وہ اس گھڑے پر بیٹھ گئی۔ لیفٹیننٹ گورنر نے کہا۔"حضرت! کچھ تبرک بھی عطا فرمائیے۔"

آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا۔"بھائی دیکھ میری ہنڈیا میں کچھ ہے یا نہیں۔ اس میں جو کچھ بھی ہو۔ انہیں دے دے۔"

خادم نے ہنڈیا کو الٹا، اس میں مٹھائی کا چورا پڑا تھا۔ آپ نے اس چورے کو تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیا۔

کچھ دیر بعد جب لیفٹیننٹ گورنر نے اجازت چاہی تو آپ نے اجازت دے دی۔ لیفٹیننٹ گورنر نے کہا۔"حضرت! مجھے کوئی نصیحت؟"

آپ نے جواب دیا۔"کسی پر ظلم نہ کرنا۔"

☆☆☆

آپ لکھنؤ تشریف لے گئے تو آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان میں ایک صاحب مولوی علی حیدر خاں بھی تھے۔ ان کے سر میں درد رہا کرتا تھا۔ اس درد نے علی حیدر خاں صاحب کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔ انہوں نے مولانا فضل رحمٰن سے عرض کیا۔"کافی علاج کرایا گیا مگر سر کا درد نہیں گیا، کچھ آپ ہی کیجیے۔"

مولانا نے ان کے سر کے اس حصے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جہاں مستقلاً درد رہتا تھا اور ایک شعر پڑھا۔

بادِ نسیم آج یہ کیوں مشک بار ہے

شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''اب کیا حال ہے؟''

مولوی علی حیدر خاں نے محسوس کیا کہ درد جا چکا ہے، بولے۔ ''اب تو نہیں لگ رہا۔''

مولانا نے جواب دیا۔ ''اللہ نے چاہا یہ درد اب کبھی بھی نہیں ستائے گا۔''

مولوی علی حیدر خاں آپ سے بیعت ہو گئے اور ان پر آٹھ دن تک گریہ طاری رہا۔

☆☆☆

ایک دن آپ نے فرمایا۔ ''ہماری ایک ماما تھی۔ اس کا انتقال ہو گیا۔ ہمیں یہ فکر ہوئی کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ لیکن پھر یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اللہ نے اسے معاف کر دیا۔ بخش دیا۔'' پھر آپ نے قدرے سکوت اختیار کیا اور فرمایا۔ ''جانتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیماری میں حضرت عائشہؓ کو بہت یاد کیا کرتے تھے اور یہی چاہتے تھے کہ میری تیارداری ان کے گھر میں ہو، کیا تم جانتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیوں کیا؟'' پھر خود ہی فرمایا۔ ''پیغمبر کے پاس بوقتِ انتقال جو شخص ہوتا ہے علم نبوت کا ایک حصہ اس کو مل جاتا ہے اور یہ جتنا قریب ہوتا ہے اس حصے میں اتنی ہی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ اس بار کا کوئی اور متحمل نہیں ہو سکتا، بجز حضرت عائشہؓ کے چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ آپ کے بالکل قریب ہی موجود تھیں۔

☆☆☆

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے صحیح بخاری چھپوائی اور اس کا ایک نسخہ لے کر مولانا کی خدمت میں پہنچے اور اس نسخے کو نہایت ہی ادب سے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''مولانا! میں نے اس کی تصحیح میں بڑی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود اگر اس میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو نشاندہی فرما دیں۔''

مولانا نے صحیح بخاری کا ایک صفحہ کھولا اور اس کی ایک سطر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں پر غلطی ہو گئی، ذرا غور سے دیکھ لینا۔''

مولانا احمد علی نے دیکھا، وہاں پر واقعی غلطی موجود تھی۔ اس کے بعد تین ورق اور الٹے اور ایک سطر پر انگلی رکھ دی، فرمایا۔ ''یہاں بھی غلطی ہو گئی۔''

مولانا احمد علی نے دیکھا، یہاں بھی غلطی موجود تھی۔

اسی طرح آپ صفحات الٹتے رہے اور غلطیوں والی سطروں پر انگلی رکھ رکھ کر اغلاط کی نشاندہی فرماتے رہے۔

آخر میں مولانا احمد علی نے بہ نظرِ استحسان آپ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ''مولانا! یہ جو کچھ آپ مجھے بتا رہے ہیں، اس کا تعلق اکتساب سے نہیں، وہب سے ہے۔''

فرنگی محل لکھنؤ کے مولوی عبدالحئی صاحب لکھنؤ سے گنج مراد آباد ایک ایسے راستے سے گئے جس سے نمازِ قصر واجب ہو جاتی ہے لیکن انہوں نے مولانا فضل رحمٰن کو یہ بات نہیں بتائی۔ گنج مراد آباد اور لکھنؤ میں اتنا فاصلہ نہیں ہے کہ نمازِ قصر کی جائے۔ لیکن جب مولوی عبدالحئی نے پوری نماز پڑھی تو مولانا نے انہیں روکا اور کہا۔ ''تم حالتِ سفر میں ہو اس لیے نمازِ قصر کرو۔''

مولوی عبدالحئی نے جواب دیا۔ ''لیکن مولانا لکھنؤ سے گنج مراد کا فاصلہ اتنا نہیں ہے کہ نمازِ قصر کی جائے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن تم جس راستے سے چل کر یہاں تک پہنچے ہو اس میں نمازِ قصر جائز ہے۔''

مولوی عبدالحئی نے حیرت سے پوچھا۔ ''مگر یہ بات آپ کو کس نے بتائی کہ میں کسی دوسرے راستے سے یہاں تک پہنچا ہوں؟''

مولانا خاموش ہو گئے۔ بات ختم ہو گئی۔ بعد میں مولوی عبدالحئی نے کہا۔ ''بیشک آپ کو خدا نے کوئی اور ہی علم عطا فرمایا ہے مگر اس بات کی آپ کو کیا خبر کہ میں کس لیے راستے سے یہاں تک آیا ہوں۔''

مولانا اشرف علی تھانوی (مولف: بہشتی زیور) کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا، گنج مراد آباد پہنچے اور آپ کے در پر

حاضری دی۔ رات کا وقت تھا۔ عشا کی نماز ہو چکی تھی۔ مولانا مسجد سے حجرے میں تشریف لے جا چکے تھے۔ مولانا تھانوی نے وہاں پہنچ کر آپ کے خادم سے کہا۔ ”میں مولانا سے ملنا چاہتا ہوں، براہِ کرم میری ملاقات کرا دیں۔“

خادم واپس آیا تو یہ پیغام لایا۔ ”مولانا نے اسی وقت یاد فرمایا ہے۔“

مولانا تھانوی اسی وقت اندر چلے گئے۔ وہاں ایک چارپائی پر آپ تشریف فرما تھے۔ مولانا تھانوی سامنے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا۔ مولانا فضل رحمٰن نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ”کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟“

مولانا تھانوی نے جواب دیا۔ ”طالب علم ہوں، کانپور سے آیا ہوں اور زیارت کو حاضر ہوا ہوں۔“

مولانا فضل رحمٰن نے فرمایا۔ ”یہ کون سا وقت ہے زیارت کا؟ آدمی کو چاہیے کہ ذرا سویرے آئے تاکہ دوسرا کچھ روٹی وغیرہ کا تو انتظام کر سکے۔ تم ہی بتاؤ میں اس وقت کھانا کہاں سے لاؤں؟ تمہیں خدا کا خوف نہ آیا؟“ مولانا تھانوی چپ چاپ سنتے رہے، کوئی جواب نہیں دیا۔ مولانا فضل رحمٰن نے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، ہیں تو سہی۔“

مولانا فضل رحمٰن نے فرمایا۔ ”تب پھر بازار سے کچھ لا کر کھالو اور صبح واپس چلے جاؤ۔“

مولانا تھانوی نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے۔“

مولانا فضل رحمٰن نے خادم کو آواز دی اور فرمایا۔ ”انہیں سردری میں ٹھہرا دو۔“

مولانا تھانوی کے ساتھ ان کا ایک رفیق بھی تھا اور ٹٹو بھی۔ اس سردری میں تینوں کا انتظام ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں پھر خادم حاضر ہوا اور کہا۔ ”آپ کو حضرت مولانا یاد فرما رہے ہیں۔“

مولانا تھانوی سمجھے کہ شاید اور ڈانٹ پڑے گی۔ چپ چاپ ان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں ایک تخت بھی بچھا تھا اور تخت کے پاس ایک چٹائی بچھی تھی۔ مولانا تھانوی اس چٹائی پر بیٹھ گئے۔ مولانا فضل رحمٰن نے فرمایا۔ ”وہاں کہاں بیٹھ گئے؟ تخت پر کیوں نہیں بیٹھے؟“ مولانا تھانوی تخت پر بیٹھ گئے۔

مولانا فضل رحمٰن نے خادم کو حکم دیا۔ ”جا ان کے لیے ہماری بیٹی کے یہاں سے کھانا لے آ۔“

چنانچہ خادم گیا اور ایک پیالے میں سالن اور ارہر کی دال اس طرح لایا کہ روٹیاں بھی اس پر رکھی تھیں۔ اندر چراغ روشن تھا اور اس کی مدھم روشنی میں صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ مولانا فضل رحمٰن نے خادم کو ڈانٹ دیا۔ ”ارے بدتمیز کہیں کے۔ کہیں اس طرح کھانا لایا جاتا ہے مہمانوں کے لیے۔ روٹی الگ طباق میں لانا تھی، یہ کیا طریقہ ہے روٹیاں لانے کا۔ پیالے پر رکھ کر لا رہا ہے۔“

خادم نے جواب دیا۔ ”طباق کو تلاش کیا جب نہیں ملا تو میں اس طرح لے آیا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو جھوٹ بولتا ہے، فلاں طاق میں دیکھ۔“

خادم بھاگا بھاگا گیا اور اس طاق سے طباق اٹھا لایا اور اس میں کھانا سجا کر پیش کر دیا۔

جب مولانا تھانوی کھانا کھانے لگے تو پوچھا۔ ”کیا ہے کھانے میں؟“

جواب دیا۔ ”روٹیاں اور ارہر کی دال اور سالن۔“

مولانا مسکرائے، فرمایا۔ ”خوب! اچھا ہے کھانا۔“ پھر کچھ دیر بعد فرمایا۔ ”ماشاء اللہ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔“

مولانا تھانوی حیران تھے کہ انہیں کیا معلوم کہ میں پڑھا لکھا ہوں۔

آپ نے مزید فرمایا۔ ”تم نے مولانا محمد یعقوب سے پڑھا ہے، بہت اچھے آدمی تھے۔“

اب مولانا تھانوی کی حیرت میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ اور حیران ہوئے کہ انہیں یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ [illegible] مولانا محمد یعقوب سے درس لیا ہے۔

مولانا فضل رحمٰن نے پھر فرمایا۔ ”تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو، یہ جو کچھ تم کھا رہے ہو، بہت اچھا کھانا ہے۔ ذرا صحابہ کرام کے حالات پر تو غور کرو۔ وہ ایک ایک کھجور کھا کر روزے رکھتے تھے اور جہاد بھی کرتے تھے۔“ اس کے بعد صحابہ کرام کی تعریف اتنے جوش و خروش سے کی کہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ان کے پاس کھڑے ہو کر دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ [illegible]

اور جوش کے عالم میں صحابہؓ کے فضائل بیان فرماتے رہے۔
مولانا تھانوی کھانا کھا چکے تو آپ نے فرمایا۔ ''اب جاؤ اور عشا پڑھ کر سو رہو۔''
وہ چلے گئے اور صبح فجر کے وقت پھر حاضر ہوئے۔ فجر کی نماز مولانا فضل رحمٰن کے پیچھے پڑھی پھر اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔ آفتاب اوپر اٹھا تو آپ نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا۔ ''تم کب جاؤ گے؟''
یہ صاحب اپنی وضع قطع سے کہیں کے رئیس معلوم ہوتے تھے، جواب دیا۔ ''جمعے کی نماز پڑھ کر چلا جاؤں گا۔''
مولانا نے فرمایا۔ ''یہاں جمعہ پڑھ کر کیا کرو گے؟''
ان صاحب نے جواب میں کہا۔ ''پھر میں جمعہ کہاں پڑھوں گا؟''
مولانا نے گرم ہو کر فرمایا۔ ''ہمیں کیا خبر کہ تم جمعہ کہاں پڑھو گے۔ ہم کوئی ٹھیکیدار ہیں تمہارے جمعہ کے۔ لوگوں کو شرم نہیں آتی، منہ پر ڈاڑھی لگا کر پرائے ٹکڑوں پر پڑے رہتے ہیں۔''
وہ صاحب بھی خاصے بے تکلف تھے، انہوں نے کہا۔ ''حضرت! میں نہیں جاتا۔''
مولانا نے کھڑے ہو کر ان صاحب کا شانہ پکڑ لیا اور دھکا دینے کے انداز میں کہا۔ ''نکلو یہاں سے۔'' اور پھر دھکیلتے ہوئے دور تک لے گئے۔
مولانا تھانوی نے دل میں سوچا۔ شاید اب میری باری ہے، انہوں نے کہا۔ ''اچھا مولانا میں چلوں پھر۔''
مولانا فضل رحمٰن نے کہا۔ ''اتنی جلدی؟''
مولانا تھانوی نے عرض کیا۔ ''پھر حاضری دوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''بہتر ہے۔''
اور مولانا فضل رحمٰن مشایعت میں انہیں دور تک چھوڑنے گئے یہاں تک کہ سرِ دری آ گئی۔
مولانا تھانوی نے عرض کیا۔ ''مولانا! میرے حق میں دعا کیجیے۔''
جواب دیا۔ ''میں نے تیرے لیے بہت سی دعا کر دی ہے۔''
مولانا تھانوی نے مزید عرض کیا۔ ''کچھ پڑھنے کو بتا دیجیے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''قل ھو اللہ شریف اور سبحان اللہ و بحمدہٖ اور درود سو بار پڑھ لیا کرو۔''
اس کے بعد مولانا فضل رحمٰن، مولانا تھانوی کو دوسروں کے ذریعے سلام کہلا بھیجتے تھے۔
مولانا تھانوی دوسری بار ملاقات کو گئے تو کانپور کے پیڑے اور شربتِ انار کی بوتل بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ پیڑے اس زمانے میں بنگالی پیڑے کہلاتے تھے۔
مولانا تھانوی نے سوچا کہ مولانا فضل رحمٰن کے دربار میں حاضری دینا اور ٹٹو پر سفر کر کے جانا یہ بے ادبی ہے۔ انہوں نے راستے میں پا پیادہ سفر شروع کر دیا۔ راستے میں ایک بزرگ مل گئے۔ یہ بھی پیدل سفر کر رہے تھے۔ مولانا تھانوی نے پوچھا۔ ''آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟''
ان بزرگ نے جواب دیا۔ ''حضرت مولانا فضل رحمٰن کی خدمت میں۔''
دونوں صاحبان ایک ساتھ گنج مراد آباد میں داخل ہوئے۔ یہ رمضان کا مہینا تھا۔ مولانا نے پہلے ان بزرگ کو طلب کیا اور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''روزہ ہے؟''
ان بزرگ نے جواب دیا۔ ''جی ہاں، روزہ ہے۔''
آپ نے انہیں ڈانٹ دیا۔ ''تم سے کس نے کہا تھا کہ سفر میں روزہ رکھو۔'' اس کے بعد انہیں اسی وقت رخصت کر دیا گیا۔ اب مولانا تھانوی کی باری تھی۔ آمنا سامنا ہوتے ہی سوال کیا۔ ''روزہ ہے؟''
مولانا تھانوی نے جی کڑا کر کے عرض کیا۔ ''جی ہاں روزہ تو ہے۔''
آپ نے نہایت شفقت سے فرمایا۔ ''خوب! جوان آدمی ہو روزہ ضرور رکھنا چاہیے۔''
کچھ دیر ملاقات رہی، اس کے بعد یہ باہر آ گئے اور دوسروں کو حاضری دینے کا موقع ملا۔ باہر آنے والوں کی چیزیں

دیکھ کر مولانا تھانوی کو اپنے آپ پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی کیونکہ انہیں نہیں معلوم تھا کہ مولانا فضل رحمٰن کو تمبا کو اور صابن سے بڑی رغبت تھی اور مولانا تھانوی پیڑے اور شربتِ انار لے کر آئے تھے۔

دوسروں نے مولانا فضل رحمٰن کی خدمت میں صابن اور تمبا کو کا ہدیہ پیش کیا تو آپ خاموش رہے اور زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا لیکن جب مولانا تھانوی نے ان کی خدمت میں پیڑے پیش کیے تو آپ نے خوش ہو کر فرمایا۔ ''تم تو بہت ہی اچھی چیز لائے۔ میں تو اس کا شربت پیا کرتا ہوں۔'' پھر خادم سے کہا۔ ''انہیں حفاظت سے رکھ دو۔''

مولانا تھانوی خوش تھے کہ ان کا ہدیہ قبول فرمایا گیا تھا، اس وقت تک مولانا کی خدمت میں شربتِ انار نہیں پیش کیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد مولانا فضل رحمٰن نے پوچھا۔ ''تم اپنے ساتھ کوئی دوا بھی لائے ہو؟''

مولانا تھانوی کی سمجھ میں نہ آیا۔ دوسرے وہ شربتِ انار لے تو آئے تھے مگر یہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ وہ اس کو خود پئیں گے یا مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ انہوں نے جواب دیا۔ ''میں دوا تو کوئی بھی نہیں لایا اپنے ساتھ۔''

کسی نے چپکے سے آپ کے کان میں کہا۔ ''شربتِ انار کی طرف اشارہ ہے آپ کا۔''

مولانا تھانوی نے کہا۔ ''شربتِ انار لایا ہوں اپنے ساتھ۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن وہ تو تم اپنے لیے لائے ہو۔''

مولانا نے جواب دیا۔ ''لیکن اب میں اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔''

مولانا نے اسے قبول کر لیا۔ اس کے بعد مولانا فضل رحمٰن نے مولانا تھانوی پر خصوصی توجہ دی اور انہیں حدیث کا درس بھی دیا۔

ایک دن پوچھا۔ ''تم شوق کا کیا ترجمہ کرو گے؟''

مولانا تھانوی نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں کیا ترجمہ کروں گا، ترجمہ تو آپ ہی خوب کریں گے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''شوق کا ترجمہ ہے، تڑپ۔''

مولانا تھانوی کو اس بار روک لیا گیا اور وہ کئی دن رہ کر واپس گئے۔

☆☆☆

اودھ کا وزیر زیرِ عتاب آ گیا۔ ان دنوں آپ لکھنؤ میں قیام فرما تھے۔ شرف الدولہ نے وزیر سے کہا۔ ''دیکھو، اگر چاہتے ہو کہ کام بن جائے تو مولانا فضل رحمٰن کے پاس چلے جاؤ اور ان سے دعا کے طالب ہو۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔''

وزیر نے شرف الدولہ کا سہارا پکڑا اور آپ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آپ نے مراقبے میں جا کر جو کچھ دیکھا، صاف صاف کہہ دیا، فرمایا۔ ''اودھ کا نواب تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ وہ تمہارے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے۔''

وزیر نے عرض کیا۔ ''حضرت! کہیں بات بگڑ نہ جائے۔ میں نواب کے پاس جانے میں خوف محسوس کرتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مت ڈرو، اس کے پاس ضرور جاؤ۔''

وزیر ڈرتے ڈرتے نواب کے پاس گیا۔ نواب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے، میں تو تمہارا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ اگر آج بھی نہ آتے تو میں تمہیں بلوا بھیجتا۔'' وزیر کو حیرت تھی کہ یہ کیسا انقلاب ہے۔

اس کے بعد وزیر نے آپ کی خدمت میں دو ہزار روپے پیش کیے، آپ نے فرمایا۔ ''میں یہ روپے لے کر کیا کروں گا؟''

وزیر نے عرض کیا۔ ''پھر جیسا آپ کا حکم ہو۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس رقم کے قرآن پاک چھپوا دے۔'' اور آپ جب دوسری بار لکھنؤ تشریف لے گئے تو انہیں قرآن پاک تیار ملے۔ وزیر نے اونٹ پر رکھوا کر بھیجے۔ ایک گھوڑا ساز دیراق آپ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ انہیں سندیلے کے لیے لے کر روانہ ہو گئے اور راستے بھر انہیں تقسیم فرماتے رہے یہاں تک کہ آخر میں اونٹ اور گھوڑے کی بھی باری آ گئی،

انہیں بھی تقسیم کر دیا گیا۔

آپ اتباعِ سنت میں ایک عرصہ گزار کر جب اپنے رب سے ملاقات کے لیے تیار ہوئے تو کسی کو بھی اس کا پتا نہ تھا کہ آپ ان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ مولانا کو زکام اور بخار کا عارضہ لاحق ہوا اس کا علاج شروع کیا گیا مگر مرض میں افاقے کے بجائے شدت پیدا ہوتی رہی۔ پیاس کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا، غذا بہت کم ہو گئی تھی۔

7 ربیع الاول کو نمازِ عصر کے بعد آپ نے فرمایا۔ ''کتاب لاؤ۔''

حکیم عظمت حسین کتاب لے آئے اور سبق شروع کر دیا۔ اس کے بعد مولوی عبدالغفار کی باری آئی اور انہوں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ تقریباً تیرہ صفحات پڑھے تھے کہ آپ نے فرمایا۔ ''اچھا بند کرو۔ جاؤ کتاب بند کر کے مسجد میں رکھ آؤ۔''

آپ کے لفظ ''بند کر کے'' پر کسی نے غور نہیں کیا لیکن بعد میں احساس ہوا کہ یہ سلسلہ آپ موقوف فرما رہے تھے۔ اس کے بعد آپ کی حالت بگڑتی ہی رہی۔

21 ربیع الاول کو تقریباً دو بجے فرمایا۔ ''ہم مر گئے۔ ہمارے جنازے کی نماز پڑھا دو اور اگر کوئی نہ پڑھے تو میں خود پڑھ لیتا ہوں تمام مقتدی کھڑے ہیں۔'' یہ کہہ کر آپ نے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیے۔

ہر شخص یہ باتیں سن کر گھبرا رہا تھا۔ تقریباً سوا دو بجے فرمایا۔ ''میں حدیث سننا چاہتا ہوں تاکہ حدیث سنتے سنتے میرا دم نکلے۔''

22 ربیع الاول بروز جمعہ تین بجے حاضرین کا مجمع تھا۔ آپ نے آنکھیں کھول کر حاضرین کو دیکھا اور اپنے بیٹے احمد میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے رہے۔

سوا چار بجے نفس میں فرق آ گیا۔ حکیم عظمت حسین نے چہل حدیث پڑھنا شروع کر دی۔ اس کے بعد کتاب الایمان کو بہ آوازِ بلند پڑھا گیا۔ ایک صفحہ بہ مشکل پڑھا گیا اور پھر آخری حدیث پڑھ کر کتاب بند کر دی۔

سوا پانچ بجے ساری تدبیریں چھوڑ دیں۔ مغرب کے بعد اتنی طاقت بھی آپ میں نہیں رہی کہ ہونٹوں کو حرکت ہی دے سکتے۔

آخر لوگوں نے محسوس کیا کہ آپ نے سانس کھینچی ہے۔ یہ اوپر کھینچی جانے والی سانس پھر کبھی نیچے نہیں آئی اور آپ وصال فرما گئے۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ کوئی درود پڑھنے لگا، کوئی کلمہ۔ رونے کی آواز کہیں سے بھی نہیں آتی تھی کیونکہ آپ نے بہ آوازِ بلند رونے سے منع فرما دیا تھا۔ ہر کسی کے رخسار تر تھے اور آنکھیں تربتر تھیں۔

آپ کو ان کی اپنی مسجد کے چبوترے پر لایا گیا۔ بیرونِ مسجد قبر تیار کی گئی۔ وصیت کے مطابق نمازِ جنازہ احمد میاں نے پڑھائی۔ ساڑھے نو بجے قبر درست کی گئی اور آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

کئی دن تک آنے والوں نے اہلِ خانہ اور پسماندگان سے تعزیت کی اور دلاسے دیتے رہے۔ غلّہ اور کھانا تقسیم کیا جاتا رہا۔

27 ربیع الاول کو راجا محمد ممتاز علی خاں صاحب بہادر والیِ ریاست اترولہ گنج مراد آباد پہنچے اور اعلان کر دیا کہ جس بقال کا جس قدر روپیا قرض ہو ہم ادا کریں گے۔ اس اعلان کے بعد دس ہزار چار سو روپیا یکمشت ادا کیا گیا۔

اس دوران کسی نے راجا صاحب سے کہا۔ ''حساب کتاب دیکھ کر قرض ادا کیا جائے تو بہتر ہے۔''

راجا صاحب نے فرمایا۔ ''ہمارے حضرت حساب کتاب کر کے نہ لیتے تھے پس ہم بھی اس طرح نہ دیں گے۔ ہم روپیا مزار شریف پر رکھ دیتے ہیں جس کا جتنا ہو اٹھا لے جائے۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دامے درمے ایک ایک کوڑی تک باقی نہ رہی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

ماخذات

ارشادِ رحمانی، سید محمد علی مونگیری۔ فضل رحمانی، سید تجمل حسین۔
ہدیۂ عشاق، مولوی عبدالغفار۔ مولانا فضل رحمٰن، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

پتلی اور سیدھی رسّی پر پیر جما کر چلنا اور خود کو گرنے سے بچائے رکھنا کس قدر دشوار ہوتا ہے اس کا احساس انہی لوگوں کو ہوتا ہے جنہیں اس کا تجربہ ہو۔ ورنہ مشاہدہ کرنے والے فقط حیران ہو کر انگلیاں دانتوں تلے داب کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے والے بھی مہد سے لحد تک ایسے ہی اللہ کی راہ میں عمر کی نقدی خرچ کرتے ہیں اور بظاہر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو کر آخرت کا بے شمار سرمایہ پالیتے ہیں... آپ کا تعلق بھی ایسے ہی نیک اور عبادت گزار لوگوں میں ہوتا تھا۔

دنیا کی دلدل سے دامن بچا کر منزلِ مقصود پالینے والے ایک ولی کا قصہ

جانِ جاناں کا خلیفہ

ضیا تسنیم بلگرامی



پنجاب کے قصبہ پٹیالہ میں شاہ عبداللطیف زہد و تقویٰ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ کبھی کبھی چالیس دن یوں گزر جاتے کہ پل بھر بھی پلک نہ جھپکاتے۔ ذکر و فکر میں سب کچھ بھلا دیتے یہاں تک کہ آرام و سکون بھی۔ نفس زیادہ تنگ کرتا اور کھانے کو مانگتا تو کریلے کو جوش دے کر کھانے لگتے اور طنزاً فرماتے۔ ”لے کھا، اور مانگ کھانا۔“

شاہ عبداللطیف نے عالمِ رویا میں سنا، کوئی کہہ رہا ہے۔ ”تیرے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے اس کا نام علی رکھنا۔“

لیکن اس دوران شاہ عبداللطیف کے بھائی نے خواب میں دیکھا... ”تم اپنے بھتیجے کا نام عبداللہ رکھنا۔“

چنانچہ اسی سال 1158 ہجری میں شاہ عبداللطیف کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ نے بپاسِ ادب لڑکے کا نام غلام علی رکھ دیا لیکن چچا نے عبداللہ نام رکھ دیا۔ آگے چل کر یہ بچہ شاہ عبداللہ المعروف بہ شاہ غلام علی کہلایا۔

ان کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، کے مصداق، انہیں جو کچھ بتایا یا سکھایا جاتا یہ اس میں غیر معمولی ثابت ہوتے۔ باپ کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ان کے نقشِ قدم پر چلے لیکن اس وقت تک انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر بہتوں کو اپنے نقشِ قدم پر چلائے گا۔

جوان ہوتے ہوتے شاہ غلام علی کہلائے جانے لگے۔ باپ کو فکر تھی کہ بیٹا کسی کے حلقۂ ارادت اور بیعت میں داخل ہو جائے۔ ان کے اپنے پیر دہلی میں قیام فرما تھے اور ان کی بابت یہ مشہور تھا کہ وہ خواجہ خضر علیہ السلام کے صحبت دار ہیں۔ باپ نے دہلی سے بیٹے کو خط لکھا۔ ”بیٹے! تم دہلی آجاؤ تا کہ تمہیں میرے پیر سے بیعت ہو جانے کا شرف حاصل ہو جائے۔“

بیٹے کو کیا انکار تھا، جس حال میں تھے اسی میں چل کھڑے ہوئے اور سیدھے اپنے باپ کے پاس پہنچے۔ یہ رات کا وقت تھا۔ باپ اپنے حجرے میں حزن وملال کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ بیٹا کس وقت حجرے میں داخل ہوا انہیں کچھ پتا نہ تھا۔ یہ جا کر چپ چاپ باپ کے پاس کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر انہیں محویت سے دیکھتے رہے۔ آخر جب انہیں یہ محسوس ہوا کہ والد صاحب یوں متوجہ نہیں ہوں گے تو نہایت ادب سے باپ کو مخاطب کیا۔ ”پدر بزرگوار! آپ کا تابعدار غلام علی حاضر ہے اس کا سلام قبول فرمائیں۔“

باپ نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ”بیٹے غلام علی! تو آ گیا؟ مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔“

غلام علی نے جواب دیا۔ ”باوا جان! آج میں آپ کو افسردہ اور اداس دیکھ رہا ہوں، خیریت تو ہے؟ اس مایوسی کا سبب؟ افسردگی کی وجہ اور اس کا باعث؟“

باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ غلام علی نے جھلملاتے ہوئے آنسو دیکھ لیے تھے، بے چینی سے پوچھا۔ ”باوا جان! آپ میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟“

باپ نے پوچھا۔ ”تو یہاں میرے پاس کیوں آیا ہے؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”آپ کے پیر ومرشد سے بیعت ہونے۔“

باپ نے پوچھا۔ ”میرا پیر ومرشد کہاں ہے، اس سے ملاقات کہاں ہوگی؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”مجھے کیا پتا کہ وہ کہاں ہیں۔ آپ نے مجھے طلب فرمایا میں حاضر ہو گیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔“

باپ نے کہا۔ ”بیٹے غلام علی! یہ میری بدقسمتی کہ میرے پیر کا آج سہ پہر وصال ہو گیا، اب تجھے کسی اور پیر کا انتخاب کرنا ہوگا۔ میرا پیر تو چلا گیا۔ اب وہ کہیں بھی نہیں مل سکتا۔“

بیٹے نے باپ کے غم میں اس کا ساتھ دیا اور مغموم ہو کر سر جھکا لیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر دریافت کیا۔ ”باوا جان! میری بابت کیا حکم ہے؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”بیٹے! چند یوم صبر کر، خاموش رہ، میں سوچ کر تیری بات کا جواب دوں گا۔“

بیٹا خاموش ہو گیا اور باپ کی طبیعت کے ٹھہرنے کا انتظار کرنے لگا۔

جس حجرے میں یہ دونوں ٹھہرے ہوئے تھے، وہاں کئی دن تک خاموشی طاری رہی۔ باپ نے بولنا بند کر رکھا تھا اور بیٹا باپ کے احترام میں خاموش تھا۔ نوجوان شاہ غلام علی نے محسوس کیا کہ باپ پر اپنے پیر ومرشد کے وصال نے اتنا شدید اثر کیا ہے کہ ان کی صحت تباہ ہوتی جارہی ہے۔ ان کے کھانے پینے تک پر اثر پڑ رہا ہے۔ عالم یہ تھا کہ دونوں ہفتوں خاموش رہے۔

باپ بھی بیٹے کی فرمانبرداری سے بہت متاثر ہوا۔ آخر ایک دن شاہ عبداللطیف نے اپنے بیٹے سے دریافت کیا۔

”بیٹے غلام علی! کیا بات ہے، میں چپ ہوا تو تو نے بھی سکوت اختیار کر لیا، کیوں؟“

غلام علی نے جواب دیا۔ ”باوا جان! یہ میری مجال کہ میں اس حالتِ دل گرفتگی میں آپ کو چھیڑوں۔“

باپ نے اپنے بیٹے کو بغور دیکھ کر سوال کیا۔ ”کیا تو نے اپنے پیر کا انتخاب کر لیا؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ابھی نہیں، کیونکہ میں آپ کے مشورے اور مرضی کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیونکر کر سکتا ہوں۔“

باپ نے کہا۔ ”تو بھی ٹھیک ہی کہتا ہے لیکن مسئلہ بہت نازک ہے۔ میں نے جس ذات کو.... سمجھ رکھا تھا اور جس کے کمالاتِ ظاہری اور باطنی کو میں نے سمجھ رکھا تھا اسی کے بارے میں، میں تائید کر سکتا تھا، لیکن اب وہ ہم میں جسمانی طور پر موجود نہیں رہے تو میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ تو خود ہمت کر اور اپنے لیے پیر ومرشد کا انتخاب تو خود ہی کر لے۔ اس حجرے سے نکل اور گھوم پھر کر اسے تلاش کر۔“

شاہ غلام علی نے عرض کیا۔ ”باوا جان! آپ تو مجھ کو تنہا چھوڑے دے رہے ہیں۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”میں تجھے تنہا نہیں چھوڑ رہا ہوں، بلکہ تجھ کو اس لائق کر رہا ہوں کہ دوسروں پر تکیہ کرنا چھوڑ دے۔ اپنے فیصلے خود کرنے کے لائق کیے دے رہا ہوں۔“

شاہ غلام علی نے پوچھا۔ ”آپ کا ارشاد بجا لیکن میں اپنے پیر کو کہاں تلاش کروں؟“
باپ نے جواب دیا۔ ”اسی دہلی میں یہاں اور بھی باکمال شخصیتیں موجود ہیں۔ ان سے ایک زمانہ واقف ہے اور پورے ملک کے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ انہی میں تیری مراد بھی موجود ہوگی۔ اس حجرے سے نکل اور اس کو تلاش کر لے۔“

شاہ غلام علی خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہے تھے کہ اتنا بڑا کام کریں، باپ کے اصرار پر انہوں نے حجرہ چھوڑ دیا اور دہلی کے نامور بزرگوں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ وہ ان کی صحبتوں میں جاتے اور اٹھتے بیٹھتے رہے لیکن ان میں بھی ان کی پیاس نہیں بجھ رہی تھی۔

آخر ایک دن وہ حضرت مظہر جانِ جاناں کی خدمت میں بھی پہنچ گئے۔ یہاں کا حال ہی کچھ اور تھا۔ خانقاہ میں عسرت اور ضروریاتِ دنیا کی کمی کا یہ حال تھا کہ مرزا مظہر جانِ جاناں کے کپڑے تک اس کی چغلی کھاتے تھے۔ شیخ غلام علی ان کی صحبت میں پہنچے تو ان کے سامنے امرا اور غربا کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھا، سخت سردیوں کے دن تھے لیکن مرزا مظہر جانِ جاناں کے پاس اس سردی سے بچاؤ کے لیے صحیح کپڑے تک نہ تھے۔ غلام علی پر یہ باتیں بڑی شدت سے اثر انداز ہو رہی تھیں۔ مرزا مظہر جانِ جاناں اس نوجوان کو اپنی صحبت میں دیکھتے تو متبسم ہو کر فرماتے۔ ”تجھے یہاں کیا ملے گا؟ کوئی اور در دیکھ۔“

غلام علی فرماتے۔ ”مجھے یہاں سے جو کچھ مل رہا ہے اسی نے مجھے آپ کی صحبت میں بٹھا رکھا ہے۔“

مرزا نے جواب دیا۔ ”تیری مرضی۔“

غلام علی نے کچھ عرصہ سکوت اختیار کیے رکھا۔ وہ اپنے ہونے والے پیر و مرشد کے اعمال و اشغال کا نہایت گہری نظروں سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ غلام علی نے ایک دن بادشاہ کے وزیر قمر الدین کو آپ کی صحبت میں بیٹھے دیکھا۔ وہ نہایت ادب سے بادشاہ کا پیغام آپ کے گوش گزار کر رہا تھا۔ ”پیر و مرشد! بادشاہ نے عرض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ملک عطا فرمایا ہے۔ آپ جس قدر چاہیں بطور ہدیہ قبول فرمائیں۔ وہ آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔“

مرزا جانِ جاناں نے جواب دیا۔ ”اللہ تعالیٰ نے متاعِ دنیا کو قلیل فرمایا ہے اور یہ دنیا سات اقلیموں پر مشتمل ہے۔ تیرے بادشاہ کے پاس سات میں سے ایک اقلیم ہے جملہ اقالیم کا ساتواں حصہ۔ اب تو ہی بتا میں اس میں سے کیا قبول کروں۔“

وزیر شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ غلام علی اس قناعت پر اش، اش کر اٹھے۔

سخت سردی پڑ رہی تھی۔ مرزا جانِ جاناں ایک پرانی چادر میں اپنے ارادت مندوں میں تشریف فرما تھے۔ ان میں اس دور کی مشہور زمانہ شخصیت نواب خان فیروز جنگ بھی شامل تھے۔ نواب صاحب کو یہ بات معلوم تھی کہ مرزا جانِ جاناں اس چادر کے عوض نئی چادر نہیں قبول کریں گے۔ اپنی بے بسی پر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنے ایک مصاحب سے کہا۔ ”افسوس کہ یہ ہماری بدبختی اور بدقسمتی کی انتہا ہے کہ پیر و مرشد ہمارا ہدیہ قبول نہیں کرتے۔“

مصاحب نے مرزا جانِ جاناں سے عرض کیا۔ ”حضور! ہم مجبوروں پر رحم فرمائیں اور خدمت کا موقع دیں۔“

مرزا جانِ جاناں نے فرمایا۔ ”فقیر نے روزہ رکھا ہوا ہے یہ روزہ کہ میں امیروں کی نیاز نہیں قبول کروں گا۔ اب جب کہ آفتاب غروب ہونے والا ہے اگر میں اپنا روزہ توڑ دوں گا تو مجھے اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے دس لاکھ روپے درکار ہوں گے تاکہ غریبوں کی دیگ گرم ہو جائے۔“

نواب نے ایک دوسرے موقع پر تیس ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ ”آپ اس سے غریبوں کی دیگ گرم کر دیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”نواب! میں تیرا خانساماں نہیں ہوں یہ کام تو خود بھی کر سکتا ہے۔“

غلام علی ہی کی موجودگی میں ایک افغان سردار نے آپ کی خدمت میں تین سو اشرفیاں پیش کیں اور درخواست کی کہ ”انہیں قبول فرمائیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”کیا تو نے نواب خان فیروز جنگ کی پیش کش کا حشر نہیں دیکھا؟“

افغان سردار نے کہا۔ ”دیکھا ہے مگر پیر و مرشد ہدیے کی قبولیابی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے اگرچہ ہدیہ کو رد کر دینے سے منع کیا گیا ہے لیکن اس کے قبول کرنے کو واجب بھی نہیں بتایا گیا۔ اگر مجھ کو یہ معلوم ہو جائے کہ پیش کیا جانے والا مال حلال کمائی کا ہے تو میں قبول بھی کر لوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ امیروں کا مال اکثر مشتبہ ہوتا ہے اور اس سے متعلق لوگوں کے حقوق ضرور ہوتے ہیں اور اس حال میں قیامت کے دن اس کا حساب دینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوگا۔ اس لیے میں نے اس در ہی کو بند کر دیا ہے۔“

غلام علی ابھی تک ان کے حلقۂ بیعت میں داخل نہیں ہوئے تھے لیکن انہیں صاف صاف یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہو چکا ہے اور ان واقعات کی شکل میں انہیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اصل درویشی کیا ہے اور لباسِ فقیری پہن لینے کے بعد کتنی ذمے داریاں بڑھ جاتی ہیں۔

مرزا جانِ جاناں نے غلام علی کو متفکر دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے غلام علی! تو فکر مند نظر آتا ہے؟“

غلام علی نے جواب دیا۔ ''پیرومرشد آپ کے اعمال اور اشغال سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ درویشی کتنی مشکل ہے، مجھ پر تو ایک وحشت سی طاری ہو گئی ہے۔''

مرزا جانِ جاناں نے فرمایا۔ ''میں نے ایک بات جو کہی ہے تو اس پر غور کر۔ امراء کا مال مشتبہ ہوتا ہے کیا تو اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے؟''

غلام علی نے عرض کیا۔ ''جی پیرومرشد! میں اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ توجہ فرمائیں گے تو نوازش ہو گی۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''چند دن انتظار کر، تو اس کا بھی مشاہدہ کر لے گا۔''

اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ غلام علی اس کے منتظر رہے کہ دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے۔

آموں کی فصل تھی۔ ایک امیر آپ کی خدمت میں آموں کے کئی ٹوکرے لے کر آیا اور عاجزانہ عرض کیا۔ ''حضرت! آج میں نہیں مانوں گا آپ کو میرا یہ ہدیہ قبول کرنا ہی پڑے گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں آموں کا یہ ہدیہ نہیں قبول کروں گا کیونکہ یہ میرے مسلک کے خلاف ہے۔ آموں کے ٹوکرے واپس لے جا۔''

امیر نے عرض کیا۔ ''حضرت! میرا دل نہ توڑیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے جو بات کہہ دی، کہہ دی۔ میں تیرے آموں کا ہدیہ نہیں قبول کر سکتا۔''

امیر آموں کے ٹوکرے لے کر واپس چلا گیا۔ آپ نے غلام علی سے فرمایا۔ ''میں اس مشتبہ مال کو کس طرح قبول کر لیتا۔''

ابھی اس امیر کو گئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور رو رو کر کہنے لگا۔ ''پیرومرشد! میں نے روزی کے لیے ایک باغ لے رکھا ہے اسی پر میری اور میرے کنبے کی گزر بسر ہے۔ اس سال میرے باغ میں آموں کی فصل بہت اچھی رہی۔ میرا خیال تھا کہ میں اچھی کمائی کر لوں گا۔''

یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''ہاں ہاں کہو کہو، میں سن رہا ہوں۔''

اس نے عرض کیا۔ ''بادشاہ کے امیر ذوالفقار خان نے مجھے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ وہ آپ کے پاس بھی آتا رہتا ہے امسال اس نے میری آم کی فصل کو بہت نقصان پہنچایا۔ آج ہی اس نے میرے باغ کے آموں سے کئی ٹوکرے بھر لیے اور اس کا ایک پیسا بھی نہیں دیا۔ آپ ہی بتائیے، میں کیا کروں؟ آپ خدا کے لیے اس کو سمجھائیے کہ وہ مجھ کو برباد نہ کرے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس کو سمجھاؤں گا لیکن مجھ کو یہ یقین نہیں کہ میری نصیحت اس پر اثر کر جائے۔ ابھی تیری آمد سے پہلے وہ تیرے باغ کے آموں کے ٹوکرے میرے پاس لے کر آیا تھا لیکن میں نے انہیں نہیں قبول کیا۔ میں نے آموں کے ٹوکرے واپس کر دیے۔ میں پہلے ہی یہ سمجھتا رہا ہوں کہ امرا کا مال مشتبہ ہوتا ہے چنانچہ آج اس کی صداقت ظاہر ہو گئی۔''

غلام علی جملہ مراحل طے کر چکے تھے چنانچہ انہوں نے مرزا جانِ جاناں سے درخواست کی۔ ''حضرت! اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی خدمت میں مرید ہونے آیا ہوں۔ مجھے اپنے حلقہ بیعت میں داخل فرمالیں۔''

مرزا نے جواب دیا۔ ''غلام علی! اتنی جلدی نہ کر، یہاں اور بھی بزرگ ہیں۔ انہیں بھی دیکھ لے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو یہاں سنگ بے نمک لیسیدن کا مضمون ہے۔ کیا مزہ آئے گا۔''

غلام علی نے عرض کیا۔ ''پیرومرشد! مجھے یہی پسند ہے۔ میرا یہ فیصلہ انتہائی غوروفکر اور تجربوں اور مشاہدوں کا رہینِ منت ہے۔''

مرزا جانِ جاناں نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو بسم اللہ!''

شاہ غلام علی کو مرید کر لیا گیا۔ مرزا جانِ جاناں نے آپ پر خصوصی توجہ دی اور آپ نے پورے پندرہ سال آپ کی صحبت میں گزار دیے۔ اس کے بعد مرزا جانِ جاناں نے انہیں اجازت دے دی۔ ''اب تم اپنے طور پر کوشش کرو اور لوگوں کو مرید کرو تم نے یہاں جو کچھ دیکھا ہے اور درویشی میں جو پابندیاں اور شرائط ملحوظ رکھی گئی ہیں ان پر تم بھی سختی سے کاربند رہنا اور اپنے مریدوں کو اس کی تلقین کرتے رہنا۔''

شاہ غلام علی کو اپنے پیرومرشد کی جدائی گراں ضرور گزر رہی تھی لیکن اس کی تعمیل بھی اتنی ہی ضروری تھی چنانچہ انہوں نے مرزا جاناں سے جدا ہونے کے بعد توکل کو اپنا شعار بنا لیا۔ پرانے بوریے کا ایک بستر اور تکیے کی جگہ ایک اینٹ کا انتخاب کیا! اس حال میں انہیں سب سے زیادہ دشواری معاش کی پیش آئی۔ کئی کئی وقت کا فاقہ ہو جاتا۔ نفس اکساتا کہ ''اس آزمائش میں تو اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو سکتا ہے۔ اس لیے اپنے حجرے سے نکل اور دنیا کی فکر کر۔''

لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو اپنے پیرومرشد مرزا جانِ جاناں کا...... خیال آ گیا جہاں سرتاپا قناعت تھی، توکل تھا، اللہ پر بھروسا تھا۔ آپ نے اپنے نفس کو جھڑک دیا کہ ''اے نفس! میں نے درویشی کا جو لباس پہن لیا ہے تو اب اس کو نہیں اتار سکتا۔''

اس عہد کے بعد مشکلات میں کچھ زیادہ اضافہ ہو گیا اور فقروفاقہ نے کمزوری اس حد تک بڑھا دی کہ آنکھوں کے آگے تتلیاں ناچنے

لگیں۔ بیٹھے بیٹھے غشی طاری ہونے لگتی لیکن اس حال میں بھی انہیں ذکر و فکر کا پورا پورا ہوش تھا۔ غشی طاری ہوتی تو زبان پر اللہ ہوتا۔ ہوش میں آتے تو زبان سے اللہ نکلتا۔ آخر آپ کو یہ شبہ ہونے لگا کہ شاید یہ ان کا آخری وقت ہے اور وہ اسی حال میں اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں گے۔ انہوں نے اپنے حجرے کا دروازہ بند کرلیا اور خود سے خطاب کیا۔ ”غلام علی! اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ موت کا خوف تجھے حجرے سے نکال سکتا ہے اور تو دنیا کی طلب میں مارا مارا پھرنے پر مجبور ہوجائے گا تو یہ تیری خام خیالی ہے۔ اگر تیرا وقت آچکا ہے اور تیری زندگی کے دن پورے ہوچکے ہیں تو یہ سمجھ لے کہ یہ حجرہ، جو ابھی تک تیرا مسکن رہا ہے اب تیرا مدفن بن جائے گا۔“

اتنا کہہ کر انہوں نے حجرے کو اندر سے بند کرلیا۔ غشی نے غلبہ پالیا اور وہ حواسِ خمسہ سے دور ہوگئے۔ معلوم نہیں یہ غشی کب تک طاری رہی لیکن جب انہیں ہوش آیا تو بند حجرے میں کسی کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا جو کہہ رہا تھا۔ ”غلام علی! تو آزمائش میں پورا اترا۔ اٹھ اور اپنی روزی مجھ سے لے۔“

انہوں نے دیکھا ان کے پاس ہی کھانا پانی رکھا تھا۔ انہیں شک گزرا کہ یہ وسوسۂ شیطانی تو نہیں۔ انہیں کھانے پینے میں تامل ہوا تو اس شخص نے کہا۔ ”غلام علی! وسوسوں میں نہ پڑ۔ یہ تیرے رب نے بھیجا ہے اس کے انعام کو شک و شبہے سے آلودہ نہ کر۔ کفرانِ نعمت سے بچ۔“

غلام علی نے کھایا پیا اور خدا کا شکر ادا کیا، پوچھا۔ ”اے شخص! تو کون ہے اور تو اس بند حجرے میں کس طرح داخل ہوا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”یہ سارے فضول سوال ہیں، کوئی اور بات کر۔“

غلام علی نے مزید کہا۔ ”یہ رزق وقتی ہے یا دائمی؟ وقتی سے میری یہ مراد ہے کہ اس ایک وقت کے لیے اور دائمی سے میری مراد یہ ہے کہ تاحیات، جب تک زندہ ہوں۔ زندگی بھر کے لیے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”زندگی بھر کے لیے، جب تک زندہ ہو۔“

غلام علی نے پھر سوال کیا۔ ”تم اس بند حجرے میں کس طرح داخل ہوئے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”جو خدا اپنی مخلوق کو پتھروں میں غذا پہنچا سکتا ہے، کیا وہ اس بند حجرے میں نہیں پہنچا سکتا، غلام علی خدا...... کی قدرت اور رسائی کو محدود اور متناہی نہ سمجھو۔“

غلام علی شرمندہ ہوگئے، کہا۔ ”اے شخص! میں شرمندہ ہوں، واقعی مجھ کو اس انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔ یہ اندازِ فکر تو شیطانی ہے اور میں شیطان مردود پر لعنتیں بھیجتا ہوں۔“

انہوں نے خجل ہوکر اپنی گردن جھکالی۔ کچھ دیر بعد سر جو اٹھایا تو اس شخص کا کہیں پتا نہ تھا۔ حجرہ بدستور اندر سے بند تھا آپ اٹھے اور حجرے کا در کھول کر باہر نکل گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ اس کے بعد پھر حجرے میں واپس آگئے۔ شام کو انہیں پھر یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ”دیکھیے کھانے پینے میں اور کچھ ملتا ہے یا نہیں!“

رات کو جب وہ مراقبے میں تھے اور انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا، جب سر اوپر اٹھایا اور وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تو انہوں نے اس شخص کو ایک بار پھر حجرے میں موجود دیکھا۔ وہ کھانا پانی لیے سامنے کھڑا تھا۔ غلام علی نے حیرت سے پوچھا۔ ”ارے یہ تم! یہ تم کہاں تھے اور کہاں سے آگئے بھئی کمال ہی کر دیا تم نے۔ جب چاہتے ہو بند حجرے میں داخل ہوجاتے ہو اور جب نہیں چاہتے تو تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچا جاسکتا ہے۔“

انہوں نے رات کا کھانا بھی ابھی نہیں کھایا تھا جب یہ سامانِ خورونوش ان کے پاس پہنچا تو انہیں کھانے پینے سے کون روک سکتا تھا۔ آپ نے برائے نام کھانا کھایا اور پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔

اس کے بعد انہیں زندگی بھر معاش کی فکر نہیں کرنا پڑی۔

اب غلام علی کے پاس بھی لوگ آنے لگے تھے اور ان آنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا وطن برصغیر نہیں تھا۔ ایران، شام، عراق، ہر جگہ کا طالبِ حق آپ کے پاس آنے لگا اور آپ ان کو مطمئن کرکے اپنے پاس سے جانے دیتے۔

آپ کے پاس جو بھی آتا، آپ خدا سے فرماتے۔ ”یا اللہ! میرے گھر میں جو بھی آتا ہے میں اس کو وسیلہ نہیں بنانا چاہتا۔ اس کے لیے تو مجھ پر رحم فرما۔ میں آنے والے کے واسطے سے تیرے قرب کا طالب ہوں۔“

آپ ہر روز دس پارے ختم کرتے تھے۔ سوتے بہت کم تھے۔ رات کو تہجد پابندی سے پڑھتے تھے۔ اپنے ارادت مندوں کو بڑی مستعدی سے خدا کی طرف رجوع کرتے۔ اگر کوئی صرف ملنے آتا تو آپ اس کو بہت کم وقت دیتے تھے۔ جب وہ زیادہ دیر تک باتیں کرنے کی خواہش کرتا تو آپ فرماتے۔ ”بابا فقیر کو اپنی قبر کی فکر ہے اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔“

آپ کی صحبت میں جو لوگ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان میں مشہورِ زمانہ بزرگوں کی اولاد بھی شامل تھی۔ خواجہ باقی باللہ کے نواسے نواب امیر خان بھی ان میں شامل تھے۔ وہ آتے تو گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ شاہ غلام علی ان کے نانا کے ادب و لحاظ میں اپنی زبان بند رکھتے۔

ایک دن نواب امیر خان اس طرح چپک کر بیٹھے کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ ''زندگی مختصر ہے اور بندگی لازم، اس کے لیے یک سوئی اور خلوت درکار ہے۔ لیکن دوسروں کو اس کا کوئی خیال نہیں۔''

نواب امیر خان آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھے اور بدستور بیٹھے رہے۔ آخر آپ نے خادم سے کہا۔ ''ذرا اندر سے مکان کے قبالہ جات تو لانا۔''

خادم نے حیرت سے پوچھا۔ ''پیر و مرشد! یہاں اس وقت مکان کے قبالہ جات کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟''

آپ نے نواب امیر خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں اس مکان کے قبالہ جات نواب کی نذر کر دینا چاہتا ہوں، کیونکہ اگر یہ نہیں اٹھتے تو نہ اٹھیں، میں ہی مکان ان کے حوالے کر کے اٹھ جاؤں گا۔''

نواب امیر خان فوراً اٹھ کر چلے گئے، آپ نے فرمایا۔ ''دنیا کی چند روزہ زندگی میں اتنی فرصت کہاں جو کہیں بے کار بیٹھ کر ضائع کر دی جائے۔''

آپ کے پڑوس میں حکیم قدرت اللہ خان کا گھر تھا۔ اس کو آپ سے چڑ تھی اور آپ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ آپ کے مریدوں کو یہ بات گراں گزرتی تھی۔ وہ آپ سے اجازت چاہتے۔ ''حکم دیجیے ہم حکیم کو صحیح کر دیں گے۔''

آپ فرماتے۔ ''بندہ بندے کو کیا ٹھیک کرے گا۔ یہ کام خدا کا ہے وہی بندے کی اصلاح کر سکتا ہے۔ وقت کا انتظار کرو، اللہ نے چاہا تو یہ جیسا ہے ویسا نہیں رہے گا۔''

اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حکیم قدرت اللہ خان کی کسی بات پر بادشاہ ناراض ہو گیا اور اس نے حکیم صاحب کو قید میں ڈال دیا۔ یہ خبر عام ہوئی تو آپ کے مریدوں کو بڑی خوشی ہوئی، کہا۔ ''پیر و مرشد! حکیم ملعون اپنی سزا کو پہنچا۔ اس کی بدباطنی اس کو قید خانے تک لے گئی۔''

آپ نے مریدوں کو اس خوشی پر لعن طعن کی اور فرمایا۔ ''اللہ کا ایک بندہ مصیبت میں گرفتار ہوا تو اس پر خوش ہونے کا یہ کون سا پہلو ہے۔ خدا سے تو بہ استغفار کرو تاکہ وہ اس سے دوسروں کو محفوظ رکھے۔''

ایک مرید نے کہا۔ ''پیر و مرشد، یہ وہی شخص ہے جو اٹھتے بیٹھتے آپ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ آپ اس بدخو سے ہمدردی فرما رہے ہیں آخر یہ کیوں؟ ایسا کیوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''حکیم قدرت اللہ خان مسلمان ہے اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی مصیبت پر کس طرح خوش ہو سکتا ہے۔ میں بہت جلد بادشاہ سے ملنے اور حکیم صاحب کو رہا کرانے کی کوشش کروں گا۔''

مریدوں کی خوشی پر اوس پڑ گئی۔ اب ان کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

آپ دوسرے دن بادشاہ کے پاس پہنچ گئے۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ وہ آپ سے بہت متاثر تھا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ شاہ غلام علی اس سے ملنے آئے ہیں تو بے اختیار استقبال کو دوڑا اور آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر اپنے ساتھ محل میں لے گیا۔ آپ نے اندر جانے میں تامل سے کام لیا۔ فرمایا۔ ''بادشاہ! میں ایک شرط پر تیرے ساتھ اندر چل سکتا ہوں۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''سیدی و مولائی! آپ شرط کی کیا بات کرتے ہیں، اس ناچیز کو حکم دیجیے ان شاء اللہ اس کی تعمیل ہوگی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو نے حکیم قدرت اللہ خان کو قید میں کیوں ڈال دیا ہے؟''

بادشاہ سناٹے میں آ گیا۔ فوری طور پر اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا، بالآخر کہا۔ ''حضور! یہ نہ دریافت فرمائیں کہ میں نے حکیم قدرت اللہ خان کو قید کیوں کر دیا ہے، کیونکہ اس کے جان لینے سے حضور کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ آپ تو مجھ کو حکم دیجیے کہ اے بادشاہ تو یہ کر۔ بھلا مجھ میں اتنی ہمت ہے نہ اتنی مجال کہ میں آپ کے حکم کے خلاف کچھ کروں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں تیرے ساتھ محل کے اندر چل رہا ہوں لیکن تو بھی اسی وقت اور اسی لمحے حکیم قدرت اللہ خان کو رہا کر دے کیونکہ میں اسی غرض سے تیرے پاس آیا ہوں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''شاہ صاحب! یہ عجیب سی بات ہے کہ حکیم قدرت اللہ خان نے آپ کی ہمیشہ ہی مخالفت کی ہے لیکن آپ ہیں کہ اس کی رہائی کے درپے ہیں، اس کی آزادی کے خواہشمند ہیں حالانکہ یہ بہترین موقع تھا کہ آپ اس کو سزا دلوا دیتے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''بادشاہ! میں نے اس سلسلے میں تجھ سے مشورہ نہیں طلب کیا۔ اگر تو میری بات رکھنا چاہتا ہے تو میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کر، ورنہ جو تیرے جی میں آئے کر تا رہ۔''

بادشاہ آپ کو محل میں لے گیا اور کچھ دیر آپ کی باتیں سنتا رہا۔ آپ کو یہاں بھی حکیم قدرت اللہ خان کا خیال ستاتا رہا۔ آپ بار بار بادشاہ سے حکیم ہی کا ذکر کرتے۔ بادشاہ نے کہا۔ ''اے کاش اتنی ہی فکر کسی بادشاہ کو اپنی رعایا کی اور آقا کو اپنے نوکروں کی، مالک کو اپنے غلاموں کی، زبردستوں کو زیردستوں کی ہوتی تو اس دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔''

بادشاہ کے پاس سے جب گھر واپس آئے تو اپنے در پر حکیم قدرت اللہ خان کو اپنا منتظر پایا۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی اٹھا اور نہایت ادب سے

سر جھکا کر بولا۔ ''حضرت! خدا گواہ ہے کہ آپ کی عظمت اور بڑائی کا اتنا شاندار تجربہ اور ناقابلِ تردید شعور آج سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''شکر اپنے رب کا ادا کر، جس نے میری بات رکھ لی اور تجھ کو بادشاہ کی قید سے رہائی دلائی ورنہ اگر بادشاہ میری نہ سنتا تو تو اس وقت بھی اس کی قید میں ہوتا۔''

حکیم کو رونا آگیا، اس کی آواز بھرا گئی، بولا۔ ''حضرت! میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ میں نے ہمیشہ آپ کی غیبت کی اور اپنی نجی محفلوں میں آپ کی برائیاں کرتا رہا لیکن آپ نے اس کا کوئی خیال نہ کیا اور مجھ پر یہ احسان کیا کہ بادشاہ کی قید سے رہائی دلائی۔''

ایک مرید نے بادشاہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ''شاہ عالم اپنے مصاحبوں اور خوشامدیوں میں گھرا ظلم کرتا رہتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک سن رکھا ہے کہ اس کو عورتوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ ہر وقت عیش و عشرت میں ڈوبا رہتا ہے اور خوشامدی لوگ کسی طرح ان عورتوں ہی کے توسط سے اپنے حریفوں اور مخالفوں کو زک پہنچاتے ہیں۔''

شاہ صاحب کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا، آپ نے غصے میں پوچھا۔ ''کیا تو بادشاہ کو قریب سے جانتا ہے؟ اور یہ ساری باتیں جو تو نے کہیں، کیا تیرے اپنے علم اور مشاہدے کی ہیں؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں بادشاہ کی محفل میں کس طرح جا سکتا ہوں جو اپنے ذاتی تجربے، علم اور مشاہدے کی بات کروں۔ میں نے یہ باتیں دوسروں سے سنی ہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''افسوس کہ جو بات تو نہیں جانتا، دوسروں کی سنی سنائی کو اس طرح بیان کر رہا ہے گویا تو اس کا عینی شاہد ہے۔ تو نے بادشاہ کی غیبت کی اور گناہ کا مرتکب ہوا۔'' پھر بڑے دکھ سے کہا۔ ''میں روزے سے تھا لیکن تیری غیبت سے میرا روزہ جاتا رہا۔''

ایک دوسرے مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! غیبت تو اس نے کی ہے، پھر آپ کا روزہ کیوں جاتا رہا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے غیبت نہیں کی لیکن سنی تو ہے۔ غیبت میں ذاکر اور سامع برابر ہیں۔''

☆☆☆

اپنے پیر و مرشد کی طرح آپ بھی امرائی نذر نیاز سے ہمیشہ گریز اور پرہیز کرتے۔ بادشاہ نے کئی بار کوشش کی کہ آپ اپنی خانقاہ کے لیے کچھ لیں لیکن آپ ہر بار انکار کر دیتے۔

نواب امیر خان والیِ ٹونک نے جب بھی حاضری دی، درخواست کی کہ خانقاہ کے خرچ کے لیے کچھ قبول فرمالیں۔ آپ نے ہر بار یہی عذر کیا کہ اس بات کو نہ تو میرے پیر و مرشد نے گوارا کیا اور نہ میں اختیار کر سکتا ہوں۔

نواب امیر خان نے اصرار کیا۔ ''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''حرج ہے تبھی تو میں انکار کر رہا ہوں۔''

نواب برا مان گیا، بولا۔ ''اس طرح تو آپ زحمتوں میں گھرے رہیں گے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں بھی جاگیر رکھتا ہوں نواب، اور میری جاگیر ہیں مواعید الٰہی۔ میں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں چار چیزیں بہت ضروری ہیں۔ دست شکستہ، پا شکستہ، دین درست یقین درست۔''

آپ اپنے مریدوں میں آتشِ دوزخ کا ذکر کرتے تو خوف سے چہرے کا رنگ ہی بدل جاتا، فرماتے۔ ''میں دوزخ کی آگ سے بہت گھبراتا ہوں۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔''

مریدوں نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ جیسا حدیث نبوی ﷺ اور سنتِ رسول ﷺ کا پیرو بھی اگر آتشِ دوزخ سے ڈرے گا تو ہم جیسے گناہ گاروں کا کیا حال ہونا چاہیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں ڈرتا رہتا ہوں کہ نادانستگی میں کہیں کوئی ایسا گناہ نہ سرزد ہو جائے جس کی سزا جہنم ہو۔''

مریدوں نے عرض کیا۔ ''کیا نادانستہ گناہوں کی بھی سزا ملے گی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''لیکن نادانستہ گناہ بھی کیوں ہوں؟''

ایک دن آپ خواب سے بیدار ہوئے تو آپ کے چہرے سے خوشی نمایاں تھی، فرمایا۔ ''آج میں بے حد خوش ہوں۔ اتنا خوش کہ آج سے پہلے اتنا خوش کبھی نہیں ہوا۔''

مرید حیرت و استفسار سے آپ کی صورت دیکھتے رہے۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ پوچھتا یہ کیوں؟ اس خوشی کا سبب؟

آپ نے خود ہی ارشاد فرمایا۔ ''ابھی ابھی میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا۔ غلام علی! جو شخص ہم سے محبت رکھتا ہے اس

پر آتش دوزخ حرام ہوجاتی ہے۔" پھر مزید کہا اور رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا۔ "تجھ کو لوگ غلام علی کہتے ہیں جبکہ تو عبداللہ اور عبدالمہیمن ہے۔"

آپ کے تصرفات کا چرچا دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ اس سے نہ صرف وہ لوگ جو آپ کے پاس ہوتے، فائدہ اٹھاتے بلکہ وہ بھی فیض یاب ہوتے جو آپ سے دور ہوتے مگر دل سے قریب ہوتے۔ میاں احمد یار خان نامی ایک تاجر کا بھی انہی میں شمار ہوتا تھا۔ جن پر آپ کی نوازشیں تھیں اور جنہیں آپ کے روحانی تصرفات سے فیض حاصل ہوتا تھا۔ میاں احمد یار خان اپنی تجارت کے سلسلے میں دور دور تک جایا کرتا تھا اس کا سامان تجارت تو مویشیوں پر بار ہوتا اور خود بہلی میں سفر کرتا لیکن سفر پر جانے سے پہلے وہ آپ کی خدمت میں حاضری ضرور دیتا۔

ایک دن احمد یار خان نے ظہر کی نماز آپ کے ساتھ پڑھی اور اس کے بعد آپ سے عرض کیا۔ "حضرت! میں اپنی تجارت کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں، دعا فرمائیں خدا کامیابی سے ہمکنار کرے۔"

آپ نے دریافت کیا۔ "کیا تو سامانِ تجارت لے کر جا رہا ہے؟"

احمد یار خان نے جواب دیا۔ "جی پیر و مرشد لیکن بہت کم۔ مگر واپسی میں بہت کچھ لانے کا ارادہ ہے۔"

آپ نے ارشاد فرمایا۔ "میرا بھی یہی مشورہ ہے کہ تو اپنے ساتھ اتنا ہی سامان تجارت لے جا، جتنا اپنے ساتھ اپنی بہلی میں رکھ سکے۔"

احمد یار خان نے دریافت کیا۔ "حضور کا فرمان سر آنکھوں پر لیکن کیا اس میں بھی کوئی مصلحت ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اللہ کی مصلحت تو ہر کام میں ہوتی ہے۔ اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت ہی ہوگی جو اس نے تجھ کو باخبر کیا کہ میں تجھ کو اس سفر میں زیادہ سامان سفر لے جانے سے منع کر دوں۔"

احمد یار خان نے آپ کے ہاتھوں کو فرطِ محبت میں بوسہ دیا اور عرض کیا۔ "آپ نے فرمایا ہے تو اس پر عمل بھی ہوگا۔ آپ خدا کے قریب ہیں۔ خدا آپ کو ہم میں ہمیشہ قائم اور موجود رکھے۔"

احمد یار خان اپنے ساتھ مختصر سا سامانِ تجارت لے کر سفر پر روانہ ہوگیا۔ قافلہ کئی دن سفر کرتا رہا۔ یہ کبھی کسی آبادی سے گزرتا، کبھی کسی جنگل سے کبھی کسی صحرا سے، یہاں تک کہ ایک دن وہ ایک صحرا سے گزر رہا تھا کہ احمد یار خان کو اپنی بہلی کے پاس شاہ غلام علی نظر آئے۔ وہ بہلی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، احمد یار خان نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے پیر و مرشد کو دیکھا پہلے تو اس کو یہ وہم ہوا کہ شاید یہ اس کا حسنِ خیال ہے مگر بار بار غور کرنے سے بھی اس کو شاہ غلام علی ہی نظر آتے رہے، آخر اس سے رہا نہ گیا، پوچھا۔ "حضرت! آپ یہاں کیسے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں ایک بات تیرے گوش گزار کرنے آیا ہوں، اب وقت نہیں ہے، میں جو کچھ کہوں اس پر فوراً عمل کر۔"

احمد یار خان نے عرض کیا۔ "آپ مجھ کو حکم دیجیے۔ میں اس کی فوراً تعمیل کروں گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اپنی بہلی کو قافلے سے جدا کر لے اور تیزی سے آگے نکل جا، کیونکہ اس قافلے پر قزاقوں کا حملہ ہونے والا ہے۔"

احمد یار خان نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی بہلی کو قافلے سے الگ کر لیا اور تیزی سے کافی دور نکل گیا۔ قافلے والوں نے اس کو الگ ہوتے جو دیکھا تو انہیں گمان گزرا کہ اس تاجر کا شاید دماغ چل گیا ہے جو قافلے سے علیحدگی اختیار کر کے تباہی اور بربادی سے ہمکنار ہونے جا رہا ہے۔ کسی ہمدرد نے احمد یار خان کو روکنے کی کوشش کی اور کہا۔

"بھائی! جماعت میں عظمت ہے۔ قافلے سے الگ ہوجاؤ گے تو کوئی بھی تمہیں لوٹ سکتا ہے۔"

احمد یار خان نے جواب دیا۔ "اجی جناب۔ میرے پیر و مرشد نے ابھی ابھی مجھ کو خبردار کیا ہے کہ اس قافلے سے الگ ہوجا کیونکہ اس پر عنقریب ڈاکا پڑے گا اور قافلہ لٹ جائے گا۔ اس لیے میں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔"

اس شخص نے احمد یار خان کے دماغ میں فتور محسوس کیا پوچھا۔ "تیرا پیر و مرشد کون ہے اور وہ کہاں ہے ذرا میں بھی تو اس کو دیکھوں اور پوچھوں کہ اس نے ان ڈاکوؤں کو کہاں دیکھ لیا۔"

احمد یار خان نے جواب دیا۔ "میرے پیر و مرشد دہلی میں ہیں۔"

اس شخص نے سن کر کہا۔ "دہلی میں ہیں! کیا مطلب؟ کیا وہ دہلی سے تیرے پاس آئے تھے یہ بتانے کہ قافلے پر ڈاکا پڑنے والا ہے؟"

احمد یار خان نے جواب دیا۔ "ہاں وہ دہلی سے یہ بتانے آئے تھے۔ تجھ کو میرے بیان پر اتنا تعجب کیوں ہے؟"

اس شخص کا ہنسی کے مارے برا حال ہوگیا۔ ہنستے ہنستے اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ بولا۔ "اے شخص! ابھی تک تو مجھ کو تیری صحیح الدماغی پر شبہ تھا لیکن اب تیری باتیں سن کر یقین ہوگیا کہ تیرا دماغ واقعی چل چکا ہے اور اس وقت تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے، خدا تجھ پر رحم کرے۔"

احمد یار خان نے کہا۔ "اور خدا تجھ پر بھی رحم کرے۔"

احمد یار خان قافلے سے الگ ہوگئے اور اپنی بہلی کو دور نکال لے گئے کئی دن بعد وہ شخص تباہ حال ایک شہر میں احمد یار خان سے ملا اور بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "بھائی! تمہارا نام کیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ ''احمد یار خان!''
''اور تمہارے پیر و مرشد کا؟''
احمد یار خان نے جواب دیا۔ ''شاہ عبداللہ المعروف بہ شاہ غلام علی۔'' اس شخص نے درخواست کی۔ ''احمد یار خان! میں تمہارے پیر و مرشد سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے ان کے پاس لے چلو۔''
احمد یار خان نے جواب دیا۔ ''مگر وہ یہاں کہاں، ان کا تو دہلی میں قیام ہے وہیں ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔''
اس شخص نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ دہلی چلوں گا اور تمہارے پیر و مرشد سے ضرور ملوں گا۔''
احمد یار خان نے پوچھا۔ ''میں قافلے سے الگ ہو گیا تھا۔ میری عدم موجودگی میں قافلے پر کیا بیتی؟''
جواب دیا۔ ''جو کچھ تمہارے پیر و مرشد نے کہا تھا، پورا ہوا، قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور انتہائی خوں ریزی اور قتل و غارت گری کے بعد سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ میں نے اپنا مال و اسباب ڈاکوؤں کے قبضے میں چلا جانے دیا اور خود جان بچا کر بھاگ آیا۔''
احمد یار خان نے دل ہی دل میں اپنے پیر و مرشد کا شکریہ ادا کیا۔ اور جس غرض سے یہ سفر کیا تھا اس میں مشغول ہو گئے۔
آپ کی صحبت میں مختلف عقائد کے لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ ان میں دہلی کے ایک امیر میاں زلف خان بھی شامل تھے۔ بیعت ہونے سے پہلے یہ دہلی سے باہر تھے اور انہوں نے شاہ غلام علی کا نام سنا تھا۔ ان کے دل میں تحریک ہوئی کہ بیعت ہونے سے پہلے ان سے ملا جائے اور ان میں وہ خصوصیات تلاش کی جائیں، جو ان کے بیعت ہونے پر آمادہ کریں۔
امیر میاں زلف خان اپنے قافلے سے بچھڑ گئے اور ساتھ ہی دہلی کا راستہ بھی بھول گئے۔ وہ بڑی دیر تک ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ کسی سے راستہ پوچھنا اس لیے بے کار تھا کہ آس پاس دور دور تک آبادی کا پتا نہ تھا۔ جدھر بھی جاتے جنگلات ہی جنگلات نظر آتے تھے۔ انہیں خوف سا آنے لگا کہ کہیں کسی طرف سے کوئی درندہ نکل کر ان کا کام تمام نہ کر دے۔ یا اگر درندہ نہیں تو کوئی قزاق ہی نہ نکل پڑے۔ یہ اکیلے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان پر پریشانی اور خوف نے ایسا غلبہ کیا کہ سفر کرنے کی ہمت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ یہ عاجز آ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس امید موہوم کے سہارے کہ شاید کسی طرف سے کوئی شخص یا قافلہ نمودار ہو جائے اور یہ اس کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کر دیں۔
کافی دیر بعد انہیں ایک شخص اپنی ہی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سیدھا ان کے درخت کی طرف آیا اور انہیں سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ پوچھا۔ ''امیر زلف خان! کیا بات ہے؟''
امیر میاں زلف خان کو ایسا لگا جیسے وہ اس شخص سے واقف ہیں۔ پوچھا۔ ''جناب میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ ہیں کون اور یہ اکیلے کہاں جا رہے ہیں؟''
اس نے جواب دیا۔ ''زیادہ سوال جواب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں کسی قسم کی مدد درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ اپنی راہ لوں۔''
میاں زلف خان گھبرا گئے۔ پوچھا۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''
اس نے جواب دیا۔ ''دہلی!''
سوال کیا۔ ''کیا اکیلے ہی؟''
جواب دیا۔ ''نہیں خدا بھی میرے ساتھ ہے!''
میاں زلف خان نے پوچھا۔ ''آپ کو تنہا سفر کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ اکیلا کہاں ہوں خدا میرے ساتھ ہے۔''
میاں زلف خان نے سوچا کہ اگر اس شخص سے زیادہ سوال جواب کیے گئے اور یہ ناراض ہو کر چلا گیا تو وہ ایک بار پھر اکیلے ہی رہ جائیں گے چنانچہ انہوں نے کہا۔ ''جناب والا! میں دہلی جا رہا تھا کہ قافلے سے بچھڑ گیا۔ تنہا چلا مگر دہلی کا راستہ بھول گیا۔ یہاں میں کسی راہبر کی تلاش میں بیٹھا تھا کہ آپ آ گئے اور یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ آپ بھی دہلی ہی جا رہے ہیں۔ اب میں آپ ہی کے ساتھ دہلی چلا چلوں گا۔''
ان صاحب نے جواب دیا۔ ''تو پھر دیر نہ کر میرے ساتھ چل تارہ میں فی الحال کہیں رکنے یا پڑاؤ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔''
میاں زلف خان اسی وقت اس شخص کے ساتھ چل پڑے۔ وہ دونوں ایک ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ شام ہونے سے پہلے ہی یہ دونوں ایک بستی میں داخل ہو گئے یہاں انہوں نے شب بھر کے لیے ایک مسجد میں قیام کیا۔ رات کو غسل کیا یہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن کچھ دیر بعد ہی اس شخص نے کہا۔ ''امیر زلف خان! اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں اس لیے باتوں کا سلسلہ سرِ دست موقوف، دہلی پہنچ کر باتیں کر لوں گا۔''
امیر میاں زلف خان نے پوچھا۔ ''دہلی میں آپ کس جگہ ملیں گے؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''وہیں، جہاں آپ بیعت کریں گے!''

امیر میاں زلف خان کو یہ شخص انتہائی پراسرار اور آسیبی سا لگا۔ اس سے کوئی اور سوال کیے بغیر ہی خاموش ہو گئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن وہ پھر آرام کرنے کے بجائے نماز میں مشغول ہو گیا امیر میاں زلف خان کو نیند آ گئی اور اتنی گہری نیند سوئے کہ صبح آنکھ کھلی۔ فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ساتھی کو تلاش کیا لیکن اس کا کہیں کوئی پتا نہ تھا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے انتظار میں اپنا سفر بھی نہیں شروع کر سکے۔ آخر یہ سوچ کر کہ کہاں تک انتظار کریں گے اور دہلی میں تو ان سے ملاقات ہو ہی جائے گی۔ یہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب دہلی زیادہ دور نہیں تھا اور قریب قریب اس کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ آگے چل کر انہیں ایک قافلہ بھی مل گیا جو جنوبی ہند کے طویل سفر سے چلا آ رہا تھا۔ امیر میاں زلف خان اس میں شامل ہو کر دہلی میں داخل ہو گئے۔ وہ اپنے پڑاؤ سے سیدھے شاہ غلام علی کی خانقاہ پہنچے اور شاہ غلام علی کے خادمِ خاص سے کہا۔

”بھائی! میں ایک لمبے سفر سے تمہارے شاہ صاحب کی زیارت کو حاضر ہوا ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ان سے فوراً ہی ملاقات ہو جائے۔“

خادم نے جواب دیا۔ ”پہلے میں شاہ صاحب سے پوچھ لوں، اگر وہ اجازت دے دیں گے تو میں اسی وقت ان سے ملوا دوں گا۔ لیکن اگر انہوں نے ملاقات کے لیے کوئی اور وقت مقرر کر دیا تو میں آپ کو اس سے مطلع کر دوں گا۔“

امیر زلف خان چپ چاپ بیٹھ گئے۔ خادم کچھ دیر بعد اندر سے نمودار ہوا اور خوش خبری لایا کہ شاہ صاحب اسی وقت یاد فرما رہے ہیں۔

امیر میاں زلف خان بے تابانہ حجرے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت شاہ غلام علی دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھے تھے۔ امیر نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ”السلام علیکم یا سیدی و مولائی!“

آپ نے جواب دیا۔ وعلیکم السلام امیر زلف خان!“

امیر کو ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ یہ آواز وہ پہلے بھی کہیں سن چکا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شاہ غلام علی مڑے اور اپنا چہرہ امیر کی طرف کر دیا۔ امیر خوفزدہ ہو گیا۔ اور اس پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ یہ تو وہی شخص ہیں جو دورانِ سفر اس کو ملے تھے اور اس کو راہ دکھائی تھی۔ امیر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”حضرت! آپ؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ میں۔ کیوں؟ کوئی اور بات؟“

امیر نے کہا۔ ”اب میں کیا عرض کروں، مجھ میں تو اب اتنی ہمت ہی نہیں کہ آپ کے روبرو زبان کھولوں۔ میں نے تو اپنی زبان کو تالا لگا دیا۔“

شاہ غلام علی نے فرمایا۔ ”تو، تو مرید ہونے آیا ہے۔ اب دیر نہ کر۔“

امیر میاں زلف خان اسی وقت سے بیعت ہو گیا اور اپنے بیعت ہونے کے بعد وہ کچھ دیر وہیں رہا۔ اس کے بعد فرطِ جذبات میں پوچھا۔ ”حضرت! میرے لیے کیا حکم ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تیرے لیے یہی حکم ہے کہ سردست تو یہیں اس خانقاہ میں رہ۔“ پھر اس کے کئی دن بعد جب امیر میاں زلف خان کو...... یہاں رہنے میں کچھ تامل سا ہونے لگا تو انہوں نے ایک بار پھر رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔

شاہ غلام علی نے فرمایا۔ ”میں بھی یہاں کسی کو ہمیشہ کے لیے تو نہیں روک سکتا تو اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے جانا چاہتا ہے تو بصد شوق چلا جا لیکن اگر کہیں بھی ضرورت پیش آ جائے تو ضرور یاد کرنا، میں خود چلا آؤں گا۔“

امیر میاں زلف خان نے فرطِ عقیدت میں آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور دہلی میں ہی اپنے عزیز کے گھر چلے گئے۔ وہ بہت دنوں تک اس معمے کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے کہ آخر وہ شخص کون تھا۔ جو انہیں جنگل میں ملا تھا اور اس نے امیر کی راہبری کی تھی۔ اس کی آواز اور اس کی صورت تک میں شمہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔

کبھی کبھی وہ یہ سوچتا کہ شاہ غلام علی اور اس جنگل والے شخص میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں ہی ایک ہیں۔ اس نے ایک دو بار یہ بھی سوچا کہ کیوں نہ اس بات کی شاہ صاحب ہی سے تصدیق کر لی جائے۔

اپنی سوچ کے اس موڑ پر کھڑے ہونے کے بعد وہ لرز گیا۔ اس نے سوچا۔ اس اندیشے کو بس یہیں تک رہنے دیا جائے۔ اس کے آگے جانے میں خطرہ بھی ہے اور تشویش بھی۔

☆☆☆

ایک ہندو لڑکے کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ مسلمانوں کا لباس پہن کر ان کی وضع قطع بنا کر آپ کی محفل میں پہنچ گیا۔ وہاں دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ بیان کے درمیان میں اس طرح بیٹھ گیا کہ اس پر آپ کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ آپ حاضرین سے خطاب فرمانے لگے۔

آپ نے فرمایا:

”لوگو! یہ فقیری بڑی دشوار شے ہے۔ وہ کون ہے جو فقیر نہیں بننا چاہتا۔ مگر ہم میں کتنے ہیں جو اس کی دولت حاصل کرنے میں کامیاب

ہوئے ہیں؟"

محفل پر ایک سناٹا طاری تھا۔ آپ فرماتے رہے۔

"فقیر میں چار حرف ہیں۔ ف، ق، ی اور ر۔ جانتے ہو، ان چار حرفوں کا مفہوم کیا ہے۔ یہ چار حرف انتہائی وسیع معانی کے حامل ہیں۔ اگر فقیر بننا ہے تو ان کے معانی اور مطالب کا جاننا از حد ضروری ہے۔ فقیر کی ف کا مطلب فاقہ، ق سے مراد قناعت ہے اور ی سے یادِ الٰہی ہے اور باقی رہا حرف ر، تو یہ ریاضت کے لیے ہے۔"

کسی نے سوال کیا۔ "اگر کوئی شخص اس پر پورا اتر گیا تو؟"

آپ نے جواب دیا۔ "تو اس کا مطلب کچھ اس طرح ہو جائے گا۔ ف سے فضل ربی۔ ق سے قربِ الٰہی، ی سے یاری اور ر سے رحمتِ الٰہی لیا جائے۔ جس کو یہ چاروں چیزیں حاصل ہو جائیں پھر اس کو اور کیا درکار ہوگا۔"

کسی مرید نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "اور شاہ صاحب قبلہ! اگر کوئی شخص فقیر تو بن گیا مگر اس کو وہ چیزیں نہ مل سکیں جس کا ابھی ابھی آپ نے ذکر کیا ہے، تو فقیر کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "پھر فقیر کی ف اس کی فضیحت کا باعث بن جائے گی۔ ق، قہرِ الٰہی کی، ی یاس کی، اور ر رسوائی کی ہو جائے گی۔"

لوگ لرز گئے اور کسی میں اتنی ہمت نہ پیدا ہوئی کہ اس سلسلے میں کوئی اور سوال کر سکتا۔ ہندو نوجوان ان باتوں سے بہت متاثر ہوا آپ نے اچانک حاضرین سے فرمایا۔ "لوگو! تم میں ایک ایسا نوجوان بھی موجود ہے جو مسلمانوں کے لباس میں اس محفل میں آیا ہے مگر اندر سے وہ اس وقت بھی ہندو ہی ہے۔ اس کو میرے پاس لایا جائے۔"

حکم کی دیر تھی کہ لوگوں نے اس نوجوان کو پکڑ کر آپ کے روبرو پیش کر دیا۔ آپ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "نوجوان! کیا بات ہے۔ تو یہ چھپ چھپا کر اور مسلمانوں کی نظروں سے بچ کر یہاں تک کس طرح آ گیا۔ میں تو حیران ہو رہا ہوں کہ آخر یہ تجھ کو سوجھی کیا؟"

نوجوان نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "حضرت، میں آپ کو بہت عرصے سے پہچانتا ہوں لیکن یہ دوسری بات ہے کہ میں آج اور ابھی سے پہلے تک یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں پہچانا جاؤں گا۔ چنانچہ میں اسی اطمینان سے ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا کہ جولانیٔ طبع نے مجھ کو اس محفل میں آنے پر اکسایا اور میں مسلمانوں کا لباس پہن کر چلا آیا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "مسلمان دور ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ چنانچہ تو بھی دور ہی سے پہچان لیا گیا۔"

ہندو نوجوان نے کہا۔ "جناب! میں تو حیران اور پریشان ہوں کہ یہ محفل ہے یا کوئی طلسمی خانقاہ۔"

آپ نے فرمایا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

اس نے پوچھا۔ "کون سا سوال؟ آپ پوچھیے میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "تو نے مسلمانوں کا لباس پہن لیا ہے۔ اب اس لباس کی لاج رکھنا۔ عزت و آبرو رکھنا کیونکہ یہ لباس نہ تو اتنا عام ہے اور نہ ہی اتنا ارزاں چنانچہ جب یہ قیمتی لباس تو نے زیب تن کیا تو میں بہت خوش ہوا۔ لیکن اب بھی میں اس کی اصل خوشی کا حظ نہیں اٹھا سکتا۔"

ہندو نوجوان تو از خود رفتہ تھا۔ بولا۔ "آپ فرمائیں شاید وہ حظ بھی حاصل ہو جائے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اسلام کا لباس پہنا ہے تو اسے مستقل ہی پہنے رہو یعنی اسلام قبول کر لے۔"

ہندو نوجوان نے کہا۔ "مسلمان ہونے میں کسر ہی کیا رہ گئی آپ کلمہ پڑھایئے۔ میں مسلمان ہوا جاتا ہوں۔"

چنانچہ آپ نے اس کو مسلمان کر لیا اور وہ مسلمان ہو کر اتنا خوش ہوا گویا اس کو سب کچھ مل گیا تھا۔

☆☆☆

میاں احمد یار خان آپ کی خدمت میں یوں حاضر ہوا کہ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے، بات کرنا چاہتا تھا مگر زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ آپ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے میاں احمد یار خان؟"

احمد یار خان نے مریدوں کے ہجوم کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔

"حضرت! سب کے سامنے کیا عرض کروں، بات نازک بھی ہے اور خطرناک بھی۔ سب کے سامنے بولتے ہوئے خوف لگتا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "یہ ہجوم تو رہے گا ہی، تو سرگوشی میں میرے کان میں کہہ دے۔"

احمد یار خان کو پھر تامل ہوا آپ نے ناگواری سے کہا۔ "دیکھ، شاید ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو تیرے کام آ سکتے ہیں اس لیے تو جو کچھ کہنا چاہتا ہے ان کے سامنے ہی کہہ دے۔"

میاں احمد یار خان نے کہا۔ "حضرت، بادشاہ کو ان دنوں مال و زر کی ضرورت ہے چنانچہ اس نے بہتوں کو قید میں ڈال رکھا ہے۔ انہی میں

میرے چچا بھی شامل ہیں، بادشاہ نے انہیں بھی قید کر دیا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کچھ کیجیے۔"
آپ نے فرمایا۔ "بس اتنی سی بات یا کچھ اور بھی؟"
میاں احمد یار خان نے جواب دیا۔ "حضرت! میری ناقص رائے میں یہ بس اتنی سی بات نہیں ہے؟"
آپ نے فرمایا۔ "لیکن میں جو کہہ رہا ہوں یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے۔"
میاں احمد یار خان نے کہا۔ "اگر یہ اتنی اہم بات نہیں ہے تو پھر یہ مسئلہ حل کس طرح ہوگا؟ میرے چچا بادشاہ کی قید سے رہائی کس طرح پائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرے مریدوں میں سے چند کو اپنے ساتھ لے جا اور اپنے چچا کو قید خانے سے نکال لا۔"
احمد یار خان نے آپ کے مریدوں میں سے چند طاقتور اور توانا مریدوں کو الگ کیا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر شاہی قید خانے کی طرف چل پڑے۔ کچھ دیر بعد یہ لوگ شاہی قید خانے کے سامنے پہنچ گئے۔ ساتھیوں میں سے چند نے کہا۔ "ہمیں پہرے داروں پر حملہ کر دینا چاہیے۔ یہی پیر و مرشد نے بھی فرمایا تھا۔"

احمد یار خان نے جواب دیا۔ "نہیں پیر و مرشد نے یہ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ چند مریدوں کو ساتھ لو اور انہیں چھڑا کر لے آؤ۔"
ایک مرید نے کہا۔ "شاہی قید خانے میں یوں کسی مزاحمت کے بغیر داخل ہو جانا اور چچا کو باہر لے آنا کم از کم اپنی سمجھ میں تو آ نہیں رہا۔ ویسے جو تم سب کی رائے وہی میری رائے۔"
احمد یار خان نے آگے بڑھ کر پہرے داروں سے بات کرنا چاہی لیکن اس کو اچانک ایسا لگا گویا وہ اس کو دیکھ ہی نہیں رہے ہیں۔ احمد یار خان نے اپنے آدمیوں کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ سب اس کے قریب پہنچ گئے۔ اب یہ سب پہرے داروں کے بالکل سامنے کھڑے تھے لیکن وہ ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ احمد یار خان نے کہا۔ "دوستو! یہاں کی بینائی کو کیا ہو گیا۔ یہ ہماری طرف دیکھ کیوں نہیں رہے؟"
ایک مرید نے جواب دیا۔ "شاید پیر و مرشد کے التفات نے ان کی بینائی کو کم از کم ہمارے لیے سلب کر لیا ہے۔ اب ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔"
میاں احمد یار خان اپنے ساتھیوں کو لے کر قید خانے میں داخل ہو گئے۔ کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ احمد یار خان نے اپنے چچا کو ساتھ لیا اور باہر آ گئے۔ پہرے داروں نے انہیں دیکھا تک نہیں۔ یہ لوگ سیدھے شاہ غلام علی کی خدمت میں پہنچے اور احمد یار خان نے اپنے چچا کو ان کی خدمت میں کھڑا کر دیا اور کہا۔ "اب ان کی حفاظت آپ کے سپرد ہے۔ کیونکہ جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوگا کہ قید خانے میں نہیں ہیں تو ان کی گرفتاری کا نیا حکم جاری کر دے گا اور اس وقت ان پر اور زیادہ سختی کی جائے گی۔"
آپ نے جواب دیا۔ "بادشاہ کے آدمی اگر تیرے چچا کی گرفتاری کو آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ چچا شاہ غلام علی کی مہمانی میں ہیں، وہاں سے لے آئیں۔" پھر چچا سے کہا۔ "اور تم کچھ عرصہ یہیں رہو گے۔"
چند دنوں بعد بادشاہ نے احمد یار خان کے چچا کو یوں طلب کیا گویا اس کو ان کی گرفتاری اور رہائی کا کوئی علم ہی نہ تھا۔ شاہ غلام علی کی اجازت سے یہ بادشاہ کی خدمت میں چلے گئے۔ بادشاہ نے ان کی یوں پذیرائی کی گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے بعد بھی بادشاہ نے ان پر نہ تو سختی کی اور نہ ہی کسی قسم کے سوال جواب کی نوبت آئی۔

☆☆☆

آپ کو آخری عمر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ زیادہ نہیں جئیں گے۔ چنانچہ ایک دن فرمایا۔ "جب میں مر جاؤں تو میرا جنازہ جامع مسجد میں اس جگہ لے جائیں جہاں آثار نبویہ ﷺ رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں ان کے واسطے سے میرے لیے رسول اللہ ﷺ سے شفاعت کی درخواست کی جائے بعد میں دفن کیا جائے۔"
چنانچہ 22 صفر 1240ھ کو جب آپ کا وصال ہوا تو اس وصیت پر عمل کیا گیا۔ جنازے کے آگے عربی کے چند اشعار پڑھے جا رہے تھے۔ جن کا مفہوم تھا۔ "میں کریم کے آگے بغیر توشہ صفات و قلب سلیم گیا کیونکہ جب جانا کریم کے پاس ہو تو توشے کا لے جانا سب سے بری چیز ہے۔"
آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں چار قسم کے مرد پائے جاتے ہیں، نامرد، مرد، جواں مرد، فرد۔ دنیا کا طالب نامرد ہے۔ عقبیٰ کا طالب مرد ہے۔ عقبیٰ اور مولیٰ کا طالب جواں مرد اور صرف مولیٰ کا طالب فرد ہے۔"

ماخذات

بساتین السلاطین	تاریخ فرشتہ	عہد سلاطین دہلی	بدون تاریخ	فرمانروایان اسلام	مآثر الامراء
مرزا ابراہیم زبیری	محمد قاسم فرشتہ	صلاح الدین ناسک	طبا طبائی	لین پول	صمصام الدولہ شاہنواز خان

چھٹی صدی ہجری میں دو خاندانوں نے بخارا سے ہجرت کی اور برصغیر کا رخ کیا۔ یہ دونوں خاندان سادات کے
ے۔ انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کی پھر معلوم نہیں...... کیوں، دونوں خاندان والے لاہور سے بھی اکتا گئے اور یوپی
ے شہر بدایوں میں جا بسے۔ ان میں سے ایک خاندان کے بزرگ خواجہ علی نے اپنے صاحبزادے سید احمد کو دوسرے خاندان
ے بزرگ خواجہ عرب کی صاحبزادی زلیخا سے رشتۂ مناکحت سے جکڑ دیا۔ اس طرح یہ دونوں خاندان آپس میں رشتے دار بھی

محبوب الٰہی

ضیا تسنیم بلگرامی

ولیوں کا پیدا ہونے کے لیے گھرانوں کا انتخاب... اور پھر ان کی تربیت اور پرورش کے لیے انسانوں کا انتخاب ... اس کے بعد حالات اور تعلیم کا سلسلہ... اگر غور کیا جائے تو یہ تمام مراحل عام انسانوں سے کس قدر مختلف اور دشوار ہوتے ہیں۔ گویا اللہ کے خاص بندوں میں شمار ہونے کے لیے آزمائشیں اور کٹھن مرحلے پہلے سے کاتبِ تقدیر لکھ دیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کون اس کے امتحان پر پورا اترتا ہے وہی اس کا برگزیدہ بندہ کہلائے گا... خواجہ نظام الدین سے کون واقف نہیں... کیا شان ہے آپ کی... تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو کئی نامور اولیا سے ہوتے ہوئے بابا فرید شکر گنج کی خدمت میں پہنچے جنہوں نے عنایات کی بارش کے بعد کہا۔ ”بابا نظام الدین! ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت دی اور خلافت عطا کی۔“ اور پھر حضرت بختیار کاکی کی دستار اور اپنا عصا بھی عطا فرمایا۔ اللہ کے مقبول بندوں کی یہی تو نشانیاں ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیا کی زندگی کے نشیب و فراز



ہوگئے۔ سید احمد کو بادشاہ نے بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا۔

پھر ان دونوں کے ہاں 27 صفر 636 ہجری میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ دادا نے اس بچے کا نام محمد رکھ دیا۔

یہ بچہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ باپ اپنے بچے سے اتنی زیادہ محبت کرتا تھا کہ جب وہ اپنے گھر سے باہر ہوتا، تو اس کے خیال میں مست و مگن رہتا لیکن یہ بچہ ابھی پانچ ہی سال کا تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا اور ماں نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو مدرسے میں داخل کرا دیا۔ ان دنوں بدایوں میں جن اساتذہ کا شہرہ تھا ان میں علاء الدین اصولی سرفہرست تھے۔ انہوں نے بچے کو قدوری پڑھائی۔ قدوری پڑھا چکنے کے بعد مولانا اصولی نے ایک تقریب منعقد کی اور اپنے ہم عصر علما و مشائخ کو اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

محفلِ تقریب میں آخری سرے پر مولانا اصولی اپنے ہونہار اور سعادت مند شاگرد کے ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شہر بھر کے علما اور مشائخ جمع تھے۔ مولانا اصولی نے کھڑے ہو کر پہلے تو اپنے شاگرد کی تعریفیں کیں اور حاضرین کو بتایا کہ ان کا شاگرد محمد کتنا ذہین ہے اور سعادت مند بھی۔ اس کے بعد اعلان کیا کہ میں اس کے دستارِ فضیلت باندھنا چاہتا ہوں۔

کئی عالموں نے اس بچے کا امتحان بھی لیا۔ انہوں نے اپنی دانست میں اس بچے سے کئی ایسے مشکل سوالات کیے جن کے جواب اس بچے کے بس کی بات نہیں تھی لیکن ذہین بچے نے ان کے شاندار جواب دے کر ان علما کو خاموش کر دیا۔ علما کے بعد مشائخ کی باری آئی اور وہ بھی بچے کے جوابات سے بہت متاثر ہوئے۔

اس کے بعد مولانا اصولی نے انہیں کتب متداولہ اور علمِ لغت کا درس دیا۔ آخر انہوں نے ان کی والدہ کے پاس جا کر عرض کیا۔ ''محترمہ! اس بچے کو مجھ سے جو کچھ بھی پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اب اگر اسے مزید تعلیم دلوانی ہے تو آپ کو اس بچے کے ساتھ دہلی جانا پڑے گا۔''

ماں اپنے بیٹے کو مزید پڑھانا چاہتی تھیں، بولیں۔ ''ہاں، میں اپنے بچے کو مزید پڑھانا چاہتی ہوں اور اس کے لیے میں دہلی کا سفر بھی کروں گی بس آپ اتنی مہربانی فرمائیں کہ دہلی کے کسی لائق استاد کا نام بتا دیں۔''

استاد نے جواب دیا۔ ''مولانا شمس الدین دامغانی۔ ان کے فضل و کمال کا کوئی جواب نہیں۔ بادشاہ نے انہیں شمس الملک کا خطاب دے رکھا ہے۔''

اس وقت محمد کی عمر سولہ سال کی تھی۔ ماں انہیں لے کر دہلی چلی گئیں اور کوشش کر کے اپنے بیٹے کو مولانا شمس الدین کے شاگردوں میں داخل کرا دیا۔

مولانا ناغہ کرنے والے شاگردوں سے بہت چڑتے تھے لیکن یہ نیا شاگرد ایسا تھا کہ ناغہ کرتا ہی نہ تھا۔ ایک دن اس نئے شاگرد نے دیکھا کہ مولانا کئی دن غیر حاضر رہنے والے ایک شاگرد سے نہایت طنز اور سادگی سے فرما رہے ہیں۔ ''صاحبزادے! میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم کئی دن سے غیر حاضر ہو، مجھے تم میرا قصور بتا دو تاکہ میں پھر وہی قصور کروں اور تم درس میں نہ آسکو۔''

نئے شاگرد نے ڈرتے ڈرتے مولانا سے سوال کیا۔ ''حضرت! یہ آپ کیا فرمایا کرتے ہیں؟ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟''

مولانا نے نہایت شفقت سے جواب دیا۔ ''صاحبزادے! میں بدمذاق اور بے پروا شاگردوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اس لیے یہ چاہتا ہوں کہ جن کو پڑھنے کا شوق نہ ہو میرے حلقۂ درس میں نہ آئیں۔''

انہوں نے مولانا سے حریری کے چالیس مقامات پڑھے۔

دہلی میں ہلالِ طشت دار کی مسجد کے نیچے جو حجرے بنے ہوئے تھے، محمد انہی میں سے ایک میں رہا کرتے تھے۔ ان کے پڑوس میں شیخ نجیب الدین متوکل نامی ایک بزرگ رہتے تھے۔ ان کے توکل اور استغنا کا لوگوں میں بڑا چرچا تھا۔ محمد بھی ان سے بہت متاثر تھے اور اس تاثر نے انہیں متوکل کی صحبت میں پہنچا دیا۔ یہاں پتا چلا کہ متوکل بابا فرید الدین گنج شکر کے بھائی ہیں۔ یہ اپنے بھائی گنج شکر کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ محمد کو ان کی صحبت میں پہنچنے کا اشتیاق پیدا ہوگیا۔

ادھر مولانا شمس الدین کا درس ختم ہوا اور محمد نے علمِ حدیث کی تحصیل کے لیے مولانا کمال الدین کا تلمذ اختیار کیا۔ مولانا کمال الدین نہ صرف جید عالم تھے بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ سلطان بلبن نے ان کے علم و تقویٰ سے متاثر ہو کر اپنے دربار میں بلوایا مگر مولانا نہیں گئے اور کہلا دیا۔ ''میرے پاس نماز کے سوا کوئی چیز نہیں اور آپ اسے بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔''

سلطان بلبن اس جواب سے مرعوب ہو گیا اور اس نے پھر کبھی نہ بلایا۔

محمد نے مولانا کمال الدین سے علم حدیث حاصل کیا اور اس میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے مشاہیر سے رجوع کیا اور علمِ ہیئت، فقہ، علم تفسیر، اصول اور ہندسہ میں مشق بہم پہنچائی۔

محمد کا متوکل کی صحبت میں آنا جانا جاری رہا اور یہاں ہر روز ہی بابا فرید الدین گنج شکر کا ذکر ہوتا تھا۔ آخر ایک دن یہ بے قابو ہو گئے اور متوکل سے کہا۔ ''میں بابا فرید سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

شیخ متوکل نے جواب دیا۔ ''اس کے لیے تمہیں اجودھن پاک کا سفر کرنا ہوگا۔''

محمد نے کہا۔ ''میں اجودھن پاک تو کیا، بابا فرید کی خاطر سات سمندر پار بھی جا سکتا ہوں۔''

شیخ متوکل کسی سوچ میں پڑ گئے، پھر بولے۔ ''بسم اللہ، پھر دیر کیوں؟ یہ تامل کیسا؟''

محمد نے بابا فرید کے لیے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس کی، وہ اجودھن پاک جانے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ رات کو سوتے تو خواب بھی بابا فرید ہی کا دیکھتے۔ ایک دن علی الصباح مسجد کے منارے سے موذن کی آواز سنی تو تلملا گئے۔ آپ اذان بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ جب اذان ختم ہو گئی تو موذن نے قرآن پاک کی یہ آیت نہایت پُرسوز لہجے میں پڑھی۔

ترجمہ: کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، ان کے دل ذکرِ الٰہی سے جھک جائیں۔

اس آیت نے آپ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ فوراً مسجد تشریف لے گئے۔ نمازِ فجر ادا کی اور ادھر ادھر شیخ متوکل کو تلاش کرنے لگے۔ وہ کہیں نظر نہ آئے تو سیدھے ان کے گھر پہنچے۔ شیخ متوکل رات سے بیمار پڑے ہوئے تھے۔ محمد نے جاتے ہی سوال کیا۔ ''حضرت! آج آپ مسجد تشریف نہیں لائے؟''

بابا متوکل نے جواب دیا۔ ''ہاں، آج میری طبیعت خراب تھی۔''

محمد کچھ دیر کھڑے بابا متوکل کی صورت دیکھتے رہے۔ بابا متوکل نے پوچھا۔ ''تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کیا کسی کا انتظار ہے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی اجازت کا منتظر ہوں۔''

شیخ متوکل نے فرمایا۔ ''میری طرف سے اجازت ہے۔ جاؤ اور اسی وقت جاؤ۔''

محمد نے نہ تو زادِ سفر لیا، نہ کچھ اور شیخ متوکل کی صحبت سے اٹھے اور پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گئے۔ پڑاؤ پر گئے وہاں کئی قافلے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان میں ایک قافلہ ملتان کی طرف جا رہا تھا۔ محمد نے اس قافلے میں شامل ہو کر سفر شروع کر دیا۔

جب یہ اجودھن پہنچے تو شوقِ دید اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا...... بدھ کا دن تھا۔ چھ رجب چھ سو چھپن ہجری۔ یہ شیخ فرید الدین گنج شکر کے روبرو پہنچے تو انہوں نے دیکھتے ہی فارسی کا ایک شعر پڑھا۔

اے آتشِ فراقت دل ہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جاں ہا خراب کردہ

پھر فرمایا۔ ''اے نظام احمد بدایونی! میں تیرا انتظار ہی کر رہا تھا۔''

انہوں نے شرما کر عرض کیا۔ ''بابا! میرا نام محمد ہے۔''

بابا فرید نے جواب دیا۔ ''اس نام کی حرمت کر۔ تو نظام بدایونی ہے۔ نظام الدین بدایونی۔ میں اور اللہ کی مخلوق تجھے نظام نام سے پہچانے گی۔''

اس کے بعد محمد ابن سید احمد نظام الدین اور بعد میں نظام الدین اولیاؒ اور محبوب الٰہی ہو گئے۔

بابا فرید یہ فرما کر اٹھے اور اپنی کلاہ چہارتر کی نظام الدین کے سر پر رکھ دی اور خرقۂ خاص اور نعلین چوبیں (غالباً کھڑاؤں) بھی عطا فرما دیں۔ یہ چیزیں دے کر فرمایا۔ ''نظام! میں نعمتِ سجادہ اور ولایت ہند کسی کو دینا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں کئی نام میرے ذہن میں تھے مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ تم راستے میں ہو اور میرے پاس آ رہے ہو، میں رک گیا، پھر ہاتفِ غیبی نے مجھے مطلع کیا... فرید! ٹھہر جاؤ، نظام بدایونی آ رہا ہے یہ ولایت اسے دینا۔''

نظام الدین پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ اپنے اشتیاق کا حال بابا سے عرض کریں مگر قوتِ گویائی جواب دے گئی۔ بابا فرید کا دبدبہ قوتِ گویائی پر غالب آ گیا۔ بابا فرید نے خود ہی فرما دیا۔ ''بابا نظام! تم جتنا اشتیاق ظاہر

کرتے ہوئے اس سے کہیں زیادہ ہے اس لیے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اس کے بعد بابا فرید نے نظام الدین کو اپنے پاس ہی رکھ لیا اور ان کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔ بابا فرید کی مالی حالت بڑی خراب تھی اور خانقاہ میں عسرت اور تنگدستی کا راج تھا۔ بابا کے مریدوں میں سے چند نے اپنے ذمے کوئی نہ کوئی خدمت لے رکھی تھی۔ مولانا بدرالدین لنگر خانے کے لیے جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتے تھے۔ شیخ جمال الدین بھی جنگل سے لکڑیاں لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا بھی پکا دیا کرتے تھے۔ حسام الدین کابلی کے سپرد پانی کی ذمے داری تھی۔ برتنوں کی صفائی بھی انہی کے ذمے تھی۔ نظام الدین کے سپرد سبزی پکانے کا کام کر دیا گیا۔

ایک دن خواجہ نظام الدین سب کے لیے سبزی پکانے کھڑے ہوئے تو پتا چلا کہ نمک تو ہے ہی نہیں فکر مند ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ پیسے بھی پاس نہیں تھے۔ بابا فرید سے کہنے میں شرم محسوس کر رہے تھے۔ قریب ہی بنیے کی دکان تھی۔ نظام الدین اس کی دکان پر گئے اور نمک ادھار لے لیا۔ کھانا پک گیا سب کے لیے نکالا گیا۔ مولانا بدرالدین اسحاق، شیخ جمال الدین ہانسوی اور خواجہ نظام الدین تینوں ایک ہی پیالے میں کھا رہے تھے۔ بابا فرید نے پیالے میں ہاتھ ڈالا تو آپ نے اس میں گرانی سی محسوس کی اور آپ سے لقمہ اٹھ نہیں سکا، فرمایا۔ "ازیں بوئے اسراف می آید (اس میں سے اسراف کی بو آتی ہے)"

خواجہ نظام الدین سکتے میں آ گئے۔ بابا فرید نے پوچھا۔ "نظام! یہ نمک کہاں سے آیا تھا؟"

خواجہ نظام پر بابا فرید کے سوال سے لرزہ طاری ہو گیا، سہم کر جواب دیا۔ "ادھار لیا تھا۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "درویش فاقے سے مر جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے کے لیے کسی سے قرض لے۔ توکل اور قرض میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ یاد رکھو اگر مقروض درویش کو اچانک موت آ جائے تو قیامت کے دن قرض کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی رہے گی۔"

اس کے بعد آپ نے سبزی سے ہاتھ کھینچ لیا اور اسے غریبوں میں تقسیم کر دیا۔

خواجہ نظام اپنی اس کوتاہی پر اتنے نادم ہوئے کہ تنہائی میں جا کر آنسو بہاتے رہے اور دل میں یہ عہد کر لیا کہ اب وہ کبھی بھی کسی سے قرض نہیں لیں گے۔ بابا فرید اچانک ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں وہ کملی بھی تھی جس پر وہ بیٹھتے تھے۔ کملی خواجہ صاحب کو دے دی اور فرمایا۔ "نظام! انشاءاللہ آئندہ تمہیں کبھی قرض کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

بابا فرید نے انہیں اپنے پاس تقریباً ساڑھے سات ماہ رکھا۔ اس دوران ان کی شاندار تربیت فرمائی۔ ایک دن بابا فرید نے فرطِ جوش میں فرمایا۔ "خواجہ نظام! جو چاہو مانگ لو۔"

خواجہ نظام نے عرض کیا۔ "حضرت! میں استقامت کا طالب ہوں۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "دیا۔" پھر فرمایا۔ "اپنا منہ کھولو۔"

خواجہ نظام نے منہ کھول دیا۔ بابا فرید نے اپنا لعابِ دہن ان کے ہونٹوں سے مس کر دیا۔ فرمایا۔ "تم کلام پاک حفظ کرو گے؟"

خواجہ نظام نے وعدہ کیا۔ "ضرور حفظ کروں گا۔"

بابا فرید نے مزید فرمایا۔ "خواجہ نظام! اللہ نے تمہیں دنیا و دین دونوں ہی دیے ہیں یہاں سب موجود ہے لہٰذا تم ہندوستان کا ملک لو۔" پھر خلافت عطا کر کے فرمایا۔ "خواجہ نظام! اللہ تعالیٰ نے تمہیں علم، عقل اور عشق بخشا ہے اور جس میں یہ تینوں صفتیں موجود ہوں، وہی خلافت کا حق دار ہے اور سنو، خوب غور سے سنو۔ قرض سے بچنا اور اگر کسی مجبوری سے قرض لینا ہی پڑ جائے تو اسے جلد لوٹا دینا۔ اپنے دشمنوں کو ہر حال میں خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔ انہیں دکھ نہ دینا اور نہ ہی انہیں ناراض کرنا۔"

یہ دور ربیع الاول 656 ہجری کا ذکر ہے۔ بابا فرید کی صحبت میں اہلِ صفا موجود تھے، ان میں خواجہ نظام الدین بھی شامل تھے۔ بابا فرید نے ان سب کی موجودگی میں فرمایا۔ "بابا نظام الدین! ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت دی اور خلافت عطا کی۔"

خواجہ نظام الدین نے سر جھکا لیا اور پھر زمین بوس ہو گئے۔

بابا فرید نے حکم دیا۔ "بابا نظام! سر اوپر اٹھاؤ۔"

خواجہ نظام الدین نے جیسے ہی سر اٹھایا، بابا فرید نے اپنی دستار اتار کر ان کے سر پر رکھ دی، فرمایا۔ "بابا نظام الدین

یہ دستار حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی ہے۔" پھر اپنا عصا بھی دے دیا اور اپنے ہاتھ سے خرقہ پہنایا اور فرمایا۔ "بابا دوگانہ ادا کرو۔"

خواجہ نظام الدین قبلے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ بابا فرید نے ان کا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ "بابا! میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا۔"

اس کے بعد انہیں دہلی واپس جانے کی اجازت مل گئی۔

خواجہ نظام الدین نے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ دہلی پہنچ کر وہ اپنے ایک عزیز کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ آپ نے اپنے اس عزیز سے ایک کتاب مستعار لے رکھی تھی مگر یہ کتاب گم ہو گئی تھی۔ آپ نے اپنے عزیز سے کہا۔ "افسوس کہ آپ کی کتاب مجھ سے گم ہو چکی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کتاب کو کسی سے حاصل کر کے نقل کر دوں۔"

عزیز نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "نہیں، ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کو معاف کر دیا۔"

آپ نے اپنے اس عزیز کا شکریہ ادا کیا۔

پھر آپ کو یاد آیا کہ انہوں نے ایک بزاز سے ادھار کپڑا لے رکھا ہے۔ آپ سیدھے اس بزاز کے پاس پہنچے۔ اس وقت آپ کے پاس کچھ رقم موجود تھی۔ آپ نے بزاز سے فرمایا۔ "بھائی! میں تمہارا مقروض ہوں، اس وقت میرے پاس کچھ رقم موجود ہے، اسے قبول فرما کر مجھے شکرگزاری کا موقع دیجیے۔"

بزاز نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے اصرار کیا، فرمایا۔ "تمہیں مجھ سے یہ رقم لینی ہی پڑے گی۔"

جب آپ نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بزاز نے کہا۔ "حضرت، میں ایک شرط پر یہ رقم لوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "کون سی شرط؟"

بزاز نے جواب دیا۔ "اگر میں آپ سے یہ رقم لوں گا تو آپ بقیہ رقم کی واپسی پر مصر نہیں ہوں گے۔"

خواجہ نظام الدین نے فرمایا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں ادھار کی رقم تو بہر حال ادا کروں گا۔"

بزاز نے عرض کیا۔ "تب پھر میں یہ رقم بھی نہیں لوں گا۔"

خواجہ نظام الدین نے بڑے تحمل سے کہا۔ "بھائی! اگر تو اتنا ہی ضدی ہے تو میں بھی خاموش ہوا جاتا ہوں۔"

بزاز نے تھوڑی سی رقم لے کر انہیں معاف کر دیا۔ آپ نے بزاز کا شکریہ ادا کیا۔

آپ نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔ آپ کا قیام شہری آبادی کے بیچ میں تھا۔ لوگوں نے حاضریاں دینا شروع کر دیں اور اس میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا کہ آپ کی عبادت و ریاضت میں خلل پڑنے لگا۔ آپ نے ان لوگوں سے دور رہنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب قرآن پاک کو حفظ کرنے کا وقت آتا، آپ جنگل کی طرف چلے جاتے۔

آپ قرآن پاک کی چند آیتیں حفظ کرنے کے بعد جنگل سے شہر کی طرف جانے ہی والے تھے کہ ایک درویش نے آپ کا راستہ روک لیا، پوچھا۔ "نظام الدین! کہاں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "شہر واپس جا رہا ہوں۔"

درویش نے کہا۔ "بابا! شہر میں فسق و فجور کا زور ہے، اس حال میں شہر میں رہ کر کیا کرو گے؟"

آپ نے پوچھا۔ "پھر میں کیا کروں؟"

درویش نے کہا۔ "میں کیا جانوں کہ تم کیا کرو۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ شہر میں رہنے سے ایمان خطرے میں رہتا ہے۔"

آپ اس وقت تو شہر چلے گئے لیکن درویش کی باتوں پر مسلسل غور کرتے رہے آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ شہر میں رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اسی وقت شہر چھوڑ دیا اور شہر کے باہر موضع غیاث پور چلے گئے۔ اس کے پاس ہی جمنا بہہ رہی تھی۔ آپ نے اپنے درویش ساتھیوں کی مدد سے چند جھونپڑیاں بنائیں اور ان میں رہنے لگے۔

آپ کی والدہ بھی آپ کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں۔ معاشی حالات بہت خراب تھے۔ کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے۔ ایک دن کسی ارادت مند نے آپ کی والدہ سے پوچھا۔ "اس وقت گھر میں کچھ کھانے کے لیے ہے یا نہیں؟"

والدہ نے جواب دیا۔ "آج ہم اللہ کے مہمان ہیں۔"

ماں کا یہ فقرہ آپ کو بہت پسند آیا اور جس دن گھر میں آسودگی پائی جاتی، آپ افسوس کرتے کہ آج میری ماں یہ پُرلطف فقرہ نہیں کہہ سکیں گی کہ آج ہم اللہ کے مہمان ہیں۔

آپ کی عسرت اور تنگ دستی کی خبریں مشہور ہونے لگیں۔ سلطان جلال الدین خلجی بھی آپ کے ارادت مندوں میں سے تھا۔ جب اس نے یہ خبر سنی تو آپ کی خدمت میں کہلا بھیجا۔ ''اگر حضور اجازت دیں تو خدمت گزاروں کی بسر اوقات کے لیے چند گاؤں آپ کی نذر کر دوں۔''

اس وقت جو چند درویش آپ کے پاس موجود تھے، آپ نے ان کی طرف دیکھ کر دریافت فرمایا۔ ''بادشاہ کی اس پیشکش کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟''

درویشوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور آخر کار ان سب کی طرف سے ایک نے جواب دیا۔ ''حضرت! موجودہ حالات میں تو ہم آپ کے ہاں بھی کبھی روٹی کھا لیتے ہیں لیکن اگر آپ نے بادشاہ کے یہ گاؤں قبول کر لیے تو ہم سب آپ کے ہاں کا پانی پینا بھی گوارا نہ کریں گے۔''

آپ کو درویشوں کا یہ جواب بہت پسند آیا اور سلطان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

آپ کے ساتھ جو درویش رہتے تھے، ان میں شیخ برہان الدین غریب اور شیخ کمال الدین یعقوب جیسے عظیم بزرگ بھی شامل تھے۔ فاقوں نے ان کا حال بھی برا کر رکھا تھا۔ ان پر ایک ایسا وقت بھی آ گیا کہ انہیں چار دن تک فاقے سے رہنا پڑا۔ ان کے پڑوس میں ایک ایسی خاتون بھی رہ رہی تھیں جو خواجہ نظام الدین سے بیعت تھیں، جب ان خاتون کو درویشوں کے فاقے کا علم ہوا تو کچھ آٹا ان کی خدمت میں بھجوا دیا۔

شیخ کمال الدین یعقوب نے یہ آٹا مٹی کے ایک برتن میں ڈال کر آگ پر رکھ دیا۔ اتنے میں درویشوں کے لباس میں ایک مسافر وارد ہوا اور ان سے کھانا مانگا۔ خواجہ نظام الدین پاس ہی موجود تھے۔ انہوں نے برتن اٹھا کر درویش کے سامنے رکھ دیا۔ کھانا بہت گرم تھا۔ درویش نے گرم گرم لقمے ہی منہ میں ڈال لیے اور پھر برتن کو زمین پر پٹخ دیا۔ خواجہ نظام الدین اور دوسرے درویش یہ منظر دیکھتے رہ گئے۔

ایک درویش نے پوچھا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''شیخ فریدالدین گنج شکر نعمت باطن شیخ نظام الدین اولیا ارزانی داشت و من دیگ فقر ظاہری او بشکستم حالا سلطان ظاہری و باطنی شدی (شیخ فریدالدین گنج شکر نے تمہیں نعمت باطنی دی اور ہم نے تمہارا فاقہ توڑا)

کہتے ہیں اس کے بعد ان کی معاشی حالت بالکل بدل گئی۔ عسرت کا دور جاتا رہا۔ خوشحالی نے ڈیرہ ڈالا۔

☆☆☆

آپ کو مال و زر کی کوئی کمی نہ رہی، لنگر جاری کر دیا گیا۔ امرا آپ کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے اور آپ انہیں مسترد فرما دیتے۔

آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو نصیحتیں فرما رہے تھے کہ کسی نے آپ کو مطلع کیا کہ ایک امیر باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔

آپ نے فرمایا۔ ''حاضر کیا جائے۔''

اس امیر کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ امیر کے پیچھے پیچھے اس کا خدمت گار بھی تھا۔ خدمت گار نے ایک پوٹلی کاندھے پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی خدمت گار کو حکم دیا کہ پوٹلی خواجہ نظام الدین کے قدموں میں ڈال دی جائے۔

حکم کی تعمیل ہوئی اور خدمت گار نے آپ کے قدموں میں تنکوں (اس عہد کے سکے) کا ڈھیر لگا دیا۔

آپ نے امیر سے پوچھا۔ ''کیا تو اسی لیے میرے پاس آیا ہے؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''اس میں کیا شک! میں یہ نذرانہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، انہیں واپس لے جا۔''

امیر نے عاجزانہ گزارش کی۔ ''حضرت! میری اس حقیر نذر کو قبول فرما لیں، میں اسے اپنی سعادت سمجھوں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اسے اس لیے قبول نہیں کر رہا ہوں کہ کل یہ تیرے کام آئے گا۔ میرے پاس اور مال ہے۔'' پھر آپ نے اس سے فرمایا۔ ''ذرا اپنی بائیں سمت تو دیکھ۔''

امیر نے اپنے بائیں جانب جو دیکھا تو وہاں اشرفیوں کا ڈھیر نظر آیا۔ وہ آپ کے قدموں میں گر گیا اور اپنا نذرانہ

واپس لے گیا۔

دور دور سے لوگ آ رہے تھے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ انہی دنوں اتاوہ کے قصبے پٹیالی کے ایک امیر سیف الدین محمود نے اپنے دونوں بیٹوں کا ہاتھ پکڑا اور خواجہ نظام الدین کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ امیر اپنے دونوں بیٹوں کو خواجہ نظام الدین کی مریدی میں دینا چاہتا تھا لیکن امیر کا چھوٹا بیٹا اس پر تیار نہیں تھا۔ جب امیر خواجہ نظام الدین کے دروازے پر پہنچ گیا تو چھوٹے بیٹے نے اپنے باپ سے دریافت کیا۔ ''باوا جان! آپ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تیرے بڑے بھائی کو حضرت نظام الدین کی بیعت میں دے دوں۔''

چھوٹے بیٹے نے عرض کیا۔ ''تب پھر آپ دونوں اندر تشریف لے جائیں۔ میں باہر آپ دونوں کا انتظار کروں گا۔''

باپ نے اندر چلنے پر اصرار کیا۔ ''تو بھی اندر چل، آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔''

لیکن چھوٹا بیٹا اندر نہیں گیا۔ جب وہ دونوں اندر چلے گئے تو چھوٹے بیٹے نے بیٹھے بیٹھے دو شعر موزوں کیے اور اپنے دل میں کہا کہ اگر خواجہ نظام الدین کامل ہیں تو اپنے نورِ باطن سے دونوں شعروں کا حال معلوم کر لیں گے اور میرے دونوں شعروں کا جواب شعروں سے دے کر مجھے طلب فرمائیں گے پھر میں اندر جا کر بیعت کرلوں گا لیکن اگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو میں اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ پٹیالی واپس چلا جاؤں گا۔

چھوٹے بیٹے نے درج ذیل شعر موزوں کیے۔

تو آں شاہے کہ بر ایوانِ قصرت
کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد
بیاید اندروں یا باز گردد

(تو ایسا بادشاہ ہے کہ اگر تیرے محل کے کنگورے پر کبوتر بیٹھے تو وہ تیری برکت سے باز بن جائے۔ ایک غریب حاجت مند تیرے دروازے پر آیا ہے۔ وہ اندر آ جائے یا واپس چلا جائے)

ابھی یہ شعر موزوں کر کے بیٹھے ہی تھے کہ اندر سے ایک شخص آیا اور کہا۔ ''صاحبزادے! مجھے میرے مرشد نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ باہر ایک ترک زادہ بیٹھا ہے اسے میرے دو شعر سنا کر واپس آ جاؤ۔'' اس کے بعد اس نے دونوں شعر سنا دیے۔

بیاید اندروں مردِ حقیقت
کہ باما یک نفس ہم راز گردد
اگر ابلہ بود آں مردِ ناداں
ازاں راہے کہ آمد، باز گردد

(حقیقت کے میدان کا مرد اندر چلا آئے تا کہ ہمارے ساتھ کچھ دیر ہمراز بن جائے۔ اگر وہ آنے والا نادان اور نا سمجھ ہے تو جس راستے سے یہاں آیا ہے اسی راستے سے واپس چلا جائے)

امیر کا چھوٹا بیٹا دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر داخل ہو گیا۔ خواجہ نے اسے نہایت محبت بھری نظروں سے مسکرا مسکرا کر دیکھا۔ یہ آپ کے قدموں میں گر گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''آ جا آ جا اے مردِ حقیقت اور ذرا سی دیر کے لیے میرا ہمراز بن جا۔''

سامنے امیر سیف الدین اور ان کا بڑا بیٹا اس عجیب منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

شاعر بیٹے نے عاجزی سے درخواست کی۔ ''حضور! میں شرفِ بیعت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں تیار ہوں۔''

آپ نے اس شاعر کو اسی وقت بیعت فرما لیا، بعد میں یہ شاعر جمیع اوصاف قرار پایا اور دنیا آج بھی اسے امیر خسرو کے نام سے جانتی ہے۔

☆☆☆

جب سلطان جلال الدین خلجی کو قتل کر کے علاء الدین خلجی برصغیر کا بادشاہ بنا تو اس نے بھی خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی

سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ آپ ایک بار اس کے پاس حاضر ہو جائیں تو یہ اس کی خوش قسمتی ہوگی مگر آپ اس پر بھی تیار نہ ہوئے۔

ایک دن بادشاہ کا ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! بادشاہ نے فرمایا ہے کہ حضور کم از کم ایک بار تو دربار میں حاضر ہو جائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جا اپنے بادشاہ سے کہہ دے کہ میں ایک گوشے میں پڑا ہوں اور تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ رہا۔ میں یہاں سے بادشاہ اور تمام مسلمانوں کے لیے دعائے خیر کرتا رہتا ہوں اگر بادشاہ نے میری حاضری پر اصرار کیا تو میں یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا۔''

بادشاہ کا آدمی واپس گیا اور آپ کے جواب سے بادشاہ کو مطلع کر دیا۔

بادشاہ نے کہا۔ ''تو دوبارہ ان کی خدمت میں جا اور ان سے کہہ دے کہ اگر وہ خود تشریف نہیں لاتے تو نہ لائیں، میں خود ہی آپ کے دربار میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

جب بادشاہ کا یہ پیغام آپ تک پہنچا تو آپ نے جواب میں کہلا دیا۔ ''اے شخص! بادشاہ سے کہہ دے کہ وہ میرے پاس آنے کی زحمت نہ کرے۔ میں یہیں سے بادشاہ کے لیے دعا گو ہوں۔ بادشاہ سے کہہ دے کہ غیب کی دعا زیادہ پُراثر ہوتی ہے اور بادشاہ کو یہ بات بھی بتا دے کہ فقیر کے مکان کے دو دروازے ہیں۔ بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا، فقیر دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے گا۔''

بادشاہ آپ کے اس جواب سے ناراض نہیں ہوا۔ خاموش ہو گیا اور جب تک زندہ رہا اس کوشش میں رہا کہ محبوب الٰہی اگر شرفِ ملاقات نہیں بخشتے تو اس کے نذرانے ہی قبول فرمالیں مگر آپ نے اس کے نذرانے بھی قبول نہیں فرمائے۔

آپ کے مقبول ترین مریدوں میں سید محمد امام نامی ایک بزرگ بھی تھے، جو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے وہ ان کا سہارا لیتے۔ ایک دن ایک پریشان حال اور حواس باختہ شخص آپ کے در پر آیا اور سید محمد امام سے عرض کیا۔ ''جناب! میں اسی وقت پیر و مرشد سے ملنا چاہتا ہوں۔''

سید محمد امام نے پوچھا۔ ''کسی غرض سے یا یونہی؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''جناب میں ایک غرض لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

سید محمد نے اس شخص کو اندر پہنچا دیا۔ آپ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟''

اس شخص نے کہا۔ ''حضور! میری جاگیر کی سند گم ہو گئی ہے۔ میں نے بادشاہ کے اہل کاروں سے اس کی نقل مانگی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اب آپ ہی فرمائیں میں کیا کروں؟''

آپ نے مسکرا کر پوچھا۔ ''پھر میں کیا کروں، یہ معاملہ تو بادشاہ اور اس کے اہلکاروں سے تعلق رکھتا ہے۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ دعا تو کر سکتے ہیں۔''

آپ بہت خوش تھے ازراہِ مذاق فرمایا۔ ''میں خالی خولی دعا نہیں کرتا، اگر تو مجھے گرما گرم حلوا کھلا دے تو میں تیرے لیے ضرور دعا کروں گا۔''

غرض مند باؤلے نے فوراً جواب دیا۔ ''حضرت! میں ابھی لایا، آپ کے لیے حلوا۔''

یہ شخص بھاگا بھاگا حلوائی کی دکان پر پہنچا اور آپ کے لیے حلوا خریدا۔ حلوائی نے حلوے کے لیے کاغذ جو اٹھایا تو اس شخص کی اس پر نظر پڑ گئی۔ یہ اس کی جاگیر کی سند تھی۔ اس نے کہا۔ ''بھائی یہ کاغذ مجھے دے دو اور حلوا کسی دوسرے کاغذ میں دے دو۔''

حلوائی نے یہ کاغذ اس شخص کو دے دیا اور حلوا کسی اور کاغذ میں باندھ دیا۔

اس شخص نے حلوا تو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا اور جاگیر کی سند کی بابت کہا۔ ''حضرت! میری سند مجھے مل گئی، اس وقت میں بہت خوش ہوں۔''

آپ نے تجاہل عارفانہ سے فرمایا۔ ''سند؟ یہ کہاں چلی گئی تھی؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں نے جب حلوائی سے حلوا خریدا تو میری سند ردی کاغذات میں پڑی دکھائی دی چنانچہ میں نے حلوائی سے اپنی سند مانگ لی۔''

آپ نے پوچھا۔ ”حلوا، کہاں ہے؟ میرا حلوا؟“
اس نے حلوا آپ کے سامنے رکھ دیا، کہا۔ ”حاضر ہے تناول فرمائیں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”میں حلوا کیا کھاؤں گا اسے اپنے گھر لے جا اور حضرت شیخ العالم کی نیاز دے کر بچوں میں تقسیم کر دے۔“

وہ شخص خوش خوش اپنے گھر چلا گیا اور ہمیشہ کے لیے آپ کا مرید ہو گیا۔

ان دنوں علاء الدین خلجی کا نامور سپہ سالار ملک کافور دکن کی مہمات میں الجھا ہوا تھا۔ دکن کی دیوگڑھ ریاست کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ راجا کا خاندان تتر بتر ہو چکا تھا۔ ریاست کا راج کمار مہندر ہردیو تباہ حال دہلی پہنچا، اتفاق سے اس کی ملاقات امیر خسرو سے ہو گئی۔ امیر خسرو دہلی دربار سے وابستہ ہو چکے تھے۔ خسرو نے اس آوارہ وطن کو اپنا مہمان بنالیا۔

مہندر ہردیو نے خواجہ نظام الدین کا شہرہ سنا تھا اور وہ ان سے ملاقات کا خواہش مند تھا۔ خسرو نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کسی دن اپنے پیر و مرشد سے ضرور ملوا دیں گے۔

رات کو دیر تک خسرو اور مہندر ہردیو میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دو تہائی رات گزر چکی تھی۔ خسرو راجکمار کو چھوڑ کر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے اور مہندر ہردیو اپنے بستر پر۔ راج کمار کو اتنی گہری نیند آئی کہ دیر تک سوتا رہا۔ دن چڑھے بیدار ہوا تو خسرو کے نوکروں نے بتایا کہ خسرو دربار جا چکے ہیں کیونکہ وہاں کوئی جشن ہو رہا ہے۔

مہندر ہردیو کے رشتے دار ایک دوسری جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ راجکمار نے سوچا اب خسرو سے ملاقات مشکل ہے اس لیے اپنی قیام گاہ پر چلنا چاہیے۔

مہندر ہردیو اپنی قیام گاہ جاتے ہوئے اس بازار سے گزرا جہاں بخارا، ترکستان اور ایران کا سامان بکتا تھا۔ اس بازار میں کپڑے، پوستینیں، کمبل، قالین، ڈھالیں، تلواریں، خنجر اور تیر کمانوں کی دکانیں تھیں۔ مہندر ہردیو ایک ترک کی دکان پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں خنجر، تلواریں اور ڈھالیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس دکان کا ملازم ہندوستانی تھا۔

مہندر ہردیو نے ہندوستانی ملازم سے باتیں شروع کر دیں۔ ملازم نے پوچھا۔ ”تم کہاں سے آئے ہو اور کون ہو؟“
راجکمار نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ ”دولت اور ریاست آنی جانی چیزیں ہیں، یہ کسی ایک کے پاس نہیں رہتیں، اس لیے میں اپنی قسمت یا فاتح کی چیرہ دستیوں کی کوئی شکایت نہیں کرتا۔“
ملازم نے پوچھا۔ ”یہاں دہلی میں کیا کر رہے ہو؟“
راجکمار نے جواب دیا۔ ”ابھی تک میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا۔ خسرو سے میری دوستی ہو گئی ہے، میں خسرو کے توسط سے حضرت نظام الدین کی خدمت میں حاضری دینا چاہتا ہوں، آگے کا حال معلوم نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ جو قسمت میں ہے پیش آئے گا۔“

ملازم نے کراہیت سے منہ بنایا، بولا۔ ”تم کس کے پاس جاؤ گے؟ نظام الدین دکاندار کے پاس؟ ارے بھائی تم اس دنیادار بے دین سے ملو گے جو علانیہ گانا سنتا ہے۔ خسرو تو بے دین ہے ہی، اس کا پیر بھی اس سے کم نہیں۔“
راجکمار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، بولا۔ ”جناب! اس سے آگے نہ بڑھیں اور اپنی زبان قابو میں رکھیں۔ میں ان دونوں کے خلاف مزید نہیں سن سکتا۔“

ملازم نے سر سے پیر تک اسے حیرت سے دیکھا، بولا۔ ”لیکن تم نے تو مجھے ابھی یہ بتایا تھا کہ ہندو ہو۔ اگر تم ہندو ہو تو تمہیں ان بے دین مسلمانوں سے کیا دلچسپی؟“
مہندر ہردیو نے جواب دیا۔ ”جناب، میں نے دکن سے دہلی تک کا سفر محبوب الٰہی کے لیے کیا ہے، میں امیر خسرو اور محبوب الٰہی کی بابت ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں یہ دونوں کچھ بھی ہوں مگر ان میں مکر و فریب نہیں پایا جاتا۔“
ملازم نے جل کر کہا۔ ”چونکہ تم ہندو بت پرست ہوتے ہو اس لیے تمہیں یہ دونوں بت پرست اچھے لگے، اب میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔“
مہندر ہردیو نے جواب دیا۔ ”میں ایک کمزور نوجوان ہوں، مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں کیوں ٹھہرا۔“
ملازم ہنس کر بولا۔ ”تم ایک مسافر اور اجنبی ہو، ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ تم اس کے ذمی ہو اس لیے میں

تمہیں برائی سے روکنا چاہتا تھا۔'' مہندر نے پوچھا۔ ''یہ ذمی کیا ہوتا ہے؟''

دکاندار نے جواب دیا۔ ''جس کی حفاظت مسلمان حکومت کے ذمے ہوتی ہے، اسلامی شریعت میں اسے ذمّی کہتے ہیں۔''

مہندر نے خوش ہو کر کہا۔ ''شکریہ، تم نے ایک لفظ کا مطلب سمجھا کر مجھ پر احسان کیا ہے میں تمہیں اپنا استاد مانتا ہوں، میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں جس طرح تم نے مجھے ایک برائی سے روکنا چاہا ہے اسی طرح میری خواہش ہے کہ تم بھی ایک غلط فہمی سے پیدا ہونے والے گناہ سے بچ جاؤ۔ تم ایک بار محبوب الٰہی کی مجلس میں ضرور جاؤ اور پھر کوئی رائے قائم کرو۔''

دکاندار نے ہنس کر جواب دیا۔ ''اچھا، میں کل رات کو وہاں ضرور جاؤں گا۔''

مہندر نے کہا۔ ''میں تم کو وہیں ملوں گا۔''

دکاندار نے کہا۔ ''تب پھر تم ایک وعدہ کرو، وہاں تم اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے کیونکہ اس طرح میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خواجہ نظام الدین کو میرے خیالوں کی خبر ہوتی ہے یا نہیں۔''

مہندر نے کہا۔ ''تب پھر ایسا کرو کہ کل کے بجائے آج ہی چلو، میں دکان پر رکا جاتا ہوں، شام کو ہم دونوں ساتھ ہی چلیں گے اس طرح تم کو یقین رہے گا کہ میں نے اس ملاقات اور بات چیت کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا۔ میں مجلس میں کسی ایسی جگہ بیٹھوں گا جہاں حضرت کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔'' دکاندار راضی ہو گیا۔

شام کو ان دونوں نے ایک ساتھ محبوب الٰہی کی بارگاہ کا رخ کیا۔ دونوں خانقاہ میں داخل ہوئے، وہاں بڑی بھیڑ تھی۔ مہندر نے دکاندار کا ساتھ چھوڑ دیا اور سب سے پیچھے بیٹھ گیا۔ دکاندار گستاخانہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ محبوب الٰہی کے بالکل قریب چلا گیا اور السلام علیکم کہہ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ پوری مجلس اس گستاخی پر مشتعل ہو گئی، لوگوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔

آپ نے اس دکاندار کو خوش اخلاقی سے اور زیادہ قریب کر لیا۔ پوچھا۔ ''غالباً تم اسی شہر کے رہنے والے ہو؟''

دکاندار نے جواب دیا۔ ''ہاں میں اسی شہر کا ہوں۔ حدیث میں آیا ہے کہ یہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور ہر مسلمان اس دنیا میں مسافر ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو، تم نے مجھے حدیث یاد دلائی مجھ پر بڑا احسان کیا۔ میں بھی جب گانا سنتا ہوں تو رسول اللہ کی وہ حدیث یاد آجاتی ہے کہ ایک بار رسول مقبول ﷺ دو لڑکیوں کا دف پر گانا سن رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عمرؓ آگئے اور انہوں نے ان لڑکیوں کو گانے سے روکا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ عمر! ان لڑکیوں کو گانے بجانے سے مت روکو۔ ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور آج ان لڑکیوں کی عید کا دن ہے۔''

دکاندار نے گھبرا کر مہندر کو تلاش کیا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آرہا تھا۔

آپ نے مزید فرمایا۔ ''ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو یاد رکھے۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں اور قرآن پاک میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ماں باپ اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔ یہ دونوں خبریں قرآن پاک میں موجود ہیں مگر ایسا کوئی حکم قرآن پاک میں نہیں ہے کہ مسلمانوں کو کسی کے سامنے ایسا تعظیمی سجدہ نہیں کرنا چاہیے جیسا فرشتوں نے آدم کو، یعقوب علیہ السلام پیغمبر نے اپنے بیٹے کو کیا تھا۔ یوں بھی عبادت کے سجدے اور تعظیمی سجدے میں فرق ہوتا ہے۔ ادب اور تعظیم سے اطاعت پیدا ہوتی ہے۔ ہم درویشوں کے مسلک میں ادب اور تعظیم ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو۔ رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور جو تم میں صاحبِ امر ہوں، ان کی اطاعت کرو۔''

دکاندار آپ کی باتیں نہایت انہماک سے سنتا رہا۔ اس کے بعد ایک چیخ مار کر آپ کے قدموں میں گر گیا، روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت مجھے معاف کر دیجیے۔ میں بڑی گمراہی میں تھا۔''

آپ نے سید امام کو بلا کر حکم دیا۔ ''اس کو پانی پلاؤ، کھانا کھلاؤ کیونکہ یہ بہت پریشان نظر آتا ہے۔ اس کے لیے حلوا لاؤ کیونکہ اس نے ایک حدیث سنائی ہے۔''

اس کے بعد آپ نے پوچھا۔ ''میرا ہندو مہمان ہردیو کہاں ہے اس کو میرے پاس لاؤ۔''

مہندر نے آپ کی آواز سنی تو ادب سے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر دور ہی سے عرض کیا۔ ''حضرت! میں یہاں ہوں، حاضر ہوں۔''

آپ نے مہندر کی طرف اشکبار آنکھوں سے دیکھا۔ ”مہندر! ہم سب خدا کے ذمی ہیں، کوئی انسان کسی انسان کا ذمی نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی انسان کو حفاظت کی خدا جیسی قدرت حاصل نہیں ہے۔“

دکاندار نے پھر ایک چیخ ماری اور تڑپنے لگا۔

سید محمد امام کھانا، پانی اور حلوا لے آئے۔ آپ نے دکاندار کو اپنے ہاتھ سے ایک نوالہ کھلایا۔ اس کی طبیعت ٹھہر گئی۔ اس کے بعد دکاندار نے اپنے ہاتھ سے کھایا پیا، حلوا بھی کھایا اور ادب سے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھے بیعت کر لیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”سید محمد امام میرے پیر کا نواسا ہے تم اس سے بیعت کرو پھر میرے پاس آنا۔“ اس کے بعد سید امام سے کہا۔ ”تم اس کو اپنے گھر لے جاؤ اور تعلیم دو۔“ مہندر سے کہا۔ ”اور تم بھی ان دونوں کے ساتھ چلے جاؤ۔“

مہندر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور پھر یہ تینوں وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

رات کو خواجہ نظام الدین نے حکم دیا۔ ”خواجہ حسن سنجری، امیر خسرو، خواجہ سید محمد، خواجہ سید موسیٰ اپنی بہن کے پوتے سید محمد رفیع الدین ہارون اور دیوگڑھ کے مہندر ہردیو سنبھل دیو، چینیل دیوا اور ستین دیو کو نام بنام میرے پاس بلا لاؤ۔“

آپ کے حکم کی دیر تھی کہ یہ سارے آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے ان سے فرمایا۔ ”جانتے ہو میں نے تم لوگوں کو کیوں بلایا ہے؟“ پھر خود ہی وضاحت بھی کر دی۔ ”یہ بات کون نہیں جانتا کہ اب اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل جل کر رہنا ہے لیکن دونوں کے لیے زبان کا مسئلہ دشواری کا سبب بنا ہوا ہے۔ باہر کے مسلمان یہاں کی مقامی زبان نہیں سمجھتے اور مقامی لوگ مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھ پاتے لیکن میں نے اس کا حل سوچ لیا ہے۔“

امیر خسرو نے پوچھا۔ ”ارشاد، ہمارے لائق جو کام ہو، ہم اس کے لیے تیار ہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تم سب مل کر ایک ایسی زبان تیار کرو جو ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور باہر سے آئے ہوئے مسلمان آپس کی بات چیت اور لین دین میں کام میں لائیں۔“ اس کے بعد آپ نے امیر خسرو اور خواجہ سید محمد کی طرف دیکھ کر بطورِ خاص فرمایا۔ ”میں تم دونوں سے پہلے بھی یہ بات کہہ چکا ہوں۔“

خواجہ سید محمد نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں تو پہلے ہی سرگرم عمل ہوں۔“

امیر خسرو نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں نے اس مقصد کے پیشِ نظر بچوں کی تعلیم کے لیے ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھنا شروع کر دی ہے اور کتاب کا نام خالق باری تجویز کیا ہے۔“

اس کے بعد امیر خسرو نے خالق باری کے چند شعر بھی سنائے۔ آپ نے انہیں پسند فرمایا اور بولے۔ ”یہ بہت مفید چیز ہے مگر ہندی زبان میں بھی ایسے اشعار لکھو کہ لوگ انہیں یاد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔“

خواجہ نظام الدین نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مزید فرمایا۔ ”آج کل ہماری فارسی اور خسرو کی ترکی زبانوں کے ساتھ ہندوؤں کی بول چال کے بہت سے لفظ مل گئے ہیں اور اب لوگ اپنے گھروں اور مجلسوں میں بھی ہندی کے الفاظ بولنے لگے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو فارسی اور عربی اور ترکی میں ہندی کی آمیزش نہیں چاہتے ہیں اس لیے ان لوگوں کو سمجھانا چاہیے کہ ان کا اور ان کی حکومت کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے دل کی بات سمجھا سکیں اور خود ان کے دلوں کی حالت سمجھ سکیں اور یہ اس وقت ہوگا کہ وہ ضد کو چھوڑ دیں اور ہندی بول چال کا پرچار بڑھائیں۔“

آپ کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ امیر خسرو نے اس سمت میں خاص کام کیا۔ ان کی کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، بابل اور دوسرے علاقائی گیت اتنے عام ہوئے کہ وہ آج بھی عام ہیں اور ایک ایسی زبان وجود میں آ گئی جو آج اردو کہلاتی ہے اور ہندوستان میں ہندوستانی۔

جب اس موضوع پر گفتگو ختم ہو گئی تو کافی دیر بعد مہندر نے کہا۔ ”حضرت! میں مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”جب تو خدا کو ایک مان لے گا اور رسول ﷺ کی رسالت کو تسلیم کر لے گا تو، تو مسلمان ہو جائے گا۔“

مہندر نے عرض کیا۔ ”حضرت اگر مسلمان ہونا اتنا ہی آسان ہے تو مجھے اسی وقت مسلمان کر لیجیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”مسلمان کرنا اور چیز ہے اور مسلمان ہونا اور چیز۔“

مہندر نے پوچھا۔ ”ان دونوں میں کیا فرق ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”مسلمان کرنے کا لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا جبر، دباؤ، لالچ یا ذاتی غرض شامل ہے

اور مسلمان ہونا ان سب سے بے لوث ہے۔ اس کے لیے کسی ایجاب وقبول کی کوئی ضرورت نہیں ...... مثلاً آج اس وقت تو اس بات کا یقین کر لے کہ اللہ بس ایک ہی ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں تو اس یقین کے ساتھ ہی تو مسلمان ہو جائے گا۔''

مہندر گھبرا گیا۔ ''بیشک، مجھے پورا یقین ہے کہ خدا ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو بس تو مسلمان ہے۔''

مہندر نے کہا۔ ''مجھے بیعت بھی کر لیجیے۔''

فرمایا۔ ''ابھی اس کا وقت نہیں آیا اور نہ ہی ابھی اس کی ضرورت ہے کہ تو اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ تیرا نام بدلا جائے البتہ تو محمد امام سے وضو سیکھ لے اور وہی تجھے نماز بھی سکھا دیں گے۔''

اس بات کو کئی دن گزر چکے تھے۔ آخر ایک دن مہندر نے پھر وہی درخواست کی۔ ''حضرت! مجھے بیعت فرمالیں۔''

آپ نے اسے بیعت فرمالیا اور کلاہ چارتر کی مہندر کے سر پر رکھ دی۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد مہندر نے عرض کیا۔ ''حضرت! اب میں دیوگڑھ اپنے والدین کے پاس جانا چاہتا ہوں۔''

آپ نے جانے کی اجازت دی، فرمایا۔ ''تو جا سکتا ہے اور اگر تیرے ماں باپ اجازت دیں تو واپس آجانا اور اگر وہ تیرے ساتھ آنا چاہیں تو انہیں اپنے ساتھ دہلی لے آنا۔''

مہندر نے دیوگڑھ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

یکا یک خواجہ سید محمد کا خادم ملیح مہندر کے پاس پہنچا اور کہا۔ ''کوتوال علاء الملک کا ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

مہندر نے جواب دیا۔ ''میں یہاں اکیلا ہوں، اسے یہیں بلا لو۔''

جب کوتوال کا آدمی اندر داخل ہوا تو مہندر اس کی شکل دیکھتے ہی سہم گیا۔ وہ مسلح تھا، لمبی ڈاڑھی اور خونخوار صورت۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی خونخوار نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا پھر مہندر کو گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے مہندر سے پوچھا۔ ''کیا ہردیو مہندر تیرا ہی نام ہے؟''

مہندر نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہردیو مہندر میرا ہی نام ہے آپ کون ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں کوتوال کا آدمی ہوں۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا تو اجمیر، ہانسی، ملتان، لاہور اور بدایوں بھی گیا تھا؟''

مہندر ہردیو نے کہا۔ ''ہاں، میں نے ان مقامات کی سیاحت کی ہے مگر کیوں؟ کیا سیاحت کرنا جرم ہے؟''

اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''سیاحت جرم نہیں ہے البتہ سلطان کے خلاف بکواس کرنا جرم ہے۔'' پھر کہا۔ ''میں کوتوال کا حکم لے کر آیا ہوں اور اس وقت تجھے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

مہندر ہردیو کا برا حال تھا، اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ بمشکل جواب دیا۔ ''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں نے سلطان کے خلاف کہیں بھی کوئی بات کی ہے لیکن انسان بات چیت کے وقت بے اختیار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے میری زبان سے کوئی ایسی بات نکلی ہو جس میں سلطان کا ذکر ہو۔''

اتنے میں خواجہ سید محمد، خواجہ سید موسیٰ اور مولانا احمد نیشاپوری بھی آگئے۔ انہوں نے حالات کی نزاکت کا جائزہ لیا اور مہندر کی پریشانی کو محسوس کر لیا۔ کوتوال کا نمائندہ ترک تھا۔ مولانا نیشاپوری نے اس سے ترکی میں باتیں شروع کر دیں۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ ہمارا مہمان ہے اور حکومت کا ذمی ہے اس کے علاوہ یہ حضرت کا مرید بھی ہے اور دیوگڑھ حکومت کے شاہی خاندان کا فرد ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر تمہیں میری رائے درکار ہو تو میں یہ کہوں گا کہ تم کوتوال کے پاس واپس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ خود آکر سلطان المشائخ سے بات کر لے۔''

کوتوال کا آدمی بالکل اجڈ تھا۔ اس نے نہایت کرخت لہجے میں کہا۔ ''یہ باغی ہے اس نے کئی شہروں میں ہندوؤں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے کہا کہ میرے راجہ، رام دیو کو علاء الدین نے لوٹا تھا۔ ہندوؤں کو علاء الدین سے انتقام لینا چاہیے۔ ایسے سنگین جرم کی سزا موت ہے۔''

اسی وقت خواجہ نظام الدین کا خادم خاص خواجہ اقبال اندر داخل ہوا۔ اس نے کوتوال کے آدمی سے کہا۔ ''حضرت نے فرمایا ہے کہ ہم ہردیو کو نہیں جانے دیں گے، اپنے کوتوال کو ہمارے پاس بھیج دو تا کہ اس سے ہردیو کا جرم معلوم کیا جائے۔''

کوتوال کے آدمی نے جواب دیا۔ ''مگر یہ تو بتا کہ تیرے حضرت کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی کہ میں ہردیو کو گرفتار کرنے آیا ہوں؟''

خواجہ اقبال نے جواب دیا۔ ''حضرت روشن ضمیر ہیں۔''
کوتوال کے آدمی نے برا سا منہ بنایا۔ ''میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ وہ کوتوال کے پیر ہوں یا وزیر کے پیر ہوں، مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ میں تو شاہی مجرم کو لینے آیا ہوں۔ میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اگر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں مجرم اور اس کے حمایتیوں کے سر لے جاؤں گا۔''
خواجہ سید محمد نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ''کس کی مجال ہے کہ ہمارے مہمان کو ہمارے حضرت کی اجازت کے بغیر یہاں سے لے جائے۔''
کوتوال کے آدمی نے تلوار کھینچ لی۔ سید محمد نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تلوار چھین لی۔ مولانا نیشاپوری نے سید محمد کی مدد کی۔ کوتوال کے آدمی کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ گالیاں بکنے لگا۔ دونوں مرید بھائیوں نے اسے بے بس کر کے بٹھادیا۔
اسی وقت علاء الملک کوتوال اپنے دس بارہ ہتھیار بند آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے خواجہ سید محمد کو ادب سے سلام کیا۔ اس کی نظر جونہی اپنے نائب پر پڑی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پوچھا۔ ''یہ کیا قصہ ہے؟''
سید محمد نے سب کچھ تفصیل سے بتادیا۔ کوتوال نے اپنے نائب سے کہا۔ ''تم نے میرے پیر کی شان میں گستاخی کی، بہت برا کیا۔ میں نے پہلے بھی تمہاری شکایتیں سنی ہیں۔ تم کوتوالی واپس جاؤ، اگر آئندہ تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو تم نوکری سے الگ کردیے جاؤ گے۔''
کوتوال کے آدمی اس کو لے کر چلے گئے، اب کوتوال ہردیو سے مخاطب ہوا۔ ''تو نے ملتان، لاہور اور اجمیر میں فلاں فلاں ہندوؤں سے سلطان کے خلاف باتیں کیں یا نہیں؟''
ہردیو نے جواب دیا۔ ''میں نے ملتان کے سوا کسی شہر میں کسی ہندو سے ملاقات نہیں کی اور چونکہ وہ میرے ہم وطن تھے۔ انہوں نے مجھ سے سلطان کے اس حملے کا ذکر کیا جو سلطان نے بادشاہ ہونے سے پہلے دیوگڑھ پر کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ حکومتوں میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کیا ہمارے ہندو راجا دوسرے ہندو راجاؤں کے ساتھ ایسا نہیں کرتے؟''
کوتوال نے کہا۔ ''تو سچا معلوم ہوتا ہے، ملتان کے وہ ہندو گرفتار کیے جاچکے ہیں جنہوں نے تجھ سے باتیں کی تھیں، وہ سب دہلی لائے جاچکے ہیں تم مجھے ہر بات سچ سچ بتادو۔ میں تمہیں بچالوں گا کیونکہ تم میرے پیر بھائی بھی ہو۔''
ہردیو نے جواب دیا۔ ''میں نے سچ بات ہی کہی ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔''
کوتوال ہردیو کو خواجہ نظام الدین کے پاس لے گیا بولا۔ ''حضرت......''
آپ نے فرمایا۔ ''علاء الملک کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے آدمیوں کو ستانا اچھی بات نہیں ہے۔ ہردیو پاک دل اور پاک عمل ہے۔''
کوتوال نے عرض کیا۔ ''آپ نے جو کچھ فرمایا ہے میں سلطان سے عرض کردوں گا لیکن سلطان ہردیو کو دیکھنا بھی چاہتا ہے اس لیے میں اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''لے جاؤ ہردیو کو، سلطان اس کو دیکھ لے ہم سلطان کو دیکھ لیں گے۔''
آپ کے تند و تیز لہجے نے کوتوال پر کپکپی طاری کردی۔ وہ ہردیو کے ساتھ الٹے قدموں چل کر باہر نکلا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ ہردیو کو بھی ایک گھوڑا پیش کردیا گیا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔
شاہی محل کے قریب کوتوال نے گھوڑے سے اتر کر ہردیو کو بھی اتارا، اپنے آدمی سے تلوار لے کر ہردیو کے گلے میں ڈالی، ہردیو کی پگڑی بھی اس کے گلے میں ڈال دی۔ اس حال میں وہ ہردیو کو لے کر بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔
اس وقت بادشاہ ایک چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوتوال نے ہردیو سے کہا۔ ''تو یہاں بھی سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔ سب کچھ سچ سچ بتادے گا۔''
ہردیو نے جواب دیا۔ ''میں نے عرض جو کیا، میں بے گناہ ہوں۔''
کوتوال نے سب کچھ سلطان کے گوش گزار کردیا۔
علاء الدین کچھ دیر تو خاموش رہا، پھر ترکی زبان میں کوتوال سے کہا۔ ''اس کا چہرہ بھی اس کے دل ہی جیسا ہے۔ میں حضرت نظام المشائخ کی اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ یہ شخص پاک دل اور پاک اعمال ہے۔''

اس کے بعد سلطان نے ہردیو کے لیے ایک خلعت طلب کی اور اس کے لیے ملازمت کا اعلان کر دیا۔ کہا۔ ''اس کو ملازم رکھ لیا جائے کیونکہ حضرت نظام الدین نے اس کو بے گناہ کہہ دیا ہے۔'' پھر کہا۔ ''ہاں، میں دیوگڑھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

کوتوال نے عرض کیا۔ ''مجھے حضرت نے بتایا ہے کہ ہردیو اپنے والدین سے ملنے کے لیے دیوگڑھ جانا چاہتا ہے۔''

سلطان نے کہا۔ ''یہ اپنے ماں باپ کو دہلی بلوا لے۔'' پھر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''ملتان کے ہندوؤں کو بدایوں دروازے پر ہاتھیوں کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔''

بادشاہ نے یہ فیصلہ ترکی زبان میں سنایا تھا۔ کوتوال نے ہردیو کو فارسی میں سمجھایا۔ ''اب جب کہ تو رہا ہو چکا ہے، ادب سے بادشاہ کے روبرو جھک جا۔''

پھر خلعت بھی آ گئی، وہ جسم پر موجود لباس ہی پر پہنا دی گئی۔ ہردیو نے ادب سے جھک کر بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔

بادشاہ نے اپنے وزیر خطیر الدین کو حکم دیا۔ ''ہردیو کے مناسب حال کوئی اچھی سی نوکری دی جائے۔''

کچھ دیر بعد کوتوال ہردیو کے ساتھ باہر آ گیا مگر کوتوال نے ہردیو کو کھڑا کر کے دوبارہ دربار کا رخ کیا۔ جب واپس آیا تو ہردیو نے اس سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟ دوبارہ دربار میں جانے کا مطلب؟''

کوتوال نے جواب دیا۔ ''میں اپنے نائب کی بابت سلطان کا فیصلہ سننا چاہتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ میرے نائب کو بھی ہندوؤں کے ساتھ ہی بدایوں دروازے کے سامنے ہاتھیوں کے آگے ڈال دیا جائے۔''

کوتوال ہردیو کو لے کر خواجہ نظام الدین کی خدمت میں پہنچا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

آپ کچھ پریشان ہو گئے، فرمایا۔ ''علاء الملک! تو سلطان کے پاس واپس جا اور میری طرف سے سلطان کو بتا دے کہ سلطان کی حفاظت خود خدا کرے گا، سلطان ہر شر سے محفوظ رہے گا۔ رہ گیا انتقام، تو خدا خود منتقم حقیقی ہے وہ خود بدلہ لے لے گا۔ وہ ہندوؤں کو ہلاک نہ کرے، بس دہلی سے جلاوطن کر دے اور ہندوؤں کے ساتھ تیرے نائب کو بھی معاف کر دیا جائے۔''

کوتوال نے عرض کیا۔ ''میں حضور کا ارشاد بادشاہ تک اسی وقت پہنچا دوں گا۔ بادشاہ جو جواب دے گا حضور تک پہنچا دوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں جواب نہیں چاہتا، تم سے جو کچھ کہا گیا ہے ویسا ہی ہوگا، میں عمل چاہتا ہوں۔''

کوتوال چلا گیا تو آپ نے ہردیو سے کہا۔ ''بادشاہ کی مرضی ہے کہ تم دہلی میں رہو، یہ بادشاہ کے لیے بھی ٹھیک ہے اور تمہارے لیے بھی۔ جاؤ سید محمد کے پاس رہو۔''

ہردیو نے عرض کیا۔ ''بادشاہ نے مجھے لباس بھی دیا ہے اور اشرفیاں بھی، ان کی بابت آپ کا کیا حکم ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جو جس کا حصہ ہے اس کے پاس رہنا چاہیے۔ اشرفیاں اپنے والدین کو بھیج دو تاکہ وہ دہلی آ جائیں۔''

بادشاہ نے خواجہ نظام الدین کی بات مان لی اور سب کو معاف کر دیا۔

ہردیو کو کوئی ملازمت نہیں مل سکی۔

بادشاہ اپنے سپہ سالار ملک کافور سے بڑی محبت کرتا تھا۔ ملک کافور مذہباً ہندو تھا۔ اس نے سلطان کی صحبت میں رہ کر پورے ملک پر ہندو حکومت کا خواب دیکھا تھا۔ ملک کافور نے سلطان کو زہر دے کر ہلاک کر دیا اور سلطان کے سات سالہ بیٹے شہاب الدین کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ملک کافور اس بچے کی آڑ میں پورے ملک پر خود حکومت کرنا چاہتا تھا لیکن وہ زیادہ دن حکومت نہیں کر سکا۔ علاء الدین خلجی کے بڑے بیٹے قطب الدین خلجی نے ملک کافور کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

ملک میں یہ سارے ہنگامے برپا تھے اور آپ ایک گوشے میں بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

(جاری ہے)

ماخذات

سیر الاولیاء، امیر خورد۔ سیر العارفین، حامد بن فضل اللہ جمالی۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث فوائد الفواد، امیر حسن سنجری۔ گلزار ابرار، محمد غوث مانڈوی۔ خیر المجالس، ملفوظات چراغ دہلی

قطب الدین خلجی بلا کا عیاش تھا۔ وہ ایک گجراتی ہندو خسرو خان پر عاشق تھا۔
قطب الدین نے ایک مہم دکن روانہ کی اور اس کا سپہ سالار خسرو خان کو بنا دیا گیا۔ مسلمان امراء کو بادشاہ کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ علاؤ الدین خلجی کے دو بیٹے خضر خان اور شادی خان خواجہ نظام الدین کے مرید تھے۔ قطب الدین کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ اس کو خواجہ نظام الدین سے بغضِ للّٰہی ہو گیا تھا۔

محبوب الٰہی

ضیا تسنیم بلگرامی

دوسرا اور آخری حصّہ

ولیوں کا پیدا ہونے کے لیے گھرانوں کا انتخاب... اور پھر ان کی تربیت اور پرورش کے لیے انسانوں کاانتخاب ...اس کے بعد حالات اور تعلیم کا سلسلہ... اگر غور کیا جائے تو یہ تمام مراحل عام انسانوں سے کس قدر مختلف اور دشوار ہوتے ہیں۔ گویا اللّٰہ کے خاص بندوں میں شمار ہونے کے لیے آزمائشیں اور کٹھن مرحلے پہلے سے کاتبِ تقدیر لکھ دیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کون اس کے امتحان پر پورا اترتا ہے وہی اس کا برگزیدہ بندہ کہلائے گا... خواجہ نظام الدین سے کون واقف نہیں... کیا شان ہے آپ کی... تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو کئی نامور اولیا سے ہوتے ہوئے بابا فرید شکر گنج کی خدمت میں پہنچے جنہوں نے عنایات کی بارش کے بعد کہا۔ ”بابا نظام الدین! ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت دی اور خلافت عطا کی۔“ اور پھر حضرت بختیار کاکی کی دستار اور اپنا عصا بھی عطا فرمایا۔ اللّٰہ کے مقبول بندوں کی یہی تو نشانیاں ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیا کی زندگی کے نشیب و فراز



قطب الدین کے درباری بھی حضرت نظام الدین سے جلتے تھے۔ وہ بھی بادشاہ کو بھڑکایا کرتے تھے۔ آپ اپنے مریدوں میں پندونصائح کی بات کررہے تھے کہ نئے سلطان کا ایک آدمی اندر داخل ہوا۔

آپ نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں آئے ہو؟''

سلطان کے آدمی نے جواب دیا۔ ''نئے بادشاہ نے حضور کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ آپ دہلی سے کہیں اور چلے جائیں کیونکہ اس شہر میں آپ کی رہائش حکومت کے لیے خطرناک ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جا اپنے سلطان سے کہہ دے کہ میں ایک گوشے میں پڑا ہوں۔ تیرا کچھ بگاڑتا نہیں! تیرے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتا۔ میری طرف سے تجھ کو مطمئن رہنا چاہیے۔''

لیکن نئے بادشاہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے دربار میں آپ کے خلاف گستاخانہ باتیں شروع کردیں۔ جب آپ کو یہ باتیں بتائی جاتیں تو فرماتے۔ ''وہ میرے خلاف باتیں ہی تو کرتا ہے، مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچاتا اور پھر یہ کہ منتقم حقیقی اللہ ہے اگر بادشاہ تجاوز کرے گا تو وہ خدا کی پکڑ سے کس طرح بچے گا۔''

کئی دن بعد پتا چلا کہ بادشاہ کا پیشاب بند ہو چکا ہے اطبا عاجز و پریشان ہیں کیونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بادشاہ کو وہ کون سی بیماری لاحق ہو چکی ہے جس کا ان کے پاس کوئی علاج نہیں۔

آپ نے فرمایا۔ ''مرض کے لیے دوا نہیں، دعا درکار ہے اور یہ چیز اس کے پاس ہے نہیں۔''

بادشاہ تین دن تک علاج کرواتا رہا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بادشاہ کی ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے! میں تجھ سے ایک اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

ماں نے کہا۔ ''تو نے نظام المشائخ کو اکثر برا بھلا کہا ہے۔ یہ تو اسی کی سزا بھگت رہا ہے، ان کے پاس جا اور دعا کا طالب ہو۔ ان سے معافی مانگ۔''

بادشاہ نے ناگواری سے کہا۔ ''میں فقیروں کو نہیں مانتا۔ ان دکاندار لوگوں کی دعا سے میرے مرض کا کیا تعلق؟''

اس کے باوجود ماں آپ کے پاس پہنچی اور رو رو کر عرض کی۔ ''حضرت! بادشاہ نادان ہے، نوجوان ہے اور آپ سن رسیدہ بزرگ ہیں۔ خدا کے لیے اس کی شوخیوں کو نظر انداز کردیجیے اور اس کی خطا معاف کردیجیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس کی خطا اس وقت معاف کروں گا جب باعثِ خطا شے بادشاہ کے پاس نہیں رہے گی۔''

ماں نے پوچھا۔ ''میں حضرت کا مطلب نہیں سمجھی؟''

آپ نے فرمایا۔ ''بادشاہ کو خطرہ ہے کہ میں اس کی بادشاہی کے خلاف بغاوت کرادوں گا، اس لیے وہ بدگمانی کی خطا کا مرتکب ہو رہا ہے۔ میں بادشاہ کے لیے دعا کروں گا مگر اس وقت جب وہ اپنی بادشاہی مجھے دے دے گا۔''

ماں دم بخود رہ گئی۔ چند دنوں میں بادشاہ کا حال بالکل ابتر ہو گیا اور اس نے تھک ہار کر خود ہی اپنی ماں سے کہا۔ ''ماں! میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں کہ دوا کا وقت گزر گیا۔ دعا کا آ گیا۔ آپ نظام المشائخ کے پاس تشریف لے جائیں اور ان سے میرے حق میں دعا کرائیں۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹے! میں ان کے پاس گئی تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ میں دعا کردوں گا لیکن اس وقت جب بادشاہ باعثِ خطا شے ان کے حوالے کردے گا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''ماں! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''مطلب صاف ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ تو اپنی حکومت ان کے نام لکھ دے، وہ تیرے حق میں دعا کردیں گے۔''

بادشاہ اپنی جان سے عاجز آیا ہوا تھا، بولا۔ ''ماں! آپ حضرت کے پاس جائیے اور ان سے کہیے کہ میں اپنی بادشاہی آپ کے نام کردوں گا، آپ میرے مرض کو دور فرما دیجیے۔''

ماں آپ کی خدمت میں دوبارہ پہنچی اور عرض کیا۔ ''حضرت! میرا بیٹا اپنی بادشاہی آپ کو دینے کو تیار ہے، آپ دعا فرما دیجیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں بادشاہ کی بات پر اعتبار نہیں کرسکتا...... وہ اپنی بادشاہی لکھ کر دے دے، اس کے بعد میں دعا کروں گا۔''

ماں نے پوچھا۔ ''حضرت! وہ کس طرح؟''

آپ نے فرمایا۔ ''بادشاہ اپنی بادشاہی دینے کا ایک فرمان لکھے اور اس فرمان پر اپنی مہر لگائے۔ سب امیروں وزیروں کی تصدیق کرائے اور یہ فرمان میرے حوالے کردے، تب میں اس کے حق میں دعا کروں گا۔''

بادشاہ کی ماں جز بز ہوگئی، عرض کی۔ ''لیکن حضور تو تارک الدنیا ہیں، آپ کو بادشاہی کی کیا ضرورت پیش آگئی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں دنیا کا تارک بھی ہوں اور جو لوگ دنیا کا غلط استعمال کرتے ہیں، ان سے ان کی غلطیوں کا ترک کرانے والا بھی ہوں۔ جاؤ خاتون، محل واپس جاؤ۔ جب تک میری یہ شرط پوری نہیں ہوگی، میں دعا نہیں کروں گا۔''

ماں بادشاہ کے پاس واپس گئی اور سب کچھ صاف صاف بیان کردیا۔ بادشاہ نے اسی وقت امراء و وزراء کو طلب کیا۔ وہ جانکنی میں مبتلا تھا۔ اس نے فرمان تیار کرایا اور ماں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''ماں! آپ فوراً ان کے پاس جائیے اور میرے حق میں دعا کرا دیجیے۔''

ماں یہ فرمان لے کر آپ کی خدمت میں پہنچی۔ فرمان آپ کے حوالے کردیا، بولی۔ ''حضرت! یہ فرمان حاضر ہے آپ خدا کے لیے جلد از جلد دعا فرما دیجیے۔''

آپ فرمان پڑھ کر مسکرائے، فرمایا۔ ''خاتون! تم یہ فرمان واپس لے جاؤ۔ بادشاہ سے کہنا، میں نے تیری بادشاہی تیرے ہی پیشاب کی دھار پر ماردی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں۔ بادشاہ سے کہنا وہ اس فرمان کو اپنے امیروں اور وزیرون کے سامنے چاک کردے، فوراً پیشاب آجائے گا۔''

ماں نے یہ فرمان بادشاہ کے حوالے کیا اور کہا۔ ''نظام المشائخ نے فرمایا ہے کہ اسے اپنے امیروں اور وزیروں کے سامنے چاک کردے، فوراً پیشاب آجائے گا۔''

یہ بات بادشاہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ طوعاً و کرہاً اس نے اپنے امراء اور وزراء کو طلب کیا اور ان کے سامنے ہی اپنے فرمان کو چاک کردیا۔ فرمان کے چاک ہوتے ہی بادشاہ کا پیشاب جاری ہوگیا۔ مسرت اور شادمانی سے بادشاہ کا حال غیر ہوگیا۔ ماں بھی بے حد خوش تھی، بولی۔ ''بیٹے! سلطان المشائخ کا مرتبہ اب تو معلوم ہوگیا۔ ان کے پاس جا اور معافی مانگ۔ وہ بادشاہی سے بے نیاز ہیں۔ تیری بادشاہی کو تیرے ہی پیشاب کی دھار پر ماردیا۔ ان کی خدمت میں حاضری دے اور اپنی پچھلی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ۔''

بادشاہ ماں کی باتیں سن کر ہنسنے لگا، بولا۔ ''ماں! آپ کتنی سادہ لوح ہیں، آپ بادشاہی کی باتیں نہیں سمجھ سکتیں۔ جس شخص نے مجھ سے یہ فرمان لکھوایا تھا، میں اس شخص کو خوب جانتا ہوں۔ وہ پکا دکاندار ہے۔ میں نے اپنی بادشاہی حکمت سے ایسا فرمان لکھوایا تھا کہ وہ اس کے کام نہیں آسکتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے پیشاب آگیا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں ان کی دعا کا کچھ دخل نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ دواؤں کی تاثیر سے ہوا ہے۔''

ماں نے بڑی افسردگی سے کہا۔ ''بیٹا خلجی خاندان کی بس تو ایک ہی نشانی ہے۔ اپنے سب بھائیوں کو تو نے ہلاک کردیا۔ تیرا باپ نظام المشائخ کا کتنا معتقد تھا۔ تیرے بھائی بھی ان کے مرید تھے۔ تیری فوج کے امراء اور وزراء بھی آپ کے بے حد عقیدت مند ہیں۔ تیری ان کی شان میں گستاخیاں تجھے تنہا چھوڑ دیں گی اور وہ سب تیرے دشمن ہوجائیں گے۔''

بادشاہ نے اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ ''ماں! مجھے اپنی تلوار پر بھروسا ہے اور ساتھ ہی اپنی قوتِ بازو پر بھی...... میں نے اپنی بادشاہی کا راستہ اس تلوار سے صاف کیا ہے۔ اب یہ ایک کانٹا باقی رہ گیا ہے، اس کو بھی میری تلوار بہت جلد صاف کردے گی۔''

ماں اپنے بیٹے کی نادانی پر افسوس کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ بادشاہ نے اپنے مشیروں سے پوچھا۔ ''اس خطرناک درویش کا کیا انتظام کیا جائے؟''

کسی نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! نظام الدین چشتیہ سلسلے کے بزرگ ہیں اور ملتان کے مشائخ سہروردیہ ہیں۔ آپ شیخ بہاؤالدین زکریا کے پوتے شیخ رکن الدین کو دہلی بلوائیں اور اپنے امراء اور دوسرے معززین کو مجبور کریں کہ وہ سب شیخ رکن الدین کی بہت زیادہ عزت کریں پھر جب......

بادشاہ سب کچھ سمجھ گیا۔ خوشی میں بولا۔ ''میں سب کچھ سمجھ گیا۔ آپ لوگ ان دونوں خاندانوں کے حسد و رقابت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔''

مشیر نے کہا۔ ''بیشک، بالکل بجا ہے۔''

بادشاہ نے اسی دن شیخ رکن الدین کے نام ایک شاہی دعوت نامہ ملتان روانہ کر دیا۔ اس دعوت نامے پر شیخ رکن الدین ملتان سے روانہ ہو گئے۔ جب یہ دہلی کے قریب پہنچے تو بادشاہ کے حکم کے بموجب وزراء، امراء، مشائخ اور علما شیخ کے استقبال کے لیے شہر کے باہر پہنچ گئے۔ خود بادشاہ دوسرے دن صبح شہر کے باہر پہنچا۔ بیرونِ شہر ایک عارضی بستی قائم ہو گئی تھی۔ بادشاہ کی نظریں ملتان سے آنے والی راہ پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد چند گھوڑے آتے دکھائی دیے۔ جب یہ قریب آئے تو ان میں ایک بزرگ کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ یہ شیخ رکن الدین خود تھے۔ بادشاہ اپنے گھوڑے سے اتر کر پاپیادہ شیخ کی طرف بڑھا اور ان کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ شیخ نے گھوڑے سے اترنا چاہا مگر بادشاہ نے گھوڑے کی رکاب تھام کر عاجزی سے سوال کیا۔ ''حضور کو میرے سر کی قسم، آپ اسی طرح گھوڑے پر رہیں اور یہ فرمائیں کہ اس شہر دہلی میں سب سے پہلے آپ سے کون ملا؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''اس شہر کا سب سے اچھا آدمی۔''

بادشاہ نے درخواست کی۔ ''آپ براہِ کرم اس شخص کا نام بہ آوازِ بلند فرما دیجیے۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''کیا اس سب سے اچھے آدمی کا نام لینا بہت ضروری ہے؟''

بادشاہ کا خیال تھا کہ سب سے پہلے وہی بادشاہ سے ملا ہے، بولا۔ ''حضرت! میں اس کا نام حاضرین کے علم میں اس لیے لانا چاہتا ہوں کہ یہ سب بھی اس کا احترام کریں اور اس کے حکم کی تعمیل اپنے حق میں موجبِ رحمت و سعادت گردانیں۔''

شیخ نے بلند آواز سے فرمایا۔ ''لوگو! اس شہر میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہے اور اس کو سارا ہندوستان شیخ المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے نام سے یاد کرتا ہے۔''

ہجوم میں اظہارِ ادب اور خوشنودی سے ہلکا سا شور بلند ہوا۔ بادشاہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ ''شیخ! آپ کیسی متضاد بات کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے یہ فرمایا تھا کہ سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو سب سے پہلے آپ سے ملا ہے اور اب آپ یہ فرما رہے ہیں کہ سب سے اچھا وہ آدمی ہے جو یہاں موجود نہیں ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''بادشاہ! تو نہیں جانتا کہ سلطان المشائخ دہلی سے ایک منزل دور میرے استقبال کو پہنچ چکے تھے۔ مجھ سے سب سے پہلے وہی ملے تھے اور میرا اشارہ انہی کی طرف تھا کہ دہلی کے سب سے اچھے آدمی وہی ہیں۔''

بادشاہ شیخ سے بھی ناراض ہو گیا اور واپس جا کر شیخ ضیاالدین رومی نامی درویش کا مرید ہو گیا۔ پھر یہ چرچا ہونے لگا کہ بادشاہ حضرت سلطان المشائخ کے خلاف ہر روز صلاح مشورے کرتا رہتا ہے۔ بادشاہ چاہتا ہے کہ آپ کو دہلی سے جلاوطن کر دیا جائے۔

شام کو مغرب کے بعد سلطان المشائخ کی خانقاہ میں مجلس جمی۔ اس مجلس میں بہت زیادہ لوگ تھے۔ اس دوران ایک نیا شخص مجلس میں داخل ہوا اور کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''شیخ نظام الدین بدایونی کس کا نام ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

خواجہ سید محمد امام کھڑے ہو گئے اور پوچھا۔ ''ان سے تجھے کیا کام ہے؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''میں سلطان کی طرف سے شیخ نظام الدین بدایونی کے نام ایک فرمان لایا ہوں۔''

خواجہ سید محمد امام نے فرمایا۔ ''جو خط تو لایا ہے، مجھے دے دے تاکہ میں اسے حضرت کی خدمت میں پیش کر دوں۔''

سلطانی قاصد نے شاہی خط خواجہ سید امام کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے یہ خط پہلے خود پڑھا، اس کے بعد سلطان المشائخ نے حکم دیا۔ ''سلطان کے خط کو بہ آوازِ بلند پڑھ کر سنایا جائے۔''

''سلطان کو معلوم ہوا ہے کہ شیخ نظام الدین بدایونی کے اصطبل میں گھوڑے سونے کی میخوں سے باندھے جاتے ہیں حالانکہ وہ تارک الدنیا ہونے کے دعوے دار ہیں، لہٰذا یا تو وہ اس کا معقول جواب دیں ورنہ اس دنیاوی کروفر کو لے کر دہلی سے کہیں اور چلے جائیں۔''

خواجہ نظام الدین نے منشی مہر دیو سے فرمایا۔ ''قلم دوات لاؤ۔''

جب قلم دوات حاضر کر دیے گئے تو آپ نے سید محمد امام سے فرمایا۔ اس خط کی پیشانی پہ لکھ دو۔

کجا . اندا ختم در دل
مگر اندا ختم در گل

(میں نے اپنے دل میں سونے کی میخ نہیں گاڑی بلکہ مٹی میں گاڑی ہے)

سلطان کا خط قاصد کو واپس دے دیا گیا، آپ نے فرمایا۔ ''میں نے جواب خط کی پیشانی پر لکھوا دیا ہے، لے جا اور بادشاہ کو

دے دے۔"

جب سلطانی قاصد خط لے کر چلا گیا تو آپ نے تین بار آہستہ آہستہ فرمایا۔ "ہنوز دلی دور است"... "مگر اندا ختم درگل، مگر اندا ختم درگل، مگر انداختم درگل۔" (بلکہ مٹی میں گاڑی ہے بلکہ مٹی میں گاڑی ہے بلکہ مٹی میں گاڑی ہے)

صبح ہوتے ہوئے یہ خبر عام ہوگئی کہ بادشاہ کے پیرومرشد شیخ ضیاالدین رومی کا اچانک انتقال ہوگیا۔

تیسرے دن مرحوم شیخ کی خانقاہ میں سوئم کی نیاز میں حضرت نظام الدین بھی اپنے حلقہ بگوشوں کے ساتھ شریک ہوگئے۔ وہاں پہلے ہی سے بہت سے لوگ موجود تھے۔ سلطان قطب الدین بھی قرآن پاک کی تلاوت کررہا تھا۔ سلطان المشائخ جیسے ہی خانقاہ میں داخل ہوئے، ایک ہلچل سی مچ گئی اور سلطان کے رعب ودبدبے کو بالائے طاق رکھ کر لوگ آپ کے آس پاس پہنچ گئے۔

سلطان نے آپ کو کن انکھیوں سے دیکھ کر اپنے ایک امیر کے کان میں کچھ کہا۔ وہ امیر آپ کی خدمت میں پہنچ کر گویا ہوا۔ "حضرت! سلطان قطب الدین خلجی اس مجلس میں موجود ہیں اگر آپ سلطان کو سلام کرنا چاہیں تو میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں۔"

سلطان المشائخ نے جواب دیا۔ "اس وقت میں تلاوت کلام پاک میں مشغول ہوں، اس حالت میں کسی شخص سے بھی ملاقات کرنا جائز نہیں۔"

قرآن خوانی کے بعد مرحوم شیخ کی نیاز ہوئی اور سلطان آپ کو کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا خانقاہ سے چلا گیا۔ اس کے بعد آپ بھی چلے گئے۔

اس واقعے کے کئی دن بعد چند امراء نے سلطان کی طرف سے آپ کی مجلس میں حاضری دی اور کہا۔ "حضرت! سلطان نے فرمایا ہے کہ چاندرات کو دہلی کے مشائخ مجھے سلام کرنے اور نئے چاند کی دعا دینے دربار میں آتے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ آپ ایک بار بھی نہیں آئے۔ آپ کا یہ طرز عمل بادشاہ کی توہین کا موجب ہے لہٰذا آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس چاندرات کو حضرت بھی نئے چاند کا سلام کرنے اور دعا دینے کے لیے دربار میں آئیں۔"

آپ نے نہایت پُروقار لہجے میں جواب دیا۔ "بادشاہ سے کہہ دینا کہ اس سے پہلے نہ تو میرے کسی بزرگ نے دربار میں حاضری دی ہے اور نہ میں نے ایسا کیا، اس لیے میں اس حکم کی تعمیل سے انکار کرتا ہوں۔"

اسی شام کو چاندرات تھی، آپ کا خادم خاص خواجہ اقبال پالکی لے کر حاضر ہوگیا اور آپ سے کہا۔ "حضرت! پالکی حاضر ہے۔"

سلطان المشائخ نے پوچھا۔ "کیوں؟ کس لیے؟"

خواجہ اقبال نے جواب دیا۔ "حضور! ہم سب پر رحم فرمائیں، آپ کو نہیں معلوم بادشاہ نے حکم دیا ہے اگر خواجہ نظام الدین خوشی سے نہ آئیں تو انہیں تلوار کے زور سے لایا جائے۔ حالانکہ خانقاہ کے باہر آپ کے سیکڑوں جاں نثار مسلح ہوکر جمع ہوگئے ہیں اور وہ آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ اگر سلطان کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی ہوئی تو وہ سب آپ پر اپنی جانیں قربان کردیں گے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اقبال! یہ آج تو کیسی باتیں کررہا ہے۔ باہر جو لوگ جمع ہوگئے ہیں، ان سے کہہ دو کہ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں کیونکہ میرا بچانے والا ہر وقت میرے ساتھ ہے۔"

مہندر ہردیو ہاتھ جوڑ کر آپ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ بولا۔ "حضرت! شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ اصل فتنہ وہ گجراتی ہندو ہے جو بظاہر مسلمان ہوکر خسرو خان بن گیا ہے۔ سلطان اس ہندوزادے پر عاشق ہے اور یہ ساری شرارتیں خسرو خان کی طرف سے ہی سرزد ہورہی ہیں کیونکہ خسرو خان جانتا ہے کہ جب تک آپ دہلی میں موجود ہیں، وہ ہندو حکومت قائم نہیں کرسکتا۔"

آپ نے متبسم ہوکر فرمایا۔ "مگر ہردیو! تم بھی تو ہندو تھے اور کیا تم علاؤالدین خلجی کے خلاف نہیں تھے؟ کیا تمہارے دل میں انتقام کا جذبہ نہیں؟"

ہردیو نے جواب دیا۔ "یہ سب کچھ ہے مگر میں آپ کا غلام ہوں۔ میں نے سچے دل سے اسلام قبول کیا ہے مگر خسرو خان نے بناوٹی اسلام قبول کیا ہے۔ میں گواہ ہوں کہ اس نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ یہ مسلمان جو باہر سے آئے ہیں، انہوں نے ہم ہندوؤں کو اپنا غلام بنالیا ہے۔ میں تجھ کو دکھاؤں گا کہ ان مسلمانوں کو میں کیسی عبرت ناک سزا دوں گا۔ اس پر میں نے اس سے کہا کہ تو جو کچھ بھی کہہ رہا ہے اس سے تمام ہندو مصیبت کا شکار ہوجائیں گے۔"

خواجہ نظام الدین ہردیو کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ جواب میں آپ نے ایک شعر پڑھا۔

اے روبہک چرانہ نشستی بجائے خویش
باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

اس کے بعد ہردیو وہاں سے چلا گیا۔ مجلس برخاست ہوئی لیکن ہر شخص فکرمند اور خوفزدہ تھا کہ دیکھیے کل کیا ہوتا ہے اور بادشاہ کی طرف سے کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔

دوسرے دن علی الصباح جب لوگ سو کر اٹھے تو ہر طرف یہ خبر گشت کر رہی تھی۔

''نصف شب کو سلطان قطب الدین خلجی کو محل ہزار ستون کی چھت پر ہندو بچے خسرو خان نے قتل کر ڈالا۔''

☆☆☆

خسرو خان نے اقتدار سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ میں دین محمدی کا ناصر و مددگار ہوں۔ میرا نام ناصر الدین محمد ہے۔ جو میری اطاعت کرے گا، اپنے عہدے پر بحال رہے گا...... جو سرکشی کرے گا، مارا جائے گا۔

ہردیو نے اپنے پیرو مرشد سے عرض کیا۔ ''حضرت! خسرو خان کٹر ہندو ہے۔ میری اور میرے باپ کی خیر نہیں ہے کیونکہ خسرو خان ہندو ہے اور میں مسلمان ہو چکا۔ میرے باپ کا مشورہ ہے کہ ہمیں دہلی چھوڑ کر دیوگڑھ چلا جانا چاہیے لیکن میں حضرت کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تیرے باپ کا مشورہ درست ہے۔''

خسرو خان نے ہندو فوج کی بھرتی کا حکم دے دیا۔ مسجدیں جلا دی گئیں۔ قرآن پاک پھاڑ دیے گئے۔ امراء پر پہرے بٹھا دیے گئے اور بڑے بڑے عہدے ہندوؤں کے حوالے کر دیے گئے۔

خسرو خان نے تمام صوبے داروں کو خلعت بھیجے۔ دوسروں نے تو ان خلعتوں کو قبول کر لیا مگر ملتان اور دیپال پور (بہاولپور) کے صوبے دار غازی ملک نے اس کو لوٹا دیا اور خسرو خان کو پیغام بھیجا۔ ''میں خائنوں اور غداروں کی سرکوبی کے لیے دہلی آ رہا ہوں۔ تم میرا انتظار کرو۔''

اتنی دیر میں خسرو خان نے ہندوؤں کی دو لاکھ کی فوج تیار کر لی تھی۔

ہردیو اپنے باپ کے ساتھ دیوگڑھ جا چکا تھا۔ ادھر خواجہ نظام الملک کی مجلس میں حالاتِ حاضرہ پر باتیں ہوتیں تو آپ فرماتے۔ ''جو کچھ ہوا دیکھ لیا، جو کچھ ہوگا اسے بھی دیکھ لو گے پھر پریشانی کس بات کی؟''

سرسا کے قریب غازی ملک اور خسرو خان کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ غازی ملک اپنی فوج کی کمان خود کر رہا تھا اور خسرو خان کی فوج کی کمان اس کے بھائی جاہریا کے ہاتھ میں تھی۔

دونوں فوجوں میں غضب کا معرکہ ہوا۔ آخر خسرو خان اور جاہریا کی فوج کو شکست ہوگئی۔ جاہریا دہلی میں مورچابند ہو گیا کیونکہ وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے حوضِ خاص کے غرب میں مورچے بنائے اور اپنی مدد کے لیے چاروں طرف کے ہندو راجاؤں کو طلب کر لیا۔ جب یہ کمکیں دہلی پہنچیں تو مسلمان ان کی کثرت سے مرعوب ہو گئے اور ان کے حوصلے پست ہو گئے۔

غازی ملک ان حالات اور نفسی کیفیتوں کا نہایت عمیق مطالعہ کر رہا تھا۔ حوضِ خاص کے سامنے دونوں فوجیں پھر آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ دونوں میں غضب کا معرکہ ہوا اور اس معرکے میں ہندوؤں کو شکست ہوگئی اور غازی ملک فاتح رہا۔ اس نے اپنے بیٹے جونا خان کو حکم دیا کہ وہ جاہریا اور خسرو خان کو تلاش کرے۔ دونوں جہاں بھی ملیں گرفتار کر لیا جائے۔ ان کا زندہ رہنا خطرے سے خالی نہیں۔

جونا خان نے دونوں کو تلاش کر کے اپنے باپ غازی ملک کے حوالے کر دیا۔ جب ان دونوں کو غازی ملک کے سامنے پیش کیا گیا تو خسرو خان نے کہا۔ ''غازی ملک! آج تو ہندوستان کا شہنشاہ ہے، کل تک میں بادشاہ تھا۔ پس تو مجھ سے وہ سلوک کر جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔''

غازی ملک نے جواب دیا۔ ''بیشک میں تیرے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔ تُو نے جو سلوک قطب الدین خلجی سے کیا ہے، وہی میں تجھ سے کروں گا۔''

اس کے بعد غازی ملک نے ان دونوں کو اپنے بیٹے جونا خان کے حوالے کر دیا اور کہہ دیا کہ ان دونوں کے ساتھ جیسا سلوک مناسب سمجھو کرو۔

جونا خان ان دونوں کو محل ہزار ستون کی چھت پر لے گیا۔ اس کے بعد دونوں سے پوچھا۔ ''تم دونوں سچ سچ بتانا، دونوں نے قطب الدین خلجی کو کس جگہ قتل کیا تھا؟''

دونوں نے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور ایک جگہ دکھا دی، بولے۔ ''اس جگہ۔''

جونا خان نے دو سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''ان دونوں کی گردنیں ایک ہی وار میں اڑا دو۔''
حکم کی تعمیل ہوئی اور دونوں کو تلوار کے ایک ہی وار سے قتل کر دیا گیا۔ جونا خان نے ان دونوں کی لاشیں چھت کے نیچے پھنکوا دیں۔ اب غازی ملک غیاث الدین تغلق کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بن چکا تھا۔
ہردیو نے یہ خبر دیوگڑھ میں سنی تو وہ دوبارہ اپنے باپ کے ساتھ دہلی کی طرف چل پڑا۔
غیاث الدین تغلق کی ماں ہندو تھی اور باپ تاتاری مسلمان۔ اس کی بیوی بھی ہندو تھی۔ جونا خان جو بعد میں سلطان محمد تغلق کہلایا، اس ہندو بیوی کا بیٹا تھا۔ چنانچہ غیاث الدین تغلق سے ہندو بھی خوش تھے اور مسلمان بھی۔
جب ہردیو اپنے باپ کے ساتھ حضرت نظام الدین کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ''ہردیو! ہم تجھے بھولے نہیں تھے، تم دونوں کی آمد مبارک ہو۔ وضو کی پابندی کا کیا حال ہے؟''
ہردیو نے جواب دیا۔ ''حضرت! سفر کی دشواریوں میں وضو کی پابندی نہیں ہو سکی۔''
آپ آبدیدہ ہو گئے، فرمایا۔ ''ہردیو! انسان کے پیدا ہوتے ہی دنیا کا کٹھن سفر شروع ہو جاتا ہے مگر اس سفر کی آسانی اس بات میں ہے کہ ہم اپنے خالق اور اپنے معبود کو یاد رکھیں، اس کو اپنے سامنے رکھیں۔''
اس کے بعد آپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر فرمایا۔ ''ہردیو! سلطان محمود غزنوی کا ایک بہت مقبول غلام تھا ایاز اور اب تو بھی رسول مقبول ﷺ کی غلامی میں آ چکا ہے۔ رسول مقبول ﷺ کا ایک نام احمد ﷺ بھی تھا چنانچہ اسی نسبت سے میں نے تیرا نام احمد ایاز تجویز کیا ہے۔ تو اپنی توجہ لفظ احمد کی طرف ہمیشہ رکھ۔ جب نماز کے لیے کھڑا ہو تو یہ خیال کر تو احمد کا الف ہے۔ جب رکوع میں ہو تو یہ سمجھ کہ تو احمد کی ح ہے اور جب سجدے میں جاؤ تو خود کو احمد ایاز سمجھنا یعنی احمد کے غلام۔''
ہردیو آپ کے قدموں میں گر کر زاروقطار رونے لگا، بولا۔ ''آج سے میں حضرت کا بے دام غلام ہوں۔''
اس واقعے کے تین دن بعد احمد ایاز آپ کے دوسرے مریدوں کے ساتھ آپ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ نئے سلطان غیاث الدین تغلق کا آدمی ایک حکم لے کر حاضر ہوا، پوچھا۔ ''نظام الدین بدایونی کون ہے؟''
خواجہ سید محمد امام نے عرض کیا۔ ''حضرت کے نام اگر کسی کا کوئی پیغام ہو تو میرے حوالے کر، میں انہیں دے دوں گا۔''
آنے والے نے جواب دیا۔ ''میں بادشاہ کا آدمی ہوں، بادشاہ نے کہا ہے کہ خواجہ نظام الدین بدایونی گانا سنتے ہیں جبکہ گانا شریعت میں حرام ہے اس لیے آپ میرے دربار میں آئیں اور میرے مفتیِ اعظم سے شہر کے جملہ علما کے سامنے اور میری موجودگی میں بحث کیجیے۔ اگر آپ نے گانے کا جواز ثابت کر دیا تو ہم سب بھی گانا سننا شروع کر دیں گے ورنہ آپ کو اس گناہ سے توبہ کرنی ہوگی۔''
آپ نے بادشاہ کا خط نہایت توجہ سے سنا، آپ نے سید محمد امام سے کہا۔ ''میرا جواب بنام بادشاہ لکھو۔''
سید محمد امام نے کاغذ قلم اور دوات سنبھالا۔ آپ نے جواب میں لکھوایا۔
''میری اور میرے بزرگوں کی یہ عادت رہی ہے کہ ہم کبھی کسی بادشاہ کے پاس نہیں گئے اور نہ ہی بادشاہوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن تو ہمیں جس دربار میں بلا رہا ہے وہ شریعت کا دربار ہے۔ میں اس دربار میں اس شرط پر آنے کو تیار ہوں کہ بادشاہ اس دربار میں اہلِ علم سے اونچی جگہ پر نہ بیٹھے۔ سب لوگ زمین کے فرش پر مساوی حالت میں نشست کریں۔''
بادشاہ نے جواب میں کہلا بھیجا۔ ''مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔''
دوسرے دن آپ گھوڑے پر سوار ہو کر تغلق آباد تشریف لے گئے۔ یہ نیا شہر تھا زیرِ تعمیر، بادشاہ کے نام پر۔
آپ کے ارادت مند اور مرید آپ کے ساتھ ساتھ چلے اور درخواست کی کہ اس مناظرے اور مباحثے میں انہیں بھی ساتھ رکھا جائے مگر آپ نے ان کی بات نہیں مانی۔ فرمایا۔ ''اگر تم لوگ شاہی دربار میں میرے ساتھ گئے تو یہ کہا جائے گا کہ نظام الدین مریدوں کے ہجوم کے ساتھ یہاں آیا اور اس نے مفتیِ اعظم کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔''
لیکن مریدوں نے اصرار جاری رکھا، آپ نے ان کی بات نہیں مانی۔ شاہی محل کے سامنے زمین پر فرش بچھا دیا گیا تھا۔ صدر میں بادشاہ اپنے فوجی افسروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور یہ سب ہتھیار بند تھے۔ بادشاہ کے داہنی ہاتھ علما کی صف تھی، ان کے درمیان میں مفتیِ اعظم تشریف فرما تھے۔ بادشاہ نے اشارہ کیا کہ بحث کا آغاز کیا جائے۔
مفتیِ اعظم نے کھنکھار کر فرمایا۔ ''کیا آپ مسلمان ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''بحمد للہ میں مسلمان ہوں۔''
مفتی نے دوسرا سوال کیا۔ ''کیا آپ حنفی ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتا ہوں۔“

مفتی نے پوچھا۔ ”کیا آپ گانا سنتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں گانا سنتا ہوں۔“

مفتی نے پھر سوال کیا۔ ”کیا اس گانے میں مزامیر (ساز) بھی ہوتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”کبھی ہوتے ہیں کبھی نہیں ہوتے۔“

مفتی نے پوچھا۔ ”وہ گانا گھر کے اندر مخفی طریقے سے ہوتا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں دونوں ہی طرح سنتا ہوں، گھر کے اندر بھی اور مجلسِ عام میں بھی۔“

مفتی نے پوچھا۔ ”اس طرح گانا سننے کے جواز میں آپ کے پاس کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”بخاری شریف میں صحیح حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے مدینے کی انصار لڑکیاں دف بجا بجا کر گا رہی تھیں اور آپ ان کا گانا سن رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عمرؓ وہاں آگئے اور انہوں نے لڑکیوں کو گانے بجانے سے روکا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا...... عمر! ان لڑکیوں کو گانے بجانے سے نہ روکو۔ آج ان کا عید کا دن ہے اور ہر قوم کا ایک عید کا دن ہوتا ہے۔“

مفتیِ اعظم نے کہا۔ ”ترا با حدیث چہ کار؟ تو کہ مشرب ابوحنیفہؒ داری، قولِ ابوحنیفہ بیار۔“ (تم کو رسول ﷺ کی حدیث سے کیا واسطہ...... تم حنفی ہو اور ابوحنیفہ کا مسلک رکھتے ہو، ابوحنیفہ کا قول دلیل میں پیش کرو۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”سبحان اللہ۔ من کہ قولِ رسول ﷺ آرم تو می گوئی کہ قولِ امتی بیار۔ ابوحنیفہ کہ بود کہ من قولِ او بمقابلہ قولِ رسول ﷺ می آرم؟“ (سبحان اللہ۔ میں رسول اللہ ﷺ کا قول پیش کرتا ہوں اور تم ایک امتی کا قول مانگتے ہو۔ ابوحنیفہ کون تھے جن کا قول میں رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں پیش کروں؟“ مزید فرمایا۔ ”جو قوم رسول ﷺ کے مقابلے میں ایک امتی کا قول مانگتی ہے وہ اس سے نہیں ڈرتی کہ وہ قوم جلاوطن ہو جائے، قحط میں مبتلا ہو جائے اور اس کا شہر برباد اور ویران ہو جائے۔“

مفتیِ اعظم اور دوسرے علما لاجواب ہو چکے تھے۔ کھسیا کر انہوں نے بادشاہ اور حاضرین کو اشتعال دلانے کی کوشش کی۔ ”خدا کی پناہ! یہ شخص حاجی شریف اور ناصر فقہ حنفی بادشاہ کی موجودگی میں امام ابوحنیفہؒ کی توہین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ابوحنیفہؒ کون تھے حالانکہ کچھ دیر پہلے انہوں نے یہ کہا تھا کہ میں حنفی ہوں اور امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں۔“

مفتیِ اعظم کی حکمت رنگ لائی۔ مجلس میں علما نے چیخ چیخ کر غصے سے کہنا شروع کیا۔ ”اس نے امام کی توہین کی ہے، یہ شخص مجرم ہے، یہ شخص گستاخ ہے۔“

لیکن بادشاہ آپ کی باتوں سے وقتی طور پر مرعوب ہو چکا تھا، بولا۔ ”میں حکم دیتا ہوں کہ شیخ نظام الدین بدایونی اور ان کے مریدوں اور ان کے خلفا کو گانا سننے اور گانے کی مجلسیں کرنے سے میری حکومت کا کوئی آدمی نہ روکے۔“

☆☆☆

اچانک بنگالے سے خبر آئی کہ وہاں بغاوت ہوگئی ہے۔ غیاث الدین تغلق باغیوں کی سرکوبی کے لیے بنگال چلا گیا اور اپنے بیٹے جونا خان کو جس کا خطاب الغ خان تھا، اپنا جانشین مقرر کر گیا۔ الغ خان کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔

الغ خان نے آپ کے خادمِ خاص خواجہ اقبال سے ایک دن کہا۔ ”خواجہ اقبال! میں درویش کا بھیس بدل کر حضرت کی بارگاہ میں حاضری دینا چاہتا ہوں کیونکہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ حضرت مجھے پہچانتے ہیں یا نہیں؟“

خواجہ اقبال نے یہ اجازت دے دی۔ اس دن مجلس میں چند نئے درویش بھی نظر آئے۔ ان کے کپڑے پھٹے پرانے اور بوسیدہ تھے۔ احمد ایاز نے ان درویشوں میں الغ خان کو پہچان لیا کیونکہ احمد ایاز جب ہردیو تھا تو اس وقت الغ خان کو دیکھ چکا تھا۔

کچھ دیر بیٹھ کر وہ سب زمین بوسی کے لیے اٹھے اور زمین کو چوم کر مجلس میں ایک صف میں بیٹھ گئے۔ بعد میں الغ خان نے آپ سے جانے کی اجازت چاہی تو آپ نے الغ خان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ”ایک بادشاہ آتا ہے اور ایک بادشاہ جاتا ہے۔“

خواجہ اقبال نے احمد ایاز سے کہا۔ ”یہاں ایک بادشاہ الغ خان تو موجود ہے مگر دوسرا بادشاہ کہیں نظر نہیں آتا۔“

الغ خان درویشوں کے ساتھ واپس جا چکا تھا۔ آپ نے سید محمد سے پوچھا۔ ”کیا درویش چلے گئے؟“

سید محمد نے جواب دیا۔ ”جی حضرت جی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اچھا اب ذرا باہر نکل کر تو دیکھ، وہاں ایک بادشاہ باریابی کی خواہش میں بیٹھا ہے۔ اسے اندر بلا لا اور

اسے کھانا کھلا۔"

سید محمد باہر گئے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اندر واپس آ گئے اور آپ سے کہا۔ "حضرت! باہر کوئی امیر یا بادشاہ تو موجود نہیں البتہ ایک خوب صورت نوجوان ضرور بیٹھا ہے، اس کے کپڑے، بہت پرانے اور میلے ہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "دوبارہ جاؤ اور اس کے حالات پوچھ کر آ۔"

اس بار خواجہ سید محمد کے ساتھ احمد ایاز نے بھی باہر کا رخ کیا۔ وہاں ایک خوب صورت لڑکا بیٹھا تھا۔

احمد ایاز نے پوچھا۔ "لڑکے! تم کون ہو؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "میں ایک ایرانی ہوں، ایرانی امیرزادہ۔ مغلوں کے ہاتھوں میرا خاندان برباد ہو گیا۔ میں نوکری کی تلاش میں اِدھر چلا آیا۔ میں کئی سال سے دھکے کھا رہا ہوں مگر کہیں نوکری نہیں ملتی۔ اس وقت میں تین وقت کا بھوکا ہوں۔ سنا تھا حضرت کا لنگرِ عام ہے اور اس لنگر سے جو شخص روٹی کھا لیتا ہے، اس کی مصیبت دور ہو جاتی ہے مگر میری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ لنگر خانے میں جا کر کھانا مانگوں۔ اب میں دروازے پر یہ سوچ کر بیٹھا ہوں کہ شاید حضرت کی باطنی توجہ سے میری تکلیف دور ہو جائے۔"

احمد ایاز اور خواجہ سید محمد دوبارہ اندر گئے اور عرض کیا۔ "حضرت! باہر ایک ایرانی لڑکا بیٹھا ہے، وہاں بادشاہ نام کی کوئی چیز نہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "بادشاہ کو اندر بلاؤ اور کھانا کھلاؤ۔ اسے لنگر خانے میں مت لے جانا۔ اس کو میرے پاس لاؤ۔"

وہ دونوں پھر گئے اور لڑکے سے پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے لڑکے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "حسن۔"

خواجہ سید محمد نے کہا۔ "اندر چل، تجھ کو حضرت یاد فرماتے ہیں۔"

وہ ان دونوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اسے فقرا کے دربار میں حاضری دینے کے آداب نہیں معلوم تھے۔ سید محمد آپ کے پاس جا کھڑے ہوئے، یہ لڑکا بھی ان کے پاس ہی جا کھڑا ہوا۔

آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا۔ "بنشیں اے بادشاہِ دکن۔" (بادشاہ دکن بیٹھ جاؤ)

لڑکا آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے سید محمد سے کہا۔ "دکن کے بادشاہ کے لیے کھانا لاؤ۔"

سید محمد لنگر خانے سے روٹیوں کے ٹوٹے ہوئے چند ٹکڑے لے آئے اور حضرت نظام الدین کے سامنے رکھتے ہوئے فرمایا۔ "حضرت! لنگر خانے میں خیر کے سوا اب کچھ بھی نہیں۔ جو بچا تھا، لے آیا۔"

آپ نے ان ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا نکال کر لڑکے کو اشارے سے قریب بلایا اور فرمایا۔ "لے، یہ دکن کی بادشاہی کا تاج ہے۔" لڑکے نے وہ ٹکڑا حضرت کے ہاتھ سے لے کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔

سید محمد نے کہا۔ "لڑکے! احتراماً حضرت کے سامنے جھک جا۔"

لڑکا تعظیماً جھک گیا۔ احمد ایاز (ہردیو) نے باپ سے سرگوشی میں کہا۔ "والدِ محترم! یہ شخص یقیناً ہمارے وطن کا بادشاہ ہو جائے گا اس لیے ہمیں اس سے ابھی سے تعلقات قائم کر لینے چاہئیں۔"

باپ نے جواب دیا۔ "میں تیری ملازمت کی ولی عہد الغ خان سے بات کر چکا ہوں۔ انہوں نے تجھے اپنی تعمیرات کا افسر مقرر کر دیا ہے۔ کل تجھے ولی عہد کے دربار میں حاضر ہو کر اپنا منصب سنبھالنا ہے۔"

احمد ایاز نے پوچھا۔ "اگر دربار میں بات نہ بنی تو؟"

باپ نے کہا۔ "ولی عہد کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔"

احمد ایاز نے کہا۔ "میں اس سلسلے میں پہلے اپنے پیرومرشد سے پوچھوں گا اگر وہ اجازت دے دیں تو افسرِ تعمیرات کا عہدہ سنبھال لوں گا، ورنہ نہیں۔"

باپ نے کہا۔ "تو اسی وقت حضرت سے اس کی اجازت حاصل کر لے اگر وہ انکار کر دیں تو میں خود بھی انکار کر دوں گا کیونکہ حضرت کی مرضی کے بغیر میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

جب یہ درخواست خواجہ نظام الدین کے روبرو پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ "احمد ایاز! تو اس نوکری کو قبول کر لے کیونکہ تیری یہی ملازمت تیرے عروج کی تعمیر کی پہلی سیڑھی ہے۔"

چنانچہ جب احمد ایاز کو الغ خان کے دربار میں پیش کیا گیا تو اس نے اسے حکم دیا۔ "تغلق آباد کا جو نیا قلعہ تعمیر کیا جا رہا ہے، اس کا سارا کام تیرے سپرد کیا جاتا ہے اور تجھ کو شاہی عمارات کا شحنہ بنایا جاتا ہے۔"

احمد ایاز تعظیماً ولی عہد کے سامنے جھک گیا۔ ولی عہد نے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”میرا نام ہر دیو تھا مگر حضرت نظام الدین نے احمد ایاز نام عطا فرمایا ہے۔“

ولی عہد نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا تو مسلمان ہو گیا ہے؟“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”خدا کا شکر ہے، جس نے مجھے خواجہ کی برکت سے اسلام کا شرف عطا فرمایا۔“

ولی عہد الغ خان نے خوش ہو کر حکم دیا۔ ”اس کو سونے کا کنگن پہنایا جائے اور آئندہ اسے احمد ایاز خواجۂ جہاں کہا جائے۔“

نوکروں نے حکم کی تعمیل کی اور احمد ایاز کے دونوں ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنا دیے گئے۔ احمد ایاز ولی عہد کی دوبارہ تعظیم بجالایا۔ اس وقت احمد ایاز کی نظر اس نوجوان پر پڑی جو ولی عہد کے عقب میں کھڑا ہوا رومال سے مکھیاں اڑا رہا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جسے خواجہ نظام الدین نے بادشاہ دکن کہہ کر مخاطب کیا تھا...... حسن۔

خواجہ نظام الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ احمد ایاز خواجۂ جہاں ہو چکا ہے اور شحنہ تعمیرات مقرر ہوا ہے تو بہت خوش ہوئے۔ آپ کی مجلس میں احمد ایاز کی باتیں ہو رہی تھیں، آپ نے فرمایا۔ ”ابھی تو آغاز ہوا ہے ورنہ احمد ایاز کو ابھی بہت کچھ بننا باقی ہے۔“

اسی وقت مجلس میں ایک اجنبی داخل ہوا اور پوچھا۔ ”حضرات! میں خواجہ نظام الدین بدایونی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

سید محمد نے جواب دیا۔ ”میرے حضرت سے تمہارا کیا کام ہے، یہ بتاؤ تو میں ان سے ملوا دوں۔“

اجنبی نے کہا۔ ”میں غیاث الدین تغلق کا قاصد ہوں اور اس وقت بنگالے سے چلا آ رہا ہوں۔ میں حضرت کے نام بادشاہ کا ایک پیغام لایا ہوں۔“

پیغام تھا۔ ”شیخ نظام الدین بدایونی کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں دہلی واپس آ رہا ہوں۔ وہ میری واپسی سے پہلے ہی دہلی چھوڑ کر کہیں چلے جائیں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ دہلی میں آنے کے بعد میں ایک ایسے شخص کو دیکھوں جو انسان ہے اور دوسرے انسانوں سے اپنے سامنے سجدے کراتا ہے اور جو حنفی ہے اور امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کے خلاف گانا سنتا ہے اور کھلم کھلا گانے بجانے کی مجلسیں منعقد کرتا ہے۔“

آپ خط کا مضمون سن کر مسکرائے۔ سید محمد سے کہا۔ ”اس خط کی پیشانی پر لکھ دے۔ ہنوز دلی دور است۔“ (دلی ابھی دور ہے)

سید محمد نے خط کی پیشانی پر آپ کی فرمودہ عبارت لکھ دی۔ آپ نے یہ خط سلطان کے قاصد کو واپس دے دیا اور فرمایا۔ ”میرا جواب بادشاہ کو بنگالے پہنچا دے۔“

احمد ایاز نے جب یہ بات سنی تو فکر مند ہو گیا۔ سید محمد نے کہا۔ ”تم کیوں فکر مند ہو؟“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”اس وقت میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔“

سید محمد نے کہا۔ ”اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ بادشاہ حضرت کی مخالفت کیوں کر رہا ہے تو اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے سلطان قطب الدین خلجی بھی حضرت کی مخالفت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ غیاث الدین تغلق بھی اپنی حکومت کی مضبوطی کے لیے آپ کی مخالفت کو ضروری سمجھتا ہے۔“

احمد ایاز نے کہا۔ ”جی نہیں، میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک خط ولی عہد کے پاس بھی آیا ہے۔ اس میں سلطان نے لکھا ہے...... مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ تم درویشانہ لباس میں شیخ نظام الدین کی مجلس میں گئے تھے اور شیخ نے تمہیں ہندوستان کے بادشاہ ہونے کی دعا دی ہے اور یہ کہ تم نے شیخ کے ایک ہندو مرید کو میر عمارات کا عہدہ دیا ہے۔ ان باتوں سے تمہاری بدخواہی ظاہر ہوتی ہے۔ آئندہ احتیاط سے کام لو ورنہ تم ولی عہدی سے محروم کر دیے جاؤ گے۔“

سید محمد نے کہا۔ ”لیکن یہ اطلاع تمہیں کس نے دی؟“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”حسن ایرانی نے۔ وہ کہتا تھا کہ ولی عہد بادشاہ سے ڈر گیا ہے اور تعجب نہیں کہ تم میر عمارات نہ رہو اور ملازمت سے الگ کر دیے جاؤ۔“

سید محمد نے کہا۔ ”تب پھر تمہیں یہ سب باتیں حضرت کے گوش گزار کر دینی چاہئیں۔“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”میں ذرا بھی خوفزدہ نہیں کیونکہ میرے لیے حضرت کا لنگر خانہ کافی ہے اور حضرت نے یہ تو فرما ہی دیا ہے کہ ایک بادشاہ آتا ہے اور ایک بادشاہ جاتا ہے۔“

یہ دونوں باتیں کر کے الگ ہو گئے۔ اس وقت شیخ کی عمر نوے سال... ہو چکی تھی اور چونکہ یہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اس لیے بہت زیادہ کمزور ہو گئے تھے اور آپ کے مرید اور ارادت مند ہر وقت فکر مند رہنے لگے تھے۔

اس بیماری اور کمزوری کے دوران بادشاہ کا ایک خط اور آگیا۔ یہ خط ولی عہد کے نام آیا تھا۔ اس میں بادشاہ نے لکھا تھا۔
''میں نے سنا ہے شیخ نظام الدین بدایونی چراغوں اور مشعلوں کی روشنی میں ایک باؤلی تعمیر کرا رہا ہے اور یہ کام وہ انہی مزدوروں سے لے رہا ہے، جن سے تم دن میں کام لیتے ہو۔ تم شہر کے تاجروں کو حکم دے دو کہ وہ نظام الدین بدایونی کے ہاتھ تیل فروخت نہ کریں اور نظام الدین بدایونی کو میری طرف سے مطلع کر دو کہ میں بنگالے سے روانہ ہو چکا ہوں اور وہ میرے دہلی پہنچنے سے پہلے ہی کہیں اور چلے جائیں۔''
ولی عہد نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شہر کے تاجروں کو حکم دے دیا کہ وہ نظام الدین بدایونی یا ان کے کسی مرید کے ہاتھ تیل نہ فروخت کریں۔
اس کے بعد شہزادے نے سلطان کا پیغام آپ کے پاس بھیج دیا۔ آپ نے اس بار بھی اپنا پہلا والا فقرہ دُہرایا۔ ''ہنوز دلی دور است۔''
یہ ربیع الاول **725** ھ کا ذکر ہے، بادشاہ بنگالے سے چل کر دہلی کے قریب افغان پور میں داخل ہو گیا۔ یہاں ولی عہد نے ایک محل تعمیر کرایا تھا۔ بادشاہ نے اس محل کو دیکھا تو بہت خوش ہوا۔
بادشاہ نے پوچھا۔ ''کیا نظام الدین بدایونی کو میرا پیغام پہنچا دیا گیا تھا؟''
ولی عہد نے جواب دیا۔ ''جی اعلیٰ حضرت۔''
بادشاہ نے پوچھا۔ ''کیا شیخ نے دہلی چھوڑ دی؟''
ولی عہد نے ڈرڈر کر عرض کیا۔ ''نہیں، انہوں نے دہلی چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے آپ کے جواب میں کہلا دیا تھا کہ ہنوز دلی دور است۔''
بادشاہ غضب ناک ہو گیا، بولا۔ ''اس دنیادار درویش کو تو میں ٹھیک کر دوں گا۔''
اس وقت احمد ایاز بھی وہیں موجود تھا۔ بادشاہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''
شہزادے نے جواب دیا۔ ''احمد ایاز...... اور جب یہ ہندو تھا تو اس کا نام مہندر ہردیو تھا۔ اس کو شیخ نے مسلمان کر لیا ہے اور میں نے اسے میرِ عمارات کا عہدہ دے دیا ہے۔ یہ دو گڑھ کے شاہی خاندان کا ایک فرد ہے۔''
سلطان نے کہا۔ ''بہت خوب!'' پھر محل کی تعریفیں کرنے لگا۔ بولا۔ ''میں محل کی چھت دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا اس پر بہ وقتِ ضرورت ہاتھی لے جائے جا سکتے ہیں؟''
شہزادے نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، ہاتھی اوپر لے جائے جا سکتے ہیں۔''
پھر شہزادے نے احمد ایاز کو حکم دیا۔ ''ہم لوگ اوپر جا رہے ہیں، تم نذرانے کے ہاتھی اوپر ہی بھیج دو۔''
سلطان کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا محمود بھی تھا اور چند امراء بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سلطان ان سب کو لے کر محل کی چھت پر چلا گیا۔ ولی عہد نیچے ہی موجود رہا۔ اتنے میں نذرانے کے ہاتھی بھی آ گئے اور بادشاہ نے ان کو بھی اوپر ہی بلوا لیا۔
جب یہ لوگ اوپر چلے گئے اور ان کے ہاتھی بھی اوپر پہنچائے جانے لگے تو عمارت کی چھت میں زلزلہ سا محسوس ہوا پھر چھت ہاتھیوں، بادشاہ اور اس کے شہزادے سمیت زمیں بوس ہو گئی۔
ولی عہد نے چیخ پکار شروع کر دی۔ ''مزدوروں کو جلدی بلایا جائے۔''
اس وقت مزدور قریب نہیں تھے۔ شیخ رکن الدین ملتانی کہیں قریب ہی موجود تھے۔ محل کے زمیں بوس ہونے کی آواز انہوں نے بھی سن لی تھی۔ فوراً بھاگے ہوئے منہدم محل کے پاس پہنچ گئے۔
کافی دیر بعد مزدور آئے اور انہوں نے محل کا ملبا جو ہٹایا تو اس کے اندر سے بادشاہ، شہزادہ محمود اور دوسرے امراء کی کچلی ہوئی لاشیں نکل آئیں۔ ولی عہد نے امراء کی لاشوں کو تو الگ کر دیا اور بادشاہ اور اپنے بھائی کو قلعے کے قریب دفن کر دیا۔ بادشاہ نے یہ جگہ اپنی زندگی ہی میں اپنی قبر کے لیے مخصوص کر دی تھی۔
بادشاہ کی حادثاتی موت کا سبھی کو بڑا دکھ ہوا۔ کئی دن تک بادشاہ کا سوگ منایا گیا۔ اس سوگ کے بعد شہزادہ الغ خان ہندوستان کے شاہی تخت پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

بادشاہ کی خلوت میں احمد ایاز بھی موجود تھا اور شیخ رکن الدین ملتانی بھی۔ الغ خان...... جو اب سلطان محمد تغلق ہو چکا تھا، اس

نے احمد ایاز سے پوچھا۔ ''احمد ایاز! تم کئی سال سے سلطان المشائخ کی خدمت میں رہ رہے ہو۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ حضرت نے شادی کیوں نہیں کی؟''

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ''میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا کیونکہ میرے سامنے اس موضوع پر کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔''

لیکن شیخ رکن الدین ملتانی نے فرمایا۔ ''میں اس سلسلے میں سلطان المشائخ سے تخلیہ میں بات کر چکا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا...... میں نکاح کا منکر نہیں ہوں مگر جب میں قرآن پاک پڑھتا ہوں اور اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھتا ہوں کہ تمہاری دولت اور اولاد تمہارے لیے فتنہ ہوتی ہے، تو میں سہم جاتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں سنت کی پیروی کے خیال سے نکاح کروں اور خدا کے فرائض فوت ہونے لگیں۔ میں اولاد کے فتنے میں پھنس کر فرائضِ خداوندی کو بھول جاؤں۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں یہ جواب کیسا ہے؟''

شیخ ملتانی نے جواب دیا۔ ''نہایت معقول، اس سے زیادہ معقول جواب ہو ہی نہیں سکتا۔''

مجلسِ خلوت سے فارغ ہونے کے بعد احمد ایاز بادشاہ سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو ذرا دیر بعد شیخ ملتانی بھی بادشاہ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ احمد ایاز اپنے گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ شیخ ملتانی کا ایک مرید اس کے پاس پہنچ گیا اور کہا۔ ''ہمارے شیخ نے فرمایا ہے کہ شام تک ان سے ایک ملاقات کر لو۔''

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ''اپنے پیرومرشد سے عرض کر دینا کہ میں آج نہیں آسکوں گا۔ میرے پیرومرشد کی طبیعت ناساز ہے۔ میں ان کی خدمت میں جاؤں گا۔ ہاں، کل ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔''

لیکن تھوڑی دیر بعد شیخ ملتانی کا مرید دوبارہ آگیا اور کہا...... ''پیرومرشد نے فرمایا ہے کہ اپنے مرشد کے پاس جانے سے پہلے مجھ سے ضرور مل لینا۔''

شام کو احمد ایاز سیدھا شیخ ملتانی کی خدمت میں پہنچا اور کہا۔ ''حضرت! میں آگیا ہوں۔ فرمائیے مجھ سے کیا کام ہے؟''

شیخ ملتانی نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے فرمایا۔ ''احمد ایاز! بادشاہ تجھ سے اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ تو اپنے شیخ سے دریافت کر کے کل صبح تک اپنے جواب سے مطلع کر دینا تاکہ میں بادشاہ کو اس کی اطلاع دے سکوں۔''

احمد ایاز دوبارہ اپنے گھر گیا اور اپنے باپ کو یہ بات بتا دی۔ وہ بہت خوش ہوا، اس نے کہا۔ ''یہ سب حضرت کی توجہ کی تاثیر ہے۔''

جب احمد ایاز سلطان المشائخ کی خدمت میں پہنچا تو اس وقت آپ بالاخانے کی چھت پر تشریف فرما تھے۔ ان کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ احمد ایاز نے شیخ ملتانی کے حوالے سے بادشاہ کی پیشکش کا ذکر کر دیا اور پوچھا۔ ''میں حضرت کی اجازت کے بغیر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

آپ نے متبسم ہو کر احمد ایاز کی طرف دیکھا، فرمایا۔ ''جا۔ میری اجازت ہے۔ میں مشیتِ الٰہی کی مخالفت نہیں کر سکتا ورنہ بادشاہوں سے رشتے داری کرنا خدا پرست انسانوں کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔''

احمد ایاز نے شیخ ملتانی کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا۔ بادشاہ نے اوائل ربیع الآخر 725ھ میں اپنی بیٹی کی شادی احمد ایاز سے خفیہ طور پر کر دی۔ اب احمد ایاز کا مرتبہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے محبوبِ الٰہی کی خدمت میں ایک ہفتہ مسلسل نہیں جاسکا۔ اپنے غلام مقبل کو بھیج کر خیریت معلوم کر لیا کرتا تھا۔

ایک دن سید محمد نے خبر دی کہ پیرومرشد کی حالت بہت نازک ہے۔ احمد ایاز نے یہ خبر بادشاہ کے گوش گزار کر دی۔ بادشاہ نے کہا۔ ''تم اسی وقت میرے طبیبِ خاص کو لے کر وہاں پہنچ جاؤ اور حضرت سلطان المشائخ سے کہو کہ میں بھی عیادت کے لیے حاضری دینا چاہتا ہوں لیکن جب تک باریابی کی اجازت نہ مل جائے، میں کس طرح آسکتا ہوں۔''

جب احمد ایاز شاہی طبیب اور دو غلاموں کے ساتھ شیخ کی خدمت میں پہنچا تو وہ بحالتِ بے ہوشی فرما رہے تھے۔ ''کوئی چیز باقی نہ رہے اقبال۔ سب کچھ لٹا دے ورنہ تو ذمے دار ہوگا۔''

کسی نے جواب دیا۔ ''اقبال نے آپ کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی ہے، ہاں انبار خانوں میں غلّہ بھرا ہوا ہے محض اس خیال سے کہ درویش کیا کھائیں گے؟''

آپ کو ہوش آچکا تھا۔ آپ نے غصے میں فرمایا۔ ''انبار خانوں کے دروازے توڑ ڈالو اور زمین کی اس ریت (غلہ) کو لٹا دو۔''

چنانچہ اطراف کے فقیروں اور مسکینوں کو انبار خانوں کے سامنے بلوا کر ان کے دروازے کھلوا دیے گئے اور ذرا سی دیر میں غلّے کے گودام خالی ہو گئے۔

آپ پھر بے ہوش ہو گئے۔ احمد ایاز نے خادم خاص خواجہ اقبال سے کہا۔ "بادشاہ نے حضرت کے علاج کے لیے اپنا طبیب خاص میرے ساتھ کر دیا ہے۔ میں اس طبیب کے ذریعے آپ کا علاج کرانا چاہتا ہوں۔"

خواجہ اقبال نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں وہ شاہی طبیب سے اپنا علاج نہیں کرائیں گے پھر بھی میں اس طبیب کو آپ کے پاس لیے چلتا ہوں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ جیسا حکم دیں گے میں اس پر عمل کروں گا۔"

جب شاہی طبیب کو آپ کے قریب پہنچا دیا گیا تو اس نے اجازت لیے بغیر ہی آپ کی نبض اپنی انگلیوں میں لے لی۔ آپ نے اسی وقت آنکھیں کھول دیں اور طبیب کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔

خواجہ اقبال نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "حضرت! سلطان تغلق نے آپ کے علاج کے لیے اپنے خاص طبیب کو یہاں بھیجا ہے۔ کیا آپ اس کو علاج کرنے کی اجازت دیں گے؟"

آپ نے اپنی کمزور آواز میں جواب دیا۔ "طبیب سے کہہ دو کہ دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست" (عشق کے بیمار کے لیے دیدار کے سوا کوئی علاج کارگر نہیں ہوگا)

آپ ساری رات بے ہوش رہے مگر صبح فجر کی نماز بھی ادا کی۔ اس کے بعد پھر غشی طاری ہو گئی۔ کسی نے بحالتِ بے ہوشی فرماتے سنا۔ "دیکھو شیخ العالم تشریف لائے ہیں، مجھے ان کی تعظیم کے لیے اٹھاؤ۔"

لیکن وہاں شیخ العالم کا کہیں پتا نہ تھا۔ یکا یک سکوت طاری ہو گیا۔ سانس رک گئی۔ آفتاب غروب ہو گیا۔ یہ بروز بدھ 18 ربیع الاول 725ھ کی بات ہے۔ ہر شخص دم بخود کھڑا تھا۔ پھر حاضرین میں بے قراری بڑھنے لگی اور لوگوں نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔

سید محمد نے روتے ہوئے کہا۔ "حضرات! چیخ چیخ کر مت رونا کیونکہ آپ نے ہمیشہ اس سے منع فرمایا ہے۔"

یکا یک حاضرین میں ہلچل سی ہوئی اور وہ پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگے۔ وہاں سلطان محمد تغلق اور شیخ ملتانی آ چکے تھے۔ سلطان نے آپ کے پلنگ کے قریب آ کر چہرے پر سے چادر ہٹائی اور خوب رویا، پھر پوچھا۔ "دفن کا انتظام کہاں ہوگا؟"

سید حسین کرمانی نے جواب دیا۔ "حضرت کی وصیت تھی کہ انہیں اس تالاب میں دفن کیا جائے۔"

بادشاہ نے احمد ایاز کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ "اس تالاب کو چند ساعتوں میں پاٹ دیا جائے اور پھر اس میں حضرت کی تدفین عمل میں لائی جائے گی۔"

احمد ایاز اسی وقت مزدوروں کی تلاش میں نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو آپ کی آخری رسوم ادا کی جا چکی تھیں۔ خواجہ سید محمد نے حیرت سے کہا۔ "میں خوش ہوں کہ بادشاہ بہت صبح ہی آ گیا تھا اور دوسری خوشی کی بات یہ کہ حضرت کو کندھا دینے والوں میں ان کے مخالفین بھی شامل تھے، شاید بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے۔"

احمد ایاز نے جواب دیا۔ "اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ بادشاہ دیر تک بھوکا رہا۔ حالانکہ اتنی دیر میں بادشاہ تین بار کھا چکتا ہے۔"

خواجہ نظام الدین اولیاء جو سلطان المشائخ اور محبوب الٰہی بھی تھے، ان کی خانقاہ برصغیر کی سب سے بڑی روحانی جامعہ تھی۔ آپ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کر چکی تھی۔ لوگ پابندِ صوم وصلوٰۃ ہو گئے تھے اور ہر طرف دین کا چرچا تھا۔ آپ نے کتنے ہی ہندوؤں کو مسلمان کیا اور ان میں راسخ الاعتقادی اور استقامت پیدا کر دی۔

جب آپ دہلی تشریف لے جائیں گے تو آپ کو خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار کے مشرق میں نصف میل دور دریائے جمنا کے کنارے شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ نظر آئے گا۔ خواجہ محبوب الٰہی کی خانقاہ اس مقبرے کے شمالی گوشے میں ہے۔ خانقاہ کے مغرب میں سید شمس الدین اوتا داللہ کا مزار ہے۔ قریب ہی جنوب مغرب میں عرب سرائے ہے جو اب ویران ہو چکی ہے۔ سرائے کے شمال مغربی گوشے میں حلیمہ کا باغ ہے اور مسجد ہے...... یہاں شیر شاہ سوری کے ایک امیر عیسیٰ خاں کی قبر ہے۔ مغرب میں لوہارو خاندان کی قبریں ہیں۔ انہی قبروں میں مرزا غالب کی بھی قبر ہے۔ یہاں مدت سے یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ محبوب الٰہی کے پڑوس میں دفن ہونے والوں کو نجات حاصل ہوتی ہے۔

ماخذات

سیر الاولیاء امیر خورد۔ سیر العارفین حامد بن فضل اللہ جمالی۔ اخبار الاخیار۔ شیخ عبدالحق محدث
فوائد الفواد۔ امیر حسن سنجری۔ گلزارِ ابرار۔ محمد غوث مانڈوی۔ خیر المجالس۔ ملفوظات چراغ دہلی

ابھی منصور حلاج نے الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا تھا، بغداد میں جنید بغدادیؒ، سری سقطیؒ، معروف کرخیؒ مرجع خاص و عام بنے ہوئے تھے۔ ان کی صحبت میں ایک ایسے صوفی کا ذکر رہنے لگا جس کا بیشتر وقت بشر حافیؒ اور ذوالنون مصریؒ کی صحبت میں گزرتا تھا۔ ان کا نام تھا، ابوسعید خرازؒ، ابوسعیدؒ صوفی بھی تھے اور عالم بھی، زہد و ریاضت کے ساتھ ہی کتابیں لکھنے کا شوق بھی پورا کرتے رہتے اور یہ شوق ہی نہیں تھا، عشق تھا، ویسا عشق جو خدا سے لولگا کے صوفیائے کرام ظاہر کیا کرتے ہیں۔ آپ نے السیر نامی ایک کتاب لکھی تو بغداد کے علمی اور روحانی حلقوں میں زلزلہ آ گیا۔ السیر میں بندے اور خدا کے تعلق پر جس لب و لہجے میں بات کی گئی تھی، علما کے ساتھ ہی بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس کا برا مانا اور کفر کا فتویٰ دے دیا لیکن ابوسعیدؒ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

بغداد میں ایک آواز گونجنے لگی۔ "جب بندہ رجوع الی اللہ ہو کر اس سے رشتہ جوڑتے ہوئے قرب حاصل کر لیتا ہے تو اپنے نفس اور خدا کے علاوہ ہر شے کو فراموش کر دیتا ہے اور جب اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ تو کہاں ہے اور کیا چاہتا ہے؟ تو وہ جواب میں صرف اللہ

دنیا کی تاریکیوں میں علم کی شمع جلانے والے ایک منفرد انسان کا احوال

جیسے نیکی کے ساتھ بدی اور دن کے ساتھ رات پیدا کرکے اللہ نے بہت واضح پیغام دیا ہے کہ انسان اپنی صوابدید پر جو چاہے راستہ اختیار کرے۔ صحیح اور غلط کا فیصلہ تو روز حشر ہی ہوگا لیکن یہ پہلے ملنے والی مہلت انسان کے لیے آزمائش بھی ہے اور آخرت سنوارنے کا موقع بھی... جو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اللہ کی آزمائشوں پر پورا اترتے ہیں وہی اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صف میں شامل ہوتے ہیں... آپ کا تعلق بھی اولیا کے قافلے سے تھا جنہوں نے تصوف کی زبان میں حق بات کہی اور اس پر ڈٹے رہے... اور اسی استقلال نے آپ کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔

تصوف کی زبان

ضیا تسنیم بلگرامی



اللہ ہی کہتا ہے۔ اگر اس کے تمام اعضا کو گویائی عطا کردی جائے تو اس کے ہر عضو سے اللہ ہی اللہ نکلتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس کا ہر عضو نور سے پُر اور جذب سے لبریز ہو جاتا ہے اور اس کو وہ قرب حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کا اللہ کہنا گویا خدا کی زبان سے اللہ کہنا ہوتا ہے۔"

اس آواز نے ایک تہلکہ مچا دیا۔ ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ جذب و سوز سے خالی علما ابوسعیدؒ سے الجھنے لگے۔ وہ انہیں خوفزدہ کرنے لگے کہ "ابوسعیدؒ! تو بہک گیا ہے اور تو اپنے ہوش میں نہیں ہے۔"

لیکن ابوسعیدؒ کو ان میں سے کسی ایک کی بھی پروا نہیں تھی۔ آپ کے ہم عصر صوفی آپ کو منع کرتے کہ اس قسم کی باتیں مت لکھا کرو لیکن ابوسعیدؒ پر ان کی نصیحتوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک سرکاری عالم نے بشر حافیؒ سے پوچھا۔ "کیا ابوسعید خرازؒ آپ کی صحبت میں بھی اٹھتا بیٹھتا ہے؟"

بشر حافیؒ نے جواب دیا۔ "ہاں، ابوسعیدؒ ہمارے خاص ہم نشینوں میں ہے لیکن تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"

عالم نے کہا۔ "کیا آپ نے ابوسعیدؒ کی السیر بھی پڑھی ہے۔ آپ اس کی عبارت اور مضامین سے متفق ہیں؟"

"متفق نہ ہونا کیا معنی۔ اس میں کوئی شک وشبے کی بات تو ہے نہیں جس سے مجھے اختلاف ہو۔"

عالم نے کہا۔ "واہ جناب! آپؒ بھی انہی جیسی باتیں کرنے لگے۔"

بشر حافیؒ نے عاجز آ کر دریافت کیا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو، یہ تو معلوم ہو۔"

عالم نے جواب دیا۔ "ابوسعیدؒ اپنی تحریروں میں کفر بکتا ہے، وہ انسان کی زبان کو اللہ کی زبان قرار دیتا ہے۔ انسان مخلوق اور فانی ہے مخلوق اور فانی کی زبان اللہ کی زبان کس طرح ہو سکتی ہے۔"

بشر حافیؒ مسکرائے، فرمایا۔ "تمہاری باتوں کا میرے پاس جواب تو ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ تم ان باتوں کا جواب ابوسعیدؒ ہی سے مانگو کیونکہ اگر میں تمہیں سمجھاؤں گا تو اس سے تمہاری گمراہی کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے مگر ابوسعیدؒ کے سمجھانے سے یہ خطرہ ٹل جاتا ہے۔"

عالم جز بز ہو کر ابوسعیدؒ کے پاس پہنچ گیا اور یہی سوال ان سے کر دیا۔ بولا۔ "ابوسعیدؒ! تو اپنی تحریروں میں کفر کیوں بک رہا ہے؟ کیا فانی مخلوق کی زبان، لافانی باری تعالیٰ کی زبان ہو سکتی ہے؟"

ابوسعید نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اے عالم! میں خوب جانتا ہوں کہ یہ باریک نکتہ تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

عالم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "ابوسعیدؒ! تم علما کی بے عزتی کیوں کرتے ہو، علما نے تم صوفیوں کا کیا بگاڑا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک علما کا تعلق ہے تم صوفی ہمارے علما کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

ابوسعیدؒ نے جواب دیا۔ "میں ان کے مقابلے کی بات کر ہی کب رہا ہوں۔"

عالم نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں یہ جاننے آیا ہوں کہ انسان کی زبان خدا کی زبان کس طرح ہو سکتی ہے؟"

ابوسعیدؒ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "جب انسان ذکر و فکر میں خدا کا ہو جائے گا تو خدا اس کو تنہا کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟"

عالم نے طنز کیا۔ "جناب! کچھ بھی ہو، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ تم نے کفر بکا ہے اور تمہیں اس کی معافی مانگنا ہوگی، ورنہ میں تمہاری اس تحریر کے حوالے سے بغداد میں آگ لگوا دوں گا۔"

ابوسعیدؒ نے صبر و تحمل کی روش اختیار کی، جواب دیا۔ "میرے خدا نے مجھے صبر و تحمل کا حکم دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ میں بحث و مباحثے میں الجھ کر اپنا وقت نہ ضائع کروں۔"

عالم نے فاتحانہ انداز میں پوچھا۔ "تب پھر کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم بحث مباحثے سے صرف اس لیے بچنا چاہتے ہو کہ تمہارے پاس اپنے دفاع میں مضبوط دلیلیں نہیں ہیں۔"

ابوسعیدؒ کو غصہ آ گیا، بولے۔ "اے دشمن خدا! تو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے آج؟"

عالم نے بھی جوش میں کہا۔ "ابوسعیدؒ! دشمنِ خدا میں نہیں تم ہو، تم نے خدا کو انسانوں کی سطح پر لا کر کفر کیا ہے۔ تم باقاعدہ معافی مانگو... ورنہ میں تمہارے خلاف تحریک چلاؤں گا اور تمہیں رسوا کر دوں گا۔"

ابوسعیدؒ نے کہا۔ "اچھا تو ادھر میرے پاس آ، میں اپنی تحریروں کی صداقت ثابت کرتا ہوں۔"

عالم آپ کے روبرو بیٹھ گیا، بولا۔ "ثابت کرو، میں دیکھتا ہوں۔"

ابوسعیدؒ نے پوچھا۔ "تو عالم ہے یا نہیں؟"

عالم نے جواب دیا۔ "میں عالم ہوں اور عالم بزعم خود نہیں ہوں، مجھے پورا بغداد عالم سمجھتا ہے۔"

ابوسعیدؒ نے کہا۔ "اگر تو عالم ہے تو تو یہ بات بھی جانتا ہوگا کہ خدا خود کہتا ہے کہ سنت الٰہی کبھی نہیں بدلتی اور یہ سنتِ الٰہی کیا ہے؟ اس کائنات کی جملہ اشیا کے خواص اور فطرت۔ خود رسول مقبول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ پہاڑ نے اپنی جگہ سے حرکت کی ہے

تو اس پر یقین کرلو لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ کسی شخص نے اپنی فطرت بدل دی ہے تو اس پر ہرگز یقین نہ کرنا۔"

عالم نے اکتا کر کہا۔ "یہ ساری باتیں میری بات کا جواب تو نہیں ہیں۔"

ابوسعیدؒ نے جواب دیا۔ "میری بات صبر و تحمل سے سنو، میری سیدھی سادی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

عالم نے کہا۔ "اچھا کہو، میں سنتا ہوں تمہاری بات۔"

ابوسعیدؒ نے کہا۔ "جب یہ حقیقت ہے کہ سنت الٰہی نہیں بدلتی اور فطرت ناقابلِ تردید ہے تو میں، تم اور جو کچھ اس جہاں میں ہے، اس کُل کا ایک جزو ہے جسے "خالق، خدا، اللہ" کہتے ہیں تو اگر میں یہ کہوں کہ جس انسان کو اس کا قرب حاصل ہو جاتا ہے، اس کا اللہ کہنا، خدا کی زبان میں اللہ کہنا ہے، اور جب کوئی صاحب قرب، اللہ کہتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ فطرت خود اپنی حقیقت بتا رہی ہے۔ فطرت سچ بول رہی ہے لیکن میری ان باتوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان آلائشوں سے پاک ہو تو ان کی سمجھ میں ان باتوں کے مجرد مفہوم آسکتے ہیں۔"

عالم نے چڑ کر کہا۔ "ابوسعیدؒ! میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔ تم نے کفر کیا ہے، تم کو اس کا اقرار کرنا پڑے گا۔"

ابوسعیدؒ نے بڑی سنجیدگی اور افسوس سے کہا۔ "افسوس کہ تم اپنی بات کو دلائل سے نہیں سمجھا سکتے اور جب میں دلائل سے سمجھانا چاہتا ہوں تو تم اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ خیر، تمہاری مرضی۔"

عالم نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ "ابوسعیدؒ! میں تمہیں نہیں سمجھا سکتا کیونکہ تم لوگ کسی اور ہی دنیا کے باشندے معلوم ہوتے ہو۔"

عالم چلا گیا اور بعد میں آپ کے خلاف لوگوں میں نفرتیں پھیلاتا رہا مگر آپ کے طرز عمل اور فکری زاویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

آپؒ پر ذکر و فکر کا کچھ ایسا غلبہ طاری ہوا کہ دنیا و مافیہا کی فکر ہی نہ رہی۔ آپؒ کو دنیا کی کسی بات کا کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ اللہ کی یاد میں اس کی لو لگائے خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا رہتے۔ اس عالم میں آپؒ نے خواب میں دیکھا کوئی نورانی مجسمہ ان سے مخاطب ہے، اس نے آپؒ سے پوچھا۔ "ابوسعیدؒ! یہ تو ذکر و فکر میں کیوں مستغرق رہتا ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "یہ تو، تو میرے رب سے پوچھ کہ اس نے مجھے ازخود رفتہ کیوں کر دیا ہے۔"

نورانی مجسمے نے کہا۔ "عجیب بات ہے کہ جس بات کا جواب تو خود دے سکتا ہے اس میں خدا کو کیوں کھینچ رہا ہے۔"

آپؒ نے پوچھا۔ "تو کون ہے اور مجھ سے اس قسم کا سوال کیوں کر رہا ہے؟"

نورانی مجسمے نے جواب دیا۔ "میں فرشتہ ہوں۔"

آپؒ نے دریافت کیا۔ "تو میرے پاس کیا لینے آیا ہے؟"

فرشتے نے جواب دیا۔ "میں صدق کا مفہوم معلوم کرنے آیا ہوں۔"

آپؒ نے فرمایا۔ "ایفائے عہد کا نام صدق ہے۔"

فرشتے نے مزید سوال کیا۔ "یہ ایفائے عہد کیا چیز ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "انسان نے خدا سے روزِ ازل جو عہد کیا تھا اس کو پورا کرنا، اس پر قائم رہنا ہی ایفائے عہد ہے۔"

فرشتے نے کہا۔ "ابوسعیدؒ! واللہ تم نے صدق کا بہترین مفہوم بیان کیا ہے، اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انسانوں میں چند ہی ایسے ہیں جو صدق کے اصل مفہوم سے واقف ہوں گے۔"

آپؒ کی آنکھ کھلی تو بے اختیار سجدے میں گر گئے اور فرمایا۔ "بارالٰہا! یہ میری خوش قسمتی اور میرے حال پر تیری مہربانی ہی کا ثمرہ تو ہے کہ میں خواب میں بھی صدق کے مفہوم سے غافل نہیں رہتا اور سوتے میں بھی ایفائے عہد کا خیال رکھتا ہوں۔" فرط جوش سے آپؒ پر رقت طاری ہوگئی، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس قدر روئے کہ چادر تر ہو گئی اور دیر تک ہچکیاں اور سسکیاں لیتے رہے۔

چند دنوں بعد آپؒ کی یہ حالت ہوگئی کہ آپؒ پر پہلے سے زیادہ محویت طاری ہوگئی اور آپؒ کی زبان پر اللہ اللہ رہنے لگا۔ اسی عالم میں آپؒ نے ایک رات خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ رسول مقبول ﷺ نے آپ سے پوچھا۔ "ابوسعیدؒ! کیا تو مجھے دوست رکھتا ہے؟"

ابوسعیدؒ نے شرما کر جواب دیا۔ "یارسول اللہ ﷺ! اللہ کی دوستی اور اس کی یاد نے میرے دل میں اس طرح سرایت کیا ہے کہ وہاں کسی اور کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ افسوس کہ میں دروغ گوئی نہیں کر سکتا۔"

رسول اللہ ﷺ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ "اے ابوسعیدؒ! میں تیرے سچ سے خوش ہوا اور یہ نکتہ یاد رکھ کہ جس نے اللہ کو دوست رکھا، اس نے مجھے دوست رکھا۔"

آپؒ کا مارے خوشی کے حال ہی غیر ہو گیا اور ایک بار پھر دل پر شدید رقت طاری ہوگئی اور دیر تک آنسو بہاتے رہے۔

آپؒ کی صحبت میں ہر عمر کے لوگ بیٹھنے کی کوشش کرتے لیکن آپؒ ان سے حذر کرتے، جوانوں کو بھی آپ کی پُرسوز اور پُرکیف باتوں

میں بڑا مزہ آتا اور ان کا کہنا یہ تھا کہ ابوسعیدؒ کی پرکیف باتوں کا حقیقی اثر نوجوان دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ آپؒ نوجوانوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ نوجوانوں کی اصلاح یوں زیادہ ضروری ہے کہ بوڑھوں کی نسبت ان کا نامۂ اعمال ستھرا ہوتا ہے۔

آپ نے عالم رویا میں دیکھا کہ ابلیس، آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ آپ غصے میں ڈنڈا لے کر اس کی طرف بڑھے اور للکار کر کہا۔ ''ذرا ٹھہر تو، میں تیرا کام تمام کردوں گا۔''

ابلیس پر آپؒ کی للکار کا کوئی اثر نہ ہوا، جواب میں آپ نے ایک آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ''ابوسعیدؒ! تم ڈنڈے سے ابلیس کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہو؟ یہ تمہارا خیالِ خام ہے۔''

آپ نے عاجزی سے پوچھا۔ ''بارالٰہا! پھر یہ کس طرح خوفزدہ ہوگا؟''

جواب ملا۔ ''ابلیس تو قلب مومن کے نور سے ڈرتا ہے۔''

آپ کو بیداری کے بعد یہ احساس ہوا کہ کیا میرا قلب مومن کا قلب نہیں ہے؟ کیا ابلیس میرے قلب سے ڈرتا ہے؟ لیکن ان وسوسوں اور خدشوں کا آپ کے پاس کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ آپ ایک عرصے تک اسی گومگو میں رہے۔ آخر ایک بار آپ نے مراقبے میں ابلیس کو آواز دی۔ ''ابلیس! کیا تو میرے آس پاس کہیں موجود ہے؟''

آپ کو کوئی جواب نہیں ملا۔

آپ نے ایک بار پھر آواز دی۔ ''ابلیس! میں تجھے آواز... دے رہا ہوں، کیا تو میری آواز سن رہا ہے؟ تو کہاں ہے؟ مجھے آواز... دے، میں تیری آواز سننا چاہتا ہوں۔''

کہیں دور سے آواز آئی۔ ''ابوسعیدؒ! میں تم سے بہت دور ہوں۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''تو میرے قریب آجا، میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

دور سے جواب ملا۔ ''ابوسعیدؒ! افسوس کہ میں تمہارے پاس نہیں آسکتا۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''تجھے میں بلا رہا ہوں، پھر میرے پاس آنے میں تامل کیوں ہے؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''تامل یوں ہے کہ تم تارک الدنیا ہو، اور تمہارے قلب میں مومن کا نور پایا جاتا ہے اور میں تارک الدنیا لوگوں سے دور رہتا ہوں، پھر تمہارے قلب میں مومن کا نور بھی ہے اس لیے پاس آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''اگر میں تجھے اپنے پاس بلانا چاہوں تو اس کا بھی کوئی طریقہ ہے؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''ہاں، میرے لیے تمہارے حالات میں ذرا سی گنجائش موجود ضرور ہے، اگر کبھی تم پھسلے تو میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔''

ابوسعیدؒ نے پوچھا۔ ''میں کس طرح یہ یقین کروں کہ تم کبھی میرے پاس بھی آسکتے ہو؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''ابوسعیدؒ! میں سیدھی سی بات جانتا ہوں تم نوجوانوں کی اصلاح پر توجہ دیتے ہو، اور میں اس میں اپنی کامیابی دیکھ سکتا ہوں۔ نوجوانوں کی موجودگی میں، میں ہر وقت پرامید رہتا ہوں کہ کبھی تو میں کامیابی حاصل کروں گا۔ میں مایوس نہیں ہوں۔''

ابوسعیدؒ نے پوچھا۔ ''یہ نوجوان لوگ تجھے کس طرح پُرامید رکھتے ہیں؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''ابوسعیدؒ! میں خوب جانتا ہوں کہ جب تک نوجوان تیری صحبت میں موجود ہیں، میری کامیابی کا امکان موجود رہتا ہے۔ میں تمہارے اس محاذ کی کمزوری کا احساس رکھتا ہوں اور اس کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ کبھی نہ کبھی کامیاب بھی ہو جاؤں گا۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''تو انتظار کرتا رہ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ میرا خدا مجھے مایوس اور شرمندہ نہیں کرے گا۔''

اس کے بعد ابلیس نے بھی سکوت اختیار کیا۔ آپ بھی چپ ہو رہے۔

آپ کے دو بچے تھے جن سے آپ بڑی محبت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک سخت بیمار پڑا۔ آپ کو اس کی بیماری کا صدمہ تو بہت ہوا لیکن آپ نے صبر و ضبط سے کام لیا۔ آپ ڈر رہے تھے کہ کہیں بیٹے کی محبت آپ کے حق میں بلائے جاں اور بلائے ایمان نہ ثابت ہو۔ بیمار بیٹا لیٹا لیٹا آپ کی صورت دیکھتا رہتا اور اس صدمے کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا، جو آپ کے دل اور دماغ کو ہلائے دے رہا تھا لیکن باپ کے چہرے پر کسی قسم کا رنج و غم نہیں پایا جاتا تھا۔ بیٹے کو باپ کے اس سکون اور اطمینان پر بڑا دکھ ہوا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں، گویا سویا ہوا ہو۔ وہ باپ سے کسی قسم کی بات تک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابوسعیدؒ بیٹے کی بند آنکھیں دیکھ کر گھبرا اٹھے، سرہانے کھڑے ہو کر مضطربانہ آواز دی۔ ''بیٹے! کیا بات ہے؟ کیسی طبیعت ہے؟ کیا تکلیف بڑھ گئی ہے؟''

بیٹے نے نہ تو آنکھ کھولی اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ آپ اور زیادہ گھبرا گئے، پھر آواز دی۔ ''بیٹے! کیا بات ہے تو جواب کیوں نہیں دیتا؟ اب تکلیف کا کیا حال ہے؟''

بیٹے نے ڈبڈبائی آنکھیں کھول دیں، آہستہ سے جواب دیا۔ ''باواجان! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اس احساس نے میرے دکھ اور تکلیف میں اور زیادہ اضافہ کردیا ہے کہ آپ کو میری کوئی فکر نہیں، آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

ابوسعیدؒ کا پیمانۂ صبر چھلکنے لگا، بہ مشکل طبیعت پر قابو پاکر جواب دیا۔ ''میرے بیٹے! یہ تو کیسی باتیں کررہا ہے؟ میں تیرا باپ ہوں۔ کیا میں تجھ سے محبت نہیں کرتا؟ کیا میں تجھ میں دلچسپی نہیں لیتا؟ تو یہ مہمل اور فضول باتیں کیوں سوچتا ہے؟''

بیٹا زاروقطار رو رہا تھا، اس نے ہچکیوں میں جواب دیا۔ ''باواجان! میں مر رہا ہوں لیکن آپ کا چہرہ پرسکون ہے۔ میں آخری ہچکی لینے کی حالت میں ہوں لیکن آپ مطمئن ہیں۔ ایسا کیوں ہے، آخر ایسا کیوں ہے؟''

ابوسعیدؒ نے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور رقیق لہجے میں کہا۔ ''بیٹے! تجھے ایسی باتیں نہیں سوچنا چاہئیں۔ میں تجھ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔''

بیٹا بھی بڑا ہی منطقی تھا، بولا۔ ''اچھا باواجان! اب آپ ایک بات تو بتائیے، کیا میں آپ سے یہ معلوم کرسکتا ہوں کہ یہ ایک ہی دل میں دو محبتیں کس طرح جمع ہوسکتی ہیں؟ اسی ایک دل میں میری محبت بھی ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہے۔ اب ان دو میں سے کسی ایک کی محبت کا تو آپ دعویٰ کرسکتے ہیں لیکن دونوں کی محبت کا دعویٰ ہرگز نہیں کرسکتے۔''

ابوسعیدؒ کو رونا آگیا، کہا۔ ''بیٹے! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کر، ورنہ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھوں گا۔''

بیٹے نے کرب سے منہ بنایا اور عرض کیا۔ ''باواجان! یہ میری آخری سانس معلوم ہوتی ہے۔ میں کیا کروں؟''

ابوسعیدؒ نے جواب دیا۔ ''بیٹے! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باواجان! میں نے جو کچھ کہا، درست کہا ہے۔''

ابوسعیدؒ نے لجاجت سے کہا۔ ''بیٹے! خدا کے لیے تو مایوس نہ ہو۔ خداتعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے... خدا کی رحمت کی طرف سے مایوس نہ ہو۔''

بیٹے نے کہا۔ ''باواجان! میں مایوس کب ہوں؟ میں پرامید ہوں اور مجھے اپنے آپ پر اعتماد بھی ہے کہ میں نہ تو خود پشیمان ہونا پسند کرتا ہوں اور نہ ہی آپ کو شرمندہ کراؤں گا۔ آپ مطمئن رہیں باواجان! اور ذرا بھی پریشانی کو دل و دماغ میں داخل نہ ہونے دیں۔''

ابوسعیدؒ نے بیٹے کی پیشانی چوم لی، بولے۔ ''بیٹے! کیا میں اپنے سکون کی خاطر تیرا غم بھی نہ مناؤں؟ واللہ! اگر تو نے اپنی مرضی کی تو میں بھی اپنی مرضی کرلوں گا۔'' اس کے بعد انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور عرض کیا۔ ''خدایا! تو جانتا ہے میں تیرا کیسا بندہ ہوں، پھر اپنے عاجز بندے کا تو کسی قسم کا غم کیوں نہیں بٹوا دیتا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیا میں اپنے بیمار بیٹے کی خاطر دنیا کی ساری چیزیں چھوڑ دوں؟ الٰہ العالمین! میں کیا کروں؟''

بیٹے کی حالت ایک دم بگڑنے لگی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی اور آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ اس وقت ابوسعیدؒ مسجد میں تھے۔ کسی نے مسجد ہی میں بیٹے کی غیر حالت کی اطلاع دے دی۔

آپ نے جواب دیا۔ ''لوگو! اللہ کی مرضی مقدم ہے، میں کسی پر کسی قسم کا الزام نہیں دوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جن حالات سے میں اور میرا بیٹا گزر رہا ہے اس میں صبر و تحمل بڑی مشکل چیز ہے لیکن میں پھر بھی اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کررہا ہوں۔''

اس کے بعد آپ مسجد سے باہر آئے اور گھر کے لیے روانہ ہوگئے لیکن آپ بہت مضطرب اور بے چین سے نظر آرہے تھے۔ آپ پاؤں رکھتے کہیں تھے اور وہ پڑتے کہیں تھے۔ پھر یکایک آپ کو جیسے ہوش آگیا، بولے۔ ''میرا بیٹا کہاں ہے؟''

کسی نے جواب دیا۔ ''اپنے گھر میں۔''

آپ نے پھر صبر و تحمل کا دامن پکڑا، بڑے سکون سے کہا۔ ''کیا اس کی حالت روبہ صحت ہے؟''

ایک شخص نے جی کڑا کرکے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ اپنے بیٹے کی روبہ صحت حالت کا ذکر فرما رہے ہیں لیکن جہاں تک اس عاجز کا تعلق ہے، یہ جانتا ہے کہ آپ کے صاحبزادے کی حالت اتنی خراب ہے، اتنی خراب ہے کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔''

آپ گھر میں داخل ہوئے تو ہر ایک کو روتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے ترش لہجے میں پوچھا۔ ''وہ زندہ ہے یا مر گیا؟''

کسی نے جواب دیا۔ ''میاں جی! اس کا انتقال ہوگیا۔''

آپ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے اس آزمائش میں مجھے سرخرو کیا، تیری امانت تھی، تو نے واپس

لے لی۔ اب میں کس کا ماتم کروں؟ اور کس کا گلہ؟“

بیوی نے روتے ہوئے شکایتاً کہا۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم اگر چاہتے تو میرا بچہ زندہ ہوتا۔“

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ”نیک بخت! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم مستجاب الدعوات تھے۔ تم اگر اپنے بیٹے کے حق میں دعائے صحت کرتے تو میرا بیٹا ضرور اچھا ہو جاتا لیکن تم نے یہ نہیں کیا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو یہ کیسی باتیں کر رہی ہے آج۔ اس کی زندگی پوری ہو چکی تھی۔ پھر یہ کہ مشیتِ ایزدی یہی تھی۔ میں دعا مانگ کر اس میں کیا اور کیوں دخل دیتا۔“

بیوی نے آنچل میں چہرہ چھپالیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم صرف باپ ہو، اے کاش تم ماں ہوتے تو بیٹے کے غم کا اندازہ ہوتا۔“

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ آپ حیران اور پریشان بیوی کی صورت دیکھنے لگے۔ پھر اچانک مرحوم بیٹے کا خیال آ گیا۔ آپ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھے، بیٹے کے چہرے پر سے چادر سرکائی اور اس کو نظر بھر کر دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ فرمایا۔ ”بیٹے! میں جانتا ہوں کہ تو اپنے خالقِ حقیقی کے بلاوے پر اس کے پاس چلا گیا ہے۔ تو ہی بتا میں تجھے کس طرح روکتا؟ تیری ماں کہتی ہے کہ میں تجھے روک سکتا تھا مگر نہیں روکا۔ آہ میں کتنا مجبور اور بے بس انسان ہوں۔ میری دعا ہے کہ خدا تجھے خوش رکھے اور تجھ سے راضی رہے۔“

اس کے بعد آپ نے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

چند دنوں بعد آپ نے مرحوم بیٹے کو خواب میں دیکھا، بے چینی سے پوچھا۔ ”بیٹے! تو خوش تو ہے؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”میں بہت خوش ہوں، بابا جان!“

آپ نے پوچھا۔ ”خدا نے تیرے ساتھ کیسا سلوک کیا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”بہت اچھا، اس نے مجھے اپنا قرب عطا فرما دیا ہے۔“

آپ نے بے ساختہ کہا۔ ”زہے نصیب، یہ وہ مرتبہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے برگزیدہ لوگ اس کی تمنا لیے ہوئے قبر میں جا سوتے ہیں اور اس کا قرب نہیں حاصل ہوتا اور تجھے اس کا قرب حاصل ہو گیا۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”بابا جان! اس میں مجھے آپ کا تعاون بھی حاصل تھا ورنہ شاید میں یہ مرتبہ حاصل نہ کر سکتا۔“

آپ نے بیٹے سے کہا۔ ”بیٹے! اپنے باپ کو کوئی نصیحت کر۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”بابا جان! بددلی سے عبادت نہ کیجیے اور جسم پر جو لباس موجود ہو، اس کے علاوہ کوئی لباس پاس نہ رکھیے۔ اگر میری اس نصیحت پر آپ نے عمل کیا تو آپ کو وہ مرتبہ حاصل ہو جائے گا کہ بہتوں نے زندگی بھر عبادت کر کے بھی نہ حاصل کیا ہوگا۔“

جب آپ کی آنکھ کھلی تو یوں محسوس کیا گویا پورا... کمرا خوشبو سے مہکا ہوا ہے۔

تنگی اور عسرت میں سالہا سال گزار کر آپ نے اپنے بیوی بچوں کے لیے خدا سے کچھ طلب کرنا چاہا۔ آپ کو یقین تھا کہ خدا آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ آپ خشوع و خضوع سے جب خدا کی بارگاہ میں سربسجود ہوئے اور خدا سے کچھ مانگنا چاہا تو اندر سے ایک ایسی آواز سنائی دی جو پہلے کبھی نہیں سننے میں آئی تھی۔ یہ آواز کہہ رہی تھی۔ ”ابوسعیدؒ! خدا کا قرب حاصل کرنے کے بعد اس سے اتنی معمولی چیز مانگنا افسوس ناک بات ہے۔ اللہ سے اگر کچھ مانگنا ہی ہے تو اس سے اللہ کے سوا مانگنا شرمناک ہے۔“

آپ رونے لگے اور رو رو کر خدا سے اپنی اس غلطی کی معافی مانگنے لگے کہ ان کے دل میں خدا سے کچھ مانگنے کی خواہش پیدا ہی کیوں ہوئی؟ آپ نے رو رو کر اپنے دونوں رخسار تر کر لیے اور یہ عہد کر لیا کہ وہ آئندہ خدا سے کچھ بھی نہ مانگیں گے۔

ایک بار آپ دورانِ سفر جنگل سے گزر رہے تھے۔ سامانِ سفر میں آپ کے پاس کھانے کو کھجور تک نہ تھی اور کئی دن کے فاقوں نے حالت غیر کر رکھی تھی۔ نفس نے سرکشی اختیار کی اور اس نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ کھانے کے لیے خدا سے رزق طلب کریں لیکن آپ نے اپنے نفس کو سختی سے جھڑک دیا اور کہا۔ ”اے نفس! میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ میں اس سے کچھ بھی نہ مانگوں گا۔ پھر میں اس سے رزق کیوں طلب کروں؟“

نفس نے خوشامد کی، کہا۔ ”کئی دن کے فاقوں نے اعضائے جسمانی کو بیکار اور معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر رزق نہیں مانگتے تو نہ سہی اس سے صبر کی توفیق ہی مانگ لو۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے نفس! تو مجھے یہ کیسے الٹے سیدھے مشورے دے رہا ہے۔ جب میں نے ایک بات تجھ پر واضح کر دی ہے کہ میں اپنے اللہ سے کچھ بھی نہ مانگوں گا تو اس وقت اس سے رزق یا صبر کی توفیق کیوں مانگوں، میرا خالق دلوں کے حال جانتا ہے، وہ

انسانوں کی ضروریات اور احتیاجات کا علم رکھتا ہے تو میں اس سے کیا مانگوں؟ اب تو اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بھی میں شرم محسوس کرتا ہوں۔"

آپ فاقوں کی اذیتیں برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ ایک منزل پر آپ نے پڑاؤ کیا۔ اس پڑاؤ کے پاس ہی کھجوروں کا ایک باغ تھا جو کھجوروں سے لدا ہوا تھا۔ آپ نے اس باغ پر سرسری نظر ڈالی اور وہاں پڑاؤ کرنے کے بجائے قریب کے جنگل میں واپس چلے گئے۔ کسی شخص نے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرا نفس ایک گونہ سکون اور خوشی محسوس کر رہا ہے اور میں اسے اس خوشی اور سکون کی سزا دینا چاہتا ہوں۔"

آپ جنگل میں قیام فرما ہو گئے۔ ابھی آپ کو قیام کیے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک شخص آپ کو تلاش کرتا ہوا جنگل میں پہنچ گیا اور پوچھا۔ "جناب! کیا ابوسعیدؒ آپ ہی کا نام ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، کیوں؟ تجھے میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟"

اجنبی نے کہا۔ "اگلے پڑاؤ پر میں ایک قافلے کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا کہ کسی آواز نے مجھے ہدایت کی کہ جنگل میں جا، وہاں ابوسعیدؒ نامی ایک شخص چھپا ہوا ہے، تو اسے اپنے ساتھ قافلے میں لے آ۔"

ابوسعیدؒ نے پوچھا۔ "اس آواز نے اور کیا کہا؟"

اجنبی نے جواب دیا۔ "اس آواز نے اور جو کچھ کہا، میں بیان نہیں کروں گا۔"

ابوسعیدؒ نے کہا۔ "میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اس سے میں یہ اندازہ لگاؤں گا کہ وہ آواز کس کی ہے اور اس کو مجھ سے کس حد تک محبت ہے۔"

اجنبی نے جواب دیا۔ "اس آواز نے مجھ سے کہا کہ ابوسعیدؒ میرا متوکل بندہ ہے، وہ انتہائی بھوکا ہونے کے باوجود کھجوروں.. کا باغ دیکھ کر بھاگ گیا اور کھجوروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔"

ابوسعیدؒ کو اندازہ ہو گیا کہ یہ آواز خدا کی طرف سے تھی اور خدا کو ان کی احتیاج اور حالت زار پر رحم آ گیا ہے۔ آپ اس شخص کے ساتھ ہو لیے اور اس پڑاؤ پر پہنچ گئے جہاں اب ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا اور ہر طرف چہل پہل ہو رہی تھی۔ اجنبی میزبان نے آپ کی شاندار ضیافت کی، آپ کھاتے جاتے اور اپنے رب کا شکر ادا کرتے جاتے۔

آپ کا یہ قاعدہ تھا کہ دور دراز کی سیاحت اس لیے اختیار فرماتے کہ بزرگانِ دین کے مزارات کی زیارت ہو جاتی اور جو بزرگ زندہ ہوتے ان سے ملاقات ہو جاتی۔ آپ اس مقصد سے سفر فرما رہے تھے کہ ایک دریا کے کنارے کشتی کے انتظار میں رک گئے۔ آپ کو انتظار کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی لیکن کشتی نہیں آئی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ رات اس کنارے پر گزارنا ہو گی کیونکہ رات کو کشتی ملنے کا کوئی امکان نہیں۔ آپ اس فکر میں تھے کہ آپ نے اپنے سے ذرا فاصلے پر ایک سایہ سا محسوس کیا۔ آپ اس سائے کے پاس چلے گئے اور اس خیال سے کہ شاید وہ بھی کشتی کے انتظار میں بیٹھا ہے، سوچا کہ چلو اس سے کچھ باتیں ہی ہو جائیں گی۔ لیکن جب قریب پہنچے تو پتا چلا کہ وہ کوئی مسافر نہیں۔ وہ ساحلی ریت پر بڑی شانِ استغنا سے بیٹھا تھا۔ دوات اس کے داہنی طرف رکھی تھی، زانو پر کوئی کاپی یا کتاب رکھی تھی اور قلم ہاتھ میں لیے وہ کچھ سوچنے میں محو تھا۔ آپ کو حیرت تھی کہ یہ شخص اندھیرے میں کس طرح اور کیا لکھ رہا ہو گا۔ جب آپ بالکل اس کے سر پر پہنچ گئے تو دریافت کیا۔ "اے شخص! تو کون ہے اور یہاں اندھیرے میں کیا کر رہا ہے؟"

اس شخص نے نظر اٹھا کر آپ کی طرف دیکھا بھی نہیں، جواب دیا۔ "ابوسعیدؒ! تم کشتی کا انتظار کرو، میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟"

ابوسعیدؒ نے حیرت سے پوچھا۔ "تم کو میرا نام کس نے بتایا؟"

اس نے جواب دیا۔ "میرا دل آئینے کی طرح ہے جس میں ہر شخص اپنے نام اور کردار کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ اس لیے نام اور کام پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔"

ابوسعیدؒ نے خوب اچھی طرح سمجھ لیا کہ یہ شخص اللہ والوں میں سے ہے اور قربِ خداوندی کا حامل ہے۔ آپ نے بڑے ادب سے پوچھا۔ "حضرت! معاف کیجیے گا۔ میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ کیا میں آپ کا تعارف حاصل کر سکتا ہوں؟"

اس نے جواب دیا۔ "تعارف؟ کیسا تعارف؟ کس کا تعارف؟ میں نے تم سے تعارف نہیں چاہا تھا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اے شخص! میں جانتا ہوں کہ آپ کو خدا کا قرب حاصل ہے۔ لیکن میں اس سے زیادہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

اس نے کہا۔ "جا بابا! اپنا کام کر، مجھے تنگ کرنے سے کیا حاصل؟"

آپ کا اضطراب اور تجسس بڑھتا رہا، پوچھا۔ "جب تک میں آپ کا تعارف نہ حاصل کر لوں، مزید کوئی اور بات نہیں کروں گا۔"

اس شخص نے کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ اس وقت زیادہ اندھیرا ہو چکا تھا۔ ابوسعیدؒ کو حیرت تھی کہ آخر اس اندھیرے میں یہ لکھ کس طرح رہا ہے، آپ نے کہا۔ ”میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آپ اندھیرے میں کیا اور کس طرح لکھ رہے ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں کیا اور کیونکر لکھ رہا ہوں۔ اس کا میں کیا جواب دوں، خود دیکھ لے۔“

آپ نے جھک کر کتاب کی طرف دیکھا۔ اس پر نورانی شعاعیں پڑ رہی تھیں اور وہ لکھ رہا تھا۔ ”ابوسعیدؒ اپنے دل میں سوچ رہا ہے کہ مجھ سے معلوم کرے، خدا سے ملنے کا کیا طریقہ ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا جواب دوں لیکن اگر کوئی مجھ سے یہی سوال کرے تو میں یہی جواب دیتا کہ اس سے ملنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو عام راستہ ہے اور دوسرا خاص راستہ۔ عام راستہ عام لوگوں کے لیے ہے اور خاص راستہ خاص لوگوں کے لیے۔“

آپ کتاب پر روشنی دیکھ کر مبہوت رہ گئے، بولے۔ ”کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کتاب پر یہ روشنی کیسی ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”تو کتاب کی بات کر رہا ہے، میں تو یوں ہی کہہ رہا ہوں۔ اگر روشنی ہی دیکھنی ہے تو ذرا آنکھیں بند تو کر، پھر دیکھ تماشا۔“

آپ نے اپنی طرف سے کہا۔ ”میں سمجھ گیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ دراصل تو اپنی روحانیت کا اس طرح سکہ جما کر مجھے مرعوب اور گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں کسی کے بھی رعب میں نہیں آؤں گا۔“

اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ابوسعیدؒ! نہ تو میں نمائشی عبادت اور ریاضت کرتا ہوں اور نہ ہی پسند کرتا ہوں۔ تم نے اس وقت میری ہمت اور مرتبے کا اندازہ لگانا چاہا لیکن میں جو کچھ ہوں، تم نہیں جان سکتے کیونکہ تم نے جس طرح خدا کا قرب حاصل کیا ہے۔ وہ ایک عام راستہ ہے، حالانکہ تجھے خاص راستہ زیب دیتا تھا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”خدا تک پہنچنے کا عام راستہ کون سا ہوتا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”یہ کہ میں نے اپنی عبادت کو کبھی بھی ذریعۂ وصال نہیں بنایا، جب کہ تم نے یہی کیا ہے۔ تم دولت کو حجاب تصور کرتے ہو جبکہ میں یہ نہیں سمجھتا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! تو باتیں تو بڑے کام کی اور حیرت انگیز کر رہا ہے، اب میں تجھ سے کیا باتیں کروں۔“

اس نے طنزاً کہا۔ ”بس، دے گئی ہمت جواب۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے حقیقت بیان کردی، کیونکہ میں نے تجھے اتنا ہی سمجھا تھا۔“

اس شخص نے کہا۔ ”بابا! جس کی جتنی استطاعت اور مقدرت ہے اتنی ہی اس کی رسائی اور پہنچ ہے، اب میں اور کیا کہوں۔“

آپ نے کہا۔ ”تو نے عبادت کو ذریعۂ وصال نہیں بنایا، یہ کیوں؟ اور وصال عبادت کے بغیر کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ابوسعیدؒ! یہ تو تم خود بھی تسلیم کرو گے کہ عبادت سے وصال حاصل کرنا ایک عمومی راستہ ہے، حالانکہ میں خود عبادت نہیں کرتا بلکہ میرا ہر بُنِ مُو مستقل عبادت بن گیا ہے، اس لیے مجھے عبادت کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ جب اللہ کا کوئی بندہ اپنے ہر بُنِ مو سے اس کی عبادت کرتا ہے تو گویا وہ ذاتِ حقیقی میں گم ہو جاتا ہے اور اسے اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ظاہری عبادت بھی کرے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اچھا، یہ بتاؤ کہ دولت حجاب کیوں نہیں ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ابوسعیدؒ! ہر چیز کا افادہ اور نقصان دو طرح سے ہوتا ہے۔ چھری سے چاہو تو سبزی کاٹ لو، چاہو تو پیٹ چاک کردو۔ یہ دونوں ہی کام چھری انجام دے سکتی ہے، چنانچہ اگر چھری کو اس لیے مسترد کر دیا جائے کہ اس سے پیٹ چاک کر دیے جاتے ہیں تو پھر اس کا افادی پہلو ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ہمیں اس کے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھ کر کام لینا ہوگا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم دولت کو بھی مفید سمجھتے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس میں کیا شک، دولت کو خدا کے نام پر خرچ کر کے جنت میں مقام حاصل کر سکتے ہو، دولت سے نہریں باغات مدرسے بنوا کر صدقۂ جاریہ جاری کر سکتے ہو۔“

ابوسعیدؒ خاموش ہو گئے۔ اس شخص نے آپ کے فکر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ آپ کا اندازِ فکر ہی بدل دیا تھا۔ اس رات آپ اسی درویش کی صحبت میں رہے اور اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

آپؒ بغداد سے دور کسی جنگل سے گزر رہے تھے۔ اچانک کسی گوشے سے غرانے کی آواز سنائی دی۔ آپ نے ادھر توجہ ہی نہیں دی اور سفر کرتے رہے۔ ابھی آپ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ان غراہٹوں میں اضافہ ہو گیا۔ یہ بہت سے کتوں کی غراہٹ تھی۔ آپ نے غیر ارادی طور پر اس طرف دیکھا جدھر سے کتوں کے غرانے کی آواز آرہی تھی۔ آپ نے دیکھا دس...... شکاری کتے آپ کی طرف بڑھے چلے

آ رہے ہیں۔ آپ ذرا بھی نہیں گھبرائے، کتے دم بدم قریب آتے جا رہے تھے۔ آپ نے وہیں مصلیٰ بچھا دیا اور مراقبہ اختیار کیا۔ آپ کو کچھ پتا نہیں چلا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔

دس کتے بھونکتے ہوئے آپ کی طرف بڑھے لیکن آپ جیسے ہی مراقبے میں گئے، ان میں کا ایک سفید کتا ان سے الگ ہو گیا اور اپنے ساتھیوں پر جھپٹا۔ نو کتوں نے اس کا مقابلہ کیا لیکن سفید کتا ان سب سے زیادہ طاقتور تھا، اس نے اپنے ساتھی کتوں پر شیر کی طرح حملہ کیا اور ذرا سی دیر میں انہیں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ جب وہ بھاگ گئے تو سفید کتا آپ کے پیچھے اس طرح آ بیٹھا گویا ابوسعیدؒ کا محافظ ہے۔ آپ جتنی دیر مراقبے میں رہے سفید کتا پہرا دیتا رہا۔ کافی دیر بعد جب آپ نے مراقبے سے فراغت حاصل کی اور چلنے کے لیے کھڑے ہوئے تو سفید کتا بھی آپ کے ساتھ چل پڑا اور جب تک ابوسعیدؒ کا سفر جنگل میں رہا، کتا آپ کے ساتھ رہا۔ جب جنگل کی حدود سے نکل گئے تو کتے نے آپ کی طرف الوداعی نظر ڈالی، بھونکا اور کھڑے ہو کر دم ہلانے لگا۔

آپ نے مڑ کر کتے کی طرف دیکھا اور محبت سے فرمایا۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔''

لیکن وہ کتا اس وقت تک اپنی جگہ پر کھڑا رہا جب تک آپ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔

یہ عباس مہدی کا زمانہ تھا۔ اس نے آپ کی تحریریں پڑھی تھیں اور ان تحریروں سے اسے بڑا غصہ آیا تھا۔ اس نے ایک ملازم کے ذریعے آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ آپ نے دربار میں جانے سے انکار کر دیا اور کہلوا دیا کہ ''خلیفہ سے کہہ دینا، ایک فقیر کا دربار میں حاضری دینا تقویٰ کے خلاف ہے۔''

جب ملازم نے خلیفہ تک آپ کی بات پہنچائی تو وہ بہت ناراض ہوا۔ اس نے حکم دیا۔ ''ابوسعیدؒ کو دربار میں زبردستی لایا جائے۔''

شاہی پیادے آپ کو گرفتار کرنے پہنچ گئے۔ آپ نے انہیں بھی یہی جواب دیا.... ''میں خلیفہ کے پاس نہیں جاؤں گا کیونکہ ایسا کرنا تقویٰ کے خلاف ہے۔''

شاہی پیادوں نے جواب دیا۔ ''حضرت! ہم خلافت کے ملازم ہیں، اگر آپ اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوئے تو ہمیں مجبوراً آپ کو زبردستی لاد کر لے جانا پڑے گا اور اگر ہمیں ایسا کرنا پڑے تو ہم اپنے اس فعل پر بہت شرمندہ ہوں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن، افسوس کہ میں بخوشی دربار نہیں جاؤں گا کیونکہ ہم فقرا اسے تقویٰ کے خلاف تصور کرتے ہیں۔''

پیادوں میں سے ایک نے جھپٹ کر آپ کو گرا دیا اور بقیہ نے آپ کو باندھ لیا اور پھر وہ سب زبردستی آپ کو لے کر دربار کی طرف روانہ ہو گئے۔ عباس مہدی بڑی بے چینی سے آپ کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ پیادوں نے آپ کو جیسے خلیفہ کے قدموں میں لا پٹخا، تھوڑی دیر تک وہ یہی نہیں سمجھ سکا کہ یہ ابوسعیدؒ ہیں جو باندھ کر لائے گئے ہیں اور انہیں خلیفہ کے قدموں میں پٹخ دیا گیا ہے۔ خلیفہ نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟ ابوسعیدؒ کہاں ہیں جن کا میں انتظار کر رہا ہوں۔''

ایک نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! یہی تو ابوسعیدؒ ہیں۔''

خلیفہ نے حیرت سے کہا۔ ''یہ ابوسعیدؒ ہیں؟ واللہ یہی ابوسعیدؒ ہیں؟ لیکن یہ اس طرح کیوں لائے گئے ہیں؟''

اسی پیادے نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! یہ شخص کہتا تھا کہ خلیفہ کے پاس جانا فقرا کے تقویٰ کے خلاف ہے، میں نہیں جاؤں گا اور جب اس نے انکار کیا تو ہم لوگ اسے زبردستی اٹھا لائے۔''

خلیفہ نے ان کی تعریف کی، بولا۔ ''تم لوگوں نے وہ کام کیا ہے کہ اس کے عوض میں تم سب کو بڑے سے بڑا انعام دے سکتا ہوں۔ خیر ابھی تو تم لوگ جاؤ، میں انعام کے لیے دوبارہ تمہیں بلوالوں گا۔''

پیادے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی خلیفہ نے ابوسعیدؒ کو اپنے ہاتھوں سے کھولا اور کہا۔ ''ابوسعیدؒ! مجھے افسوس ہے کہ میرے پیادوں نے آپ کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔''

آپ نے ترشی سے جواب دیا۔ ''اپنے یا اپنے پیادوں کے اس ناشائستہ رویے پر افسوس نہ کر، کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا، اس میں تیرا حکم اور تیری رضا شامل تھی۔ یہ کام اگر وہ اپنی مرضی سے انجام دیتے تو واقعی تیرا یہ افسوس تجھ پر پھب جاتا لیکن ایسا نہیں ہے۔''

خلیفہ نے تلخی سے کہا۔ ''ابوسعیدؒ! یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ کیا تم آدابِ شاہی سے بھی واقف نہیں، جو اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔''

ابوسعیدؒ نے جواب دیا۔ ''میرا اور تمہارا بلکہ ساری دنیا کا ایک ہی بادشاہ ہے اور میں اس کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں۔ اس کی شان میں کبھی کوئی گستاخی نہیں کرتا۔''

عباس مہدی نے کہا۔ ''تم سخت گستاخ ہو، میں امیر المومنین ہوں۔ کیا تم یہ ذرا سی حقیقت بھی نہیں جانتے؟''

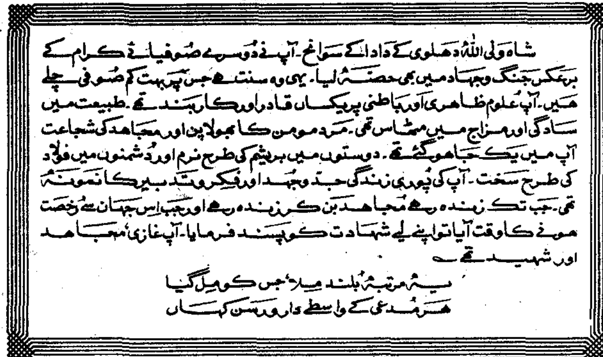
آپ نے جواب دیا۔ ''میں تجھے امیر المومنین نہیں سمجھتا کیونکہ تو نے مومنوں کے حقوق غصب کیے ہیں، مسلمانوں کے حقوق کا

اختلاف کیا ہے، پھر میں تمہیں کس طرح اپنا اور مسلمانوں کا امیر کہہ سکتا ہوں۔"
عباس مہدی کے لیے اب مزید برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا، اس نے غصے میں آپ کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔ آپ کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ ناک صاف کرتے ہوئے بولے۔ "عباس مہدی! یہ تو نے کیا کر دیا؟ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، تو نے میرا نہیں، اپنا خون بہایا ہے۔"
خلیفہ نے غصے میں پوچھا۔ "یہ تو ہر وقت تقویٰ تقویٰ کی کیا بات کرتا رہتا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں تقویٰ کی بات کرتا رہتا ہوں اور کان کھول کر سن لے کہ فقراء کا شاہی درباروں میں جانا تقویٰ کے خلاف ہے۔"
عباس مہدی نے کہا۔ "اے ابوسعیدؒ! ذرا یہ تو بتا کہ جس زمین پر تیرا گھر ہے، وہ کس کی ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "یہاں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔"
خلیفہ نے جھنجلا کر کہا۔ "تو بکتا ہے جس زمین پر تیرا گھر ہے، وہ زمین خدا کی نہیں، خلافت کی ہے، میری ہے۔"
آپ نے کہا۔ "دیکھ عباس مہدی! زیادہ غرور کی باتیں نہ کر، ورنہ خدا تجھے اس کی سزا دے گا۔"
خلیفہ نے پھر سوال کیا۔ "اور وہ نہر، جس کے پانی سے تو وضو کرتا ہے، جس کا پانی تو پیتا ہے، وہ کس کی ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ دیا کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے، اللہ کا ہے، میں کسی انسان کی ملکیت نہیں تسلیم کرتا۔"
خلیفہ نے غصے میں کہا۔ "اے انسان! شاہی زمین پر رہ کر اور شاہی نہر کا پانی پی کر تو تقویٰ کی بات کر رہا ہے۔ ان حالات میں تیرا دعویٰ احمقانہ ہے۔"
آپؒ نے اسی کروفر اور طنطنے سے جواب دیا۔ "جب میں نے تجھ پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ میں کسی انسان کی ملکیت نہیں تسلیم کرتا۔ میں اپنے اللہ کو اس جہان اور اس کی کائنات کی ہر چیز کا مالک سمجھتا ہوں، پھر ایسی الٹی سیدھی باتیں کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"
خلیفہ عاجز آ گیا، بولا۔ "ابوسعیدؒ! تم تو بہت ہی مضبوط انسان نکلے، اس دربار میں بڑے بڑوں کی گردنیں جھک گئیں مگر شاباش اور آفرین ہے تم پر کہ تم مجھ سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "عباس مہدی! جو شخص اپنے خدا سے ڈرے گا وہ کسی اور سے نہیں ڈرے گا، پھر میں تجھ سے کیوں ڈرتا۔"
عباس مہدی نے کہا۔ "حضرت! مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "تو جانتا ہے کہ مالداروں کا حق فقراء کو کیوں نہیں پہنچتا؟"
خلیفہ نے کہا۔ "حضرت! آپ ہی اس کی وضاحت فرمائیں، میں کیا جواب دوں گا۔"
آپ نے فرمایا۔ "مالداروں کا حق فقراء کو اس لیے نہیں پہنچتا کہ اول تو ان کی دولت ہی ناجائز ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کا عمل دولت کے مطابق نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ کہ فقراء خود ہی صاحبِ قناعت ہوتے ہیں۔"
خلیفہ نے درخواست کی۔ "حضرت! اور کچھ؟"
آپؒ نے فرمایا۔ "ایک چیز ہے خدا کا مشاہدہ کرنا اور جب کوئی شخص خدا کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو کوئی حجاب اس کے درمیان میں باقی نہیں رہتا۔ نورِ فراست سے مشاہدہ کرنے والا گویا نورِ خداوندی سے مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے علم کا منبع صرف ذاتِ الٰہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ سہو و غفلت کا مرتکب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے منہ سے نکلنے والا کلام درحقیقت خدا ہی کا کلام ہوتا ہے لیکن خدا کے بعض ایسے بندے بھی ہیں جو اس کے خوف سے خاموشی کے ساتھ مشغولِ عبادت رہتے ہیں۔"
عباس مہدی نے کہا۔ "حضرت! آپ کے کلام کی صداقت ہم پر عیاں ہو یا نہ ہو لیکن اس کا فتنہ ضرور ظاہر ہو رہا ہے۔ اگر آپ کے خیالات عام ہو جائیں تو مخلوق میں ہر طرف فتنہ و فساد برپا ہو جائے۔"
آپؒ کا انتقال بغداد ہی میں ہوا اور یہیں آپؒ کا مزار مرجع خاص و عام رہا لیکن آپؒ نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، آپ کے بعد منصور حلاج نے اس کا برملا اعلان کر دیا اور انا الحق کا نعرہ لگا کے دار پر چڑھ جانا گوارا کر لیا مگر اپنے قول، انا الحق سے نہیں پھرے۔ بعد میں ابوسعیدؒ کو صوفیائے کرام نے "لسان التصوف" کا خطاب عطا فرمایا۔

ماخذات
سفینتہ الاولیاء، شہزادہ داراشکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ انوار اولیاء، رئیس احمد جعفری۔ خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری



ضیا تسنیم بلگرامی


شاہ ولی اللہ دہلوی کے دادا کے سوانح۔ آپ نے دوسرے صوفیائے کرام کے برعکس جنگ وجہاد میں بھی حصہ لیا۔ یہی وہ سنت ہے جس پر بہت کم صوفی چلے ہیں۔ آپ علوم ظاہری اور باطنی پر یکساں قادر اور کاربند تھے۔ طبیعت میں سادگی اور مزاج میں مٹھاس تھی۔ مرد مومن کا بھولا پن اور مجاہد کی شجاعت آپ میں یکجا ہو گئے تھے۔ دوستوں میں بریشم کی طرح نرم اور دشمنوں میں فولاد کی طرح سخت۔ آپ کی پوری زندگی جد وجہد اور فکر و تدبیر کا نمونہ تھی۔ جب تک زندہ رہے مجاہد بن کر زندہ رہے اور جب اس جہان سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اپنے لیے شہادت کو پسند فرمایا۔ آپ غازی، مجاہد اور شہید تھے ۔

یہ مرتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

حضرت عمر فاروق رض کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان چلے آئے اور ہانسی اور دہلی کے درمیان شہر رہتک میں اقامت اختیار کی۔ ان دنوں ہندوستان میں مسلمان کشاں کشاں چلے آ بسے تھے۔ یہاں ہر طرف کفر ہی کفر تھا۔ چنانچہ مفتی شمس الدین نے یہاں ایک مسجد تعمیر کی اور اس مسجد سے پانچ وقت اذان دی جانے لگی۔ اللہ اور اس کے رسول ص کے نام نے چاروں طرف تہلکہ سا مچا دیا۔ مفتی شمس الدین کے علم و فضل اور تقویٰ کا بڑا شہرہ تھا۔ آپ کا جب آخری وقت آیا تو آپ نے اپنے پسماندگان کو ایک عجیب و غریب وصیت کی۔ آپ نے ان سے فرمایا: "دیکھو جب میں انتقال کر جاؤں تو تم لوگ مجھے اس طرح نہ دفن کر دینا۔ تم لوگ میرے جنازے کو اس مسجد میں رکھ کر کہیں چلے جانا۔ پھر تھوڑی دیر بعد واپس جا کر مسجد کے اندر دیکھنا اور... اگر وہاں میرا جنازہ مل جائے تو اسے جہاں چاہنا دفن کر دینا لیکن اگر وہاں جنازہ نہ ملے تو صبر کر لینا اور سمجھ لینا کہ مشیت ایزدی کو جو منظور تھا، پورا ہوا۔"

چنانچہ کئی سال بعد جب آپ نے انتقال فرمایا تو آپ کے پسماندگان نے آپ کی وصیت کے پیش نظر جنازہ مسجد میں رکھ دیا اور با آواز کہا: "حضرت! آپ کی وصیت کے پیش نظر جنازہ مسجد میں رکھ دیا گیا ہے۔ اب ہم لوگ کچھ دیر بعد مسجد میں جائیں گے اور وہاں سے جو اشارہ یا ہدایت پائیں گے اس پر عمل کریں گے۔"

چنانچہ جب کچھ دیر بعد مسجد میں رکھے ہوئے جنازے کو تلاش کیا گیا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ اب اس کی تجہیز و تکفین کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ لاش کہاں چلی گئی، آج تک کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ اس خاندان نے بادشاہوں کی ملازمتیں اختیار کیں مگر پڑھنے لکھنے سے کبھی بھی نہیں بھاگے۔ اس خاندان نے شہرت بھی حاصل کی اور عزت اور احترام بھی۔

کئی پشتوں بعد معظم نامی ایک بزرگ کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام شیخ وجیہ الدین رکھا گیا۔

شیخ وجیہ الدین بھی سرکاری ملازمت میں چلے گئے۔ راتوں کو نمازیں اور اوراد و وظائف اور دن میں دنیاوی معاملات کو نمٹانا۔ انھوں نے بڑی جلد شہرت حاصل کر لی۔ آپ ہر روز دو پارے مزید پڑھتے تھے۔

ایک چھوٹے سے فوجی دستے کے ساتھ آپ کہیں جا رہے تھے، گھوڑے بھوکے ہو رہے تھے۔ دستے کے سپاہیوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے گھوڑوں کو کھیتوں میں چھوڑ کر کسی باغ میں سستا لیا جائے۔

شیخ وجیہ الدین نے اس سے اختلاف کیا، فرمایا: "لیکن افسوس کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔"

ساتھیوں نے پوچھا: "وہ کیوں؟ کیا تمھارا گھوڑا بھوکا نہیں ہے؟"

انھوں نے جواب دیا: "بھوکا ہے کیوں نہیں۔ بہت زیادہ بھوکا ہے۔"

ساتھیوں نے پھر سوال کیا: "جب تمہارا گھوڑا بھوکا بھی ہے تو اس کی خوراک کا انتظام کس طرح کرو گے؟"

آپ نے جواب دیا: "میں اس کا انتظام کسی طرح بھی کروں مگر میں کسی کے کھیت کو برباد نہیں ہونے دوں گا۔"

ساتھی سپاہی ناک بھوں چڑھانے لگے، بولے: "عجیب سرپھرا شخص ہے یہ۔ اب تو ہم صبر نہیں کریں گے۔"

ان سب نے اپنے اپنے گھوڑوں کو غیروں کے کھیتوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ شیخ وجیہ الدین کو ایسا لگا، گویا ان کے ساتھیوں نے انھیں بڑی اذیت پہنچائی ہے وہ تلملائے تلملائے ادھر ادھر پھرتے رہے۔ آپ فرما رہے تھے: "ظالمو! یہ تم نے کیا کردیا؟ کسی کی روزی برباد کردی۔"

چونکہ آپ کا گھوڑا بھی بھوکا تھا اور آپ نے اسے روک رکھا تھا اس لیے وہ حالت بے بسی میں اپنی دونوں پچھلی ٹانگوں پر بار بار کھڑا ہو جاتا۔ آپ 'ہوں ہوں' کرکے اس کے اگلے دونوں پاؤں پھر زمین سے لگا دیتے۔ آپ نے گھوڑے سے فرمایا: "اے بے زبان جانور! میں خوب جانتا ہوں کہ تو چاہتا کیا ہے؟ تو بھوکا ہے تو چارہ چاہتا ہے اور تو شاید اس لیے بھی بے چین ہے کہ تیرے دوسرے ساتھی اسی کھیت سے اپنی بھوک مٹا رہے ہیں۔ تو سوچ رہا ہوگا کہ آخر میں تجھے کیوں روک رہا ہوں؟"

گھوڑے نے اپنے دونوں اگلے پاؤں زمین پر مارے، آپ نے فرمایا: "کیا بات ہے؟ گھبراؤ نہیں میں تمھیں ابھی کسی چراگاہ تک لے چلوں گا۔"

اس کے بعد آپ اپنے گھوڑے پر بیٹھ گئے اور گھوڑے پر بیٹھ کر چراگاہ کی تلاش میں چل پڑے۔

کئی گھنٹے کی تگ و دو کے بعد وہ چراگاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ خود بھی بے حد بھوکے تھے لیکن انھوں نے جانور کے مقابلے میں اپنی پروا نہیں کی۔ جب گھوڑا اچھی طرح چر کر فارغ ہوگیا تو آپ اپنے ساتھیوں میں واپس پہنچے۔ ان کے ساتھی جشن منا رہے تھے۔ معلوم نہیں کہاں سے وہ مزے مزے کے کھانے لائے تھے۔ انھوں نے شیخ وجیہ سے اشارۃً کہا: "اگر بھوک لگ رہی ہے تو کھانا حاضر ہے۔"

آپ نے پوچھا: "مگر یہ اتنا بہت سارا کھانا تم لوگ لائے کہاں سے؟ کیا کہیں سے خرید کر لا رہے ہو؟"

ایک شخص زور زور سے ہنسنے لگا، بولا: "لو بھائیو! سنا تم نے۔ کیا میں نہ کہتا تھا کہ ایماندار آتا ہوگا اس لیے جلدی جلدی کھالو، مگر تم لوگ نہیں مانے اور ایماندار شخص ہم میں آگیا۔"

کسی طرف سے آواز آئی: "بھائیو! تمھیں قسم ہے کہ یہاں جو کچھ دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو اس کو اپنے اپنے حافظے میں محفوظ رکھو۔ میں جب کھانے سے فارغ ہو جاؤں گا تو۔" شیخ وجیہ کی طرف اشارہ کرکے: "ان کو اپنے دست خاص سے کھانا کھلاؤں گا۔"

آپ نے فرمایا: "میں یہ کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک مجھے اس کے حلال ہونے کا ثبوت نہیں مل جاتا۔"

لیکن وہ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے، ان کی نیت ضرور درست تھی۔ شیخ وجیہ نے اپنا ضروری سامان یہیں کہیں رکھ دیا تھا۔ اسی سامان میں ان کا روکھا پھیکا کھانا بھی تھا۔ وہ دیر تک اس سامان کو تلاش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔

آپ نے اپنے ساتھی سے پوچھا: "میں یہاں اپنا سامان چھوڑ گیا تھا، وہ کہاں چلا گیا؟ مل نہیں رہا۔"

ایک شخص ہنسنے لگا۔ دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور مسکراتے ہوئے جواب دیا: "پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ دیکھو کہیں ادھر ادھر ہی پڑا ہوگا۔"

آپ نے فرمایا: "بھائیو! اگر میرا کھانا کسی نے کھالیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں بھوکا ہوں، کوئی اور سبیل کروں گا مگر وہ کھانا اگر مجھ سے پوچھ کر کھایا جاتا تو بہتر تھا۔"

کسی کی آواز سنائی دی: "اگر پوچھ کر کھایا جاتا تو کھانے کی اجازت ہی کون دیتا۔ کیا ہم اتنے بھولے ہیں؟"

آپ کو بہت زیادہ بھوک لگ رہی تھی۔ کسی دوست نے پوچھا: "حضرت! جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ اگر آپ اجازت دے دیں تو میں اسی وقت گرم گرم اور۔۔۔۔"

آپ کو ان باتوں سے بڑا دکھ ہو رہا تھا، آپ نے پوچھا: "دوستو! میں تم سے ایک سوال کروں گا۔"

کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں: "یارو! بادشاہ سے کہہ کر اپنے سفر اور حضر کی خوشیوں میں اضافہ اس طرح کرنا ہے کہ۔۔۔۔"

آپ خوب سمجھ رہے تھے کہ ان کا رخ سخن کدھر ہے، آپ نے جواب دیا: "میں خود بادشاہ سے یہ کہوں گا کہ مجھے کہیں اور لگا دیا جائے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔"

ایک نے جواب دیا: "دیکھا آپ لوگوں نے، اس کو کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"

دوسرے نے غیر معمولی ہمدردی جتائی: "موصوف کو بہت زور کی بھوک لگی ہے، اگر آپ اجازت دے دیں تو بندہ کھانا لانے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔"

کسی نے پوچھا "کھانا کتنا آئے گا؟ میں ابھی آتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "یہ تو مجھ پر بڑا ظلم ہو گیا۔ میں بھوکا ہوں اور میرے پاس رقم بھی نہیں کہ میں بازار سے خرید کر ہی کھالوں۔"

ایک شوخ و شریر نے جواب دیا "حضرت! اب زیادہ چرچا نہ کریں اپنی ایمانداری کا۔ میں خوب جانتا ہوں آپ سب کی ایمانداری اور بے ایمانی کو۔"

آپ نے فرمایا "افسوس کہ میں اس وقت بھوکا ہوں ورنہ میں تیری باتوں کا بہت اچھا جواب دیتا۔"

اس شخص کو بھی غصہ آگیا، پوچھا "آپ کیا جواب دیتے مجھے؟"

آپ نے جواب دیا "میں اپنے نفس کے لیے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔"

اُس شخص نے جواب دیا "لیکن میں اپنے نفس کے لیے آپ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے اس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا، بولے "بس۔ اب ختم کر اس سلسلے کو۔"

اس شخص نے اور زیادہ جسارت سے کام لیا، آپ کو شانوں سے پکڑ لیا، بولا "نظریں کیوں چُراتے ہو؟ ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو، مجھے یہ چوری کی عادت ذرا بھی پسند نہیں۔"

آپ نے بہت ضبط سے کام لیا، کہا "دیکھ میرے پیمانۂ صبر کو لبریز نہ کر۔"

اب اس شخص نے اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے آپ کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا، بولا "میں اگر چاہوں تو تمھیں مسل کر پھینک دوں، تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟"

اب آپ کو بھی غصہ آگیا، آپ نے فرمایا "میں خود کو کیا سمجھتا ہوں یہ بتانا فضول ہے مگر میں ہوں کیا تجھ کو ابھی بتائے دیتا ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے اُس شخص کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر دُور پھینک دیا، بولے "بس دفع ہو جا میری نظروں سے۔"

وہ شخص گر کر اٹھا اور پھر گر گیا۔ اب اس کے دُوسرے ساتھیوں نے بھی آپ پر حملہ کر دیا۔ آپ تنہا تھے اور وہ کئی، لیکن آپ نے دو کو اور اسی طرح اٹھا کر پھینک دیا۔ تین کے حشر نے سب کو ٹھنڈا کر دیا۔ وہ آپ سے دور دور رہ کر تلخ کلامیاں کرنے لگے مگر پاس کوئی بھی نہیں آیا۔ اور آپ جب بھی غصے میں اُن کی طرف لپکتے، وہ بھاگ کھڑے ہوتے۔

آپ کے ہاتھ میں کہیں سے چابک آگیا، آپ نے احتیاطاً اُسے گھُمانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد آپ سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟ بھوک تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ پھر بے خیالی میں آپ چابک کی لکڑی سے زمین کو کُریدنے لگے۔ اچانک اندر سے چنے کے دانے نکلنے لگے۔ آپ نے ان دانوں کو ہاتھ میں لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کی، کہ آخر یہ یہاں آئے کہاں سے؟"

آپ نے ان دانوں کو منہ میں رکھ کر ان کا ذائقہ جانچا تو بہت اچھا نکلا۔

اب آپ نے اُس جگہ کو اور کھودا اور اندر سے چنے کی وافر مقدار نکال لی۔ یہ چنے اتنے ہو گئے تھے کہ اُن سے آپ کی بھوک مٹ گئی۔

آپ کے ساتھی دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، آپ نے انھیں آواز دی "حضرات! اب آپ آجائیں۔"

لیکن ساتھی بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے، ایک بھی آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ نے اُن سے کہا "اپنا سامان تو یہاں سے اٹھا لو۔"

اُن لوگوں نے جواب دیا "میاں جی! آپ انسان ہیں یا کچھ اور؟"

آپ نے جواب دیا "میں تمھاری ہی طرح انسان ہوں، مگر یہ سوال کیوں کیا تم نے؟"

ایک نے جواب دیا "اس لیے کہ جب آپ نے مجھے پھینکا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا، گویا میں تنکا ہوں جسے اٹھا کر پھینک دیا گیا ہے۔"

آپ نے اُن کا سامان دے دیا اور خود بھی وہاں سے چلے گئے۔

❖

آپ اپنے شہر رہتک سے کہیں جا رہے تھے، دورانِ سفر آپ نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص درخت کے سائے میں بیٹھا ہے اس کو اس کے عقیدت مندوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ شیخ وجیہ الدین بھی اُن بزرگ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ کچھ دیر انسانی ہجوم میں کھڑے اس دربار کا مشاہدہ کرتے رہے۔ یہ کھڑے سوچ رہے تھے کہ اگر یہ بزرگ دُنیادار ہیں تو ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دیں گے، اور اگر یہ ولی ہیں تو خصوصی مزاج پرسی فرمائیں گے۔

انھیں ابھی بمشکل دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ اس ولی نے لوگوں سے کہا "ولی راولی می شناسد۔ شیخ وجیہ الدین کو بلاؤ، اسے میرے پاس لاؤ۔ وہ ولیوں کا جدِّ اعلیٰ ہے۔"

اِن بزرگ کے ایک مرید نے حاضرین سے باآوازِ بلند دریافت فرمایا "صاحبان! آپ میں شیخ وجیہہ الدین کس کا نام ہے؟"
آپ آگے بڑھے اور جواب دیا "میرا۔"
مرید نے کہا "آپ کو پیر مرشد یاد فرما رہے ہیں، آگے آئیے۔"
شیخ وجیہہ الدین آگے بڑھے، یہاں تک کہ اس بزرگ کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔
اُن بزرگ نے اپنا سر اوپر اُٹھایا اور شیخ وجیہہ الدین نے پوچھا "کیوں جی یہ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم میرا امتحان لو۔ میں بھولا بھالا بدھا آدمی۔ میں امتحان کس طرح دوں گا؟ خدا کے لیے میرا اور امتحان نہ لینا۔"
شیخ وجیہہ الدین کے دل پر ان باتوں کا گہرا اثر ہو رہا تھا، انھوں نے پوچھا "بابا! میری رہنمائی فرمائیں میں دُنیا میں رہ کر بھی خود کو دنیا سے دُور دُور محسوس کرتا ہوں، ایسا کیوں ہے؟"
بابا نے جواب دیا "بابا وجیہہ الدین! تو خود ولی ہے اور ساتھ ہی کئی ولیوں کا جدِ اعلیٰ بھی، دنیا میں تیرا کیا دل لگے گا۔"
شیخ نے پوچھا "میرے لیے کوئی نصیحت؟"
بابا نے جواب دیا "زندگی کو سادگی سے گزار دے، انسانوں میں امتیاز کرنا چھوڑ دے، خدا کے سوا کسی سے خوف نہ کھا۔ کم گوئی اور کم آمیزی اختیار کر۔"
شیخ نے پوچھا "بس یا اور کچھ بھی؟"
بزرگ نے جواب دیا "یہی بہت کافی ہے۔"
شیخ وجیہہ الدین اُن کے مرید ہو گئے اور انھوں نے جو نصیحتیں کی تھیں، اُن پر زندگی بھر قائم رہے۔
یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کہ مالوہ کے علاقہ میں قصبہ دہاموئی کا ایک ہندو سرکش زمیندار مصیبت بنا ہوا تھا۔ اس کی بہادری اور شجاعت کا بڑا شہرہ تھا۔ دہلی کی حکومت نے سید حسین نامی امیر کو اس سرکش کی تادیبی کارروائی پر متعین کر دیا اور شیخ وجیہہ الدین سے کہا گیا کہ اس مہم میں آپ سید حسین کا ساتھ دیں۔ چنانچہ شیخ نے اپنے چار سالہ بیٹے کو اپنے ساتھ لیا اور سید حسین کے ساتھ مالوے کے قصبہ دہاموئی روانہ ہو گئے۔ سید حسین کے ساتھ اُس کا آزمودہ کار لشکر تھا۔
سرکش ہندو امیر نے سید حسین کے لشکر پر کئی بار حملہ کیا مگر منہ کی کھا کر رفوچکر ہو گیا۔ آخر اس کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ سید حسین پر قابو پانا بہت مشکل ہے تو اس نے ایک دوسری ترکیب سے سید حسین کو مات دینا چاہی۔
سید حسین، شیخ وجیہہ الدین اور دوسرے امرا کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اتنے میں ایک بدحال شخص اُن کے پاس آیا اور پوچھا "جنابِ والا! آپ میں سید حسین کس کا نام ہے؟"
سید حسین نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور جواب دیا "میرا ہی نام سید حسین ہے، بتا مجھ سے تیرا کیا کام ہے؟"
آنے والے نے کہا "میں ٹھاکر رام ہیبت سنگھ کا آدمی ہوں۔ ٹھاکر جی جنگ کے بادلوں سے بے حد پریشان ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں مقابلے سے نہیں گھبراتا مگر مقابلوں سے پہلے میں سید حسین سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"
سید حسین نے شیخ وجیہہ الدین کی طرف دیکھا اور جواب دیا "وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں آخر کیوں؟"
اس شخص نے کہا "تو گویا آپ ہمارے ٹھاکر کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے، کیوں؟ ہے نا یہی بات؟"
سید حسین کو غصہ آگیا، بولے "یہ تو نے کس طرح سمجھ لیا کہ میں مقابلے سے بھاگ رہا ہوں؟"
اس شخص نے جواب دیا "اس بات سے کہ آپ متامل ہیں۔"
سید حسین نے جواب دیا "تب پھر تو جا سکتا ہے اپنے آقا سے کہہ دینا کہ میں اس کا ہر جگہ مقابلہ کر سکتا ہوں۔"
اس شخص نے منہ بنا کر کہا "جنابِ والا! اگر آپ میرے آقا ٹھاکر کو اپنے پاس آنے دیں تو آپ کو خود ہی یہ معلوم ہو جائے گا کہ میرا آقا کیا ہے۔"
سید حسین نے پوچھا "تب پھر کیا طے پایا؟"
اس نے جواب دیا "یہ کہ آپ مقابلے سے پہلے میرے آقا سے ملاقات کریں گے۔"
سید حسین نے کہا "ہاں مگر اس طرح کہ تیرا آقا میرے پاس تنہا آئے گا، وہ ہتھیار لے کر نہیں آئے گا۔"
ٹھاکر کے آدمی نے کہا "مگر کیوں؟ آپ تو اپنے لشکر میں ہیں اور ہمارا ٹھاکر تنہا آئے گا، پھر آپ اس کو ہتھیاروں سمیت کیوں

نہیں آنے دیتے۔"

سید حسین نے ایک بار پھر شیخ وجیہہ الدین کی طرف دیکھا۔ شیخ نے کہا۔ "تیرا ٹھاکر بات کرنے آئے گا یا جنگ کرنے؟"

قاصد نے جواب دیا۔ "وہ آئے گا تو بات ہی کرنے۔ مگر وہ اپنے جسم سے ہتھیار اس لیے نہیں دور کرے گا کہ اس بات کو وہ مردمی کے خلاف سمجھتا ہے۔"

سید حسین نے غصہ میں کہا۔ "اب تو جاتا ہے یا میں دھکے دے کر نکلوا دوں؟"

وہ گھبرا گیا، باہر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "تو گویا میرا آقا اب یہاں ہتھیار اتار کر آسکتا ہے۔"

سید حسین نے جواب دیا۔ "ہاں میں نے یہی کہا ہے اور اسی پر میں قائم رہوں گا۔"

وہ شخص چلا گیا مگر دوسرے ہی دن تنہا پھر آگیا۔ سید حسین نے پوچھا۔ "تیرا آقا کہاں ہے؟ وہ نہیں آیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "جیسا کہ میں خود بھی سمجھ رہا تھا کہ میرا آقا یہاں نہتا نہیں آئے گا چنانچہ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

شیخ صاحب نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "مجھے تو تیرا آقا بہت شریر معلوم ہوتا ہے، کیوں ہے نا یہی بات؟"

قاصد نے جواب دیا۔ "آپ جو چاہیں کہیں۔ مگر وہ اکیلا اور نہتا نہیں آئے گا۔"

سید حسین نے کہا۔ "تب پھر جا اور اس سے کہہ دے کہ میں اکیلا اور نہتا ہی آنے دے سکتا ہوں۔"

قاصد نے آہستہ سے کہا۔ "میرے آقا نے مجھ سے کہا تھا کہ جب آپ میری بابت کسی بھی طرح نہ مانیں تو میں آپ سے ایک بات کہہ دوں۔"

سید حسین نے پوچھا۔ "کون سی بات؟"

قاصد نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ سبھی چونک پڑے۔ اس نے کہا۔ "میرے آقا نے کہا ہے کہ تم تو اپنے گھر ہی میں ہو تمھارے پاس لشکر بھی ہے اور اس لشکر میں میرے آقا کی حیثیت مکھی سے بھی بدتر ہوگی یعنی کمتر۔"

سید حسین نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "جا اپنے آقا سے کہہ دے کہ وہ یہاں جس حال میں ہے اسی میں چلا آئے۔"

قاصد اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا مگر بول نہیں پا رہا تھا۔

سید حسین نے کہا۔ "اب تو اپنے آقا کے پاس جا اور اس سے کہہ دے کہ وہ تنہا اور ہتھیار سمیت آسکتا ہے۔"

قاصد جانے لگا تو شیخ وجیہہ الدین نے کہا۔ "آپ کو یہ اجازت نہیں دینا تھی۔"

سید حسین نے جواب دیا۔ "پروا نہ کرو، آنے دو، آئے گا شرارت کرے گا تو اس کی سزا پا جائے گا، ہمارا کیا بگاڑ لے گا؟"

شیخ وجیہہ الدین سے بار بار یہی پوچھا گیا کہ اگر اس نے سید حسین کے بجائے شیخ بابا سے مقابلہ کرنا چاہا تو؟

قاصد نے کہا۔ "میرا آقا ایک وقت میں ایک ہی مقابلہ کرے گا۔"

سید حسین نے کہا۔ "اب تو جاتا ہے یا میں دھکے دوں؟"

قاصد فوراً بھاگ گیا۔ کافی دیر بعد سید حسین نے بابا وجیہہ الدین سے کہا۔ "اس دن میں نے۔۔۔"

لیکن سید حسین نے جو کچھ کہنا چاہا تھا، نہیں کہا اور چھپا گیا۔

کچھ دیر بعد ٹھاکر اس طرح نمودار ہوا کہ اس کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔ گال میں پان دبا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ کسی تقریب میں آیا ہو، اس کے ہتھیار دیکھنے والوں کو مرعوب اور متاثر کر رہے تھے۔

کسی دربان نے اسے روک لیا، کہا۔ "جناب! آپ ہتھیاروں سمیت اندر نہیں جائیں گے۔"

ٹھاکر نے جواب دیا۔ "تو کون ہوتا ہے روکنے والا۔ میں نے اجازت حاصل کر لی ہے۔"

شیخ وجیہہ الدین نے سید حسین سے کہا۔ "جناب آپ نے ٹھاکر کو ہتھیاروں سمیت آنے کی اجازت دے تو دی ہے مگر یہ دھوکا کرے گا۔ آپ میری یہ بات ذہن نشین کر لیں۔"

سید حسین نے پوچھا۔ "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "جب یہ قریب آجائے تو آپ چوکنا رہیں۔"

دربان نے ابھی تک اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ سید حسین نے دور ہی سے آواز دی۔ "آنے دو، اسے ہتھیاروں سمیت آنے دو۔"

ٹھاکر نے طنزاً مسکراتے ہوئے دربان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تھو ہے تیری اوقات پر۔"

شیخ وجیہہ الدین نے ایک خدمت گار کو بلا کر اپنے چار سالہ بچے رحیم الدین کو اس کے حوالے کر دیا اور کہا۔ "اس کو لے کر ذرا دور چلا جا۔"

خدمت گار بچے کو لے کر چلا گیا۔

ٹھاکر مستوں کی طرح جھومتا ہوا سیّد حسین کے پاس پہنچا اور کہا۔ "تو سیّد! میں نے اپنی بات منوا ہی لی۔ میں بھی ایک ہی ضدّی اور سرکش انسان ہوں۔"

سیّد حسین نے جواب دیا۔ "اس میں کیا شک، سارا زمانہ تیری شری طبیعت سے آگاہ ہے۔"

اب ٹھاکر بالکل قریب پہنچ چکا تھا، اس نے نہایت پھرتی سے تلوار نکالی اور سیّد حسین پر حملہ کر دیا۔ سیّد حسین تو پہلے ہی سے ہوشیار، حملے کے منتظر تھے۔ وہ کھسک کر ایک طرف ہو گئے۔ تلوار تکیے پر گری اور اس کو کاٹتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

ابھی سیّد حسین سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ٹھاکر نے دوسرا وار کر دیا۔ سیّد حسین لڑکھڑا کر گر گئے۔

شیخ وجیہہ الدین نے ٹھاکر کو للکارا۔ "ٹھاکر! تو نے دھوکا کیا ہے اس لیے اب ہم تیری حفاظت سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔ اب مجھ سے بچ اور دیکھ کہ وار کس طرح کیا جاتا ہے۔"

شیخ وجیہہ الدین کے خنجر کا ایک ہی وار کافی ثابت ہوا۔ ٹھاکر چیخ مار کر لوٹنے لگا۔

سیّد حسین نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔

جب یہ خبر ٹھاکر کے لشکر میں پہنچی تو وہ سیّد حسین کے لشکر کے سامنے آ گیا۔

کافروں کے لشکر میں سے ایک جوان اس طرح آگے بڑھا کہ اس نے تلوار اپنے گلے میں حمائل کر رکھی تھی۔ اس نے بآواز بلند کہا۔ "بہادرو! میں اس فوج کا سردار ہوں جس کا سب سے بڑا ٹھاکر ابھی ابھی مارا گیا ہے میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی نکل کر میرا مقابلہ کرے۔"

سیّد وجیہہ الدین نے سیّد حسین سے کہا: "مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کا مقابلہ کروں۔"

سیّد حسین نے کہا۔ "معلوم نہیں یہ تم سے مقابلہ کرے گا بھی یا نہیں۔ اس کے آثار تو کچھ اور ہی بتاتے ہیں۔"

سیّد وجیہہ الدین آگے بڑھے اور اعلان کیا۔ "تیرے مقابلے پر میں آ گیا ہوں۔ میرا خیال ہے تجھے اس پر اعتراض نہیں ہو گا۔"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں، میں تم سے نہیں لڑوں گا۔ میں سیّد حسین سے لڑنا چاہتا ہوں، اگر وہ مرد اور کھرا ہے تو میرے مقابلے پر آئے۔ کسی اور سے لڑنا میری بے عزتی ہے۔"

سیّد حسین تیزی سے اٹھے اور اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر ٹھاکر کے سامنے پہنچ گئے، بولے۔ "میں آ گیا ہوں۔"

شیخ وجیہہ الدین وہیں کھڑے رہے۔

ٹھاکر نے پوچھا۔ "تو تم ہی ہو سیّد حسین؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں میں ہی ہوں سیّد حسین۔"

ٹھاکر نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی، تلوار کا ایک بھرپور وار کر دیا۔ سیّد حسین نے اس کا یہ وار اپنی ڈھال پر روک لیا۔ وار اتنا کاری اور بھرپور تھا کہ تلوار ڈھال کو کاٹ کر اندر تک پیوست ہو گئی۔ اب تلوار ڈھال میں پھنس چکی تھی۔ سیّد حسین ابھی سنبھلے بھی نہ تھے کہ ٹھاکر نے ایک زوردار جھٹکے سے اسے کھینچ لیا۔ سیّد حسین خود کو سنبھال نہ سکے، گھوڑے سے زمین پر آ رہے۔

ٹھاکر بھی کود کر سیّد حسین کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس نے اپنا خنجر والا ہاتھ اوپر اٹھایا، سیّد حسین نے اپنی موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ اس دوران شیخ وجیہہ الدین نے تلوار کا ایک بھرپور وار کر کے ٹھاکر کا ہاتھ کاٹ دیا اور دوسرے وار سے ٹھاکر کو قتل کر دیا۔

سیّد حسین نے اٹھ کر شیخ وجیہہ الدین کو گلے سے لگا لیا، کہا۔ "شیخ! اس وقت اگر تم نہ ہوتے تو میں قتل ہو چکا ہوتا۔"

وہ دونوں یہاں سے چل کر اپنی جگہ پہنچے۔

یہاں سے انھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ انھوں نے دیکھا مقتول ٹھاکر ہی جیسا ایک دوسرا ٹھاکر اسی طرح سامنے کھڑا ہے۔ ان دونوں نے ایک ساتھ مقتول کی طرف دیکھا، وہ خاک و خون میں پڑا ہوا تھا۔ سیّد حسین نے کہا۔ "بھائی شاہ وجیہہ الدین! یہ تو مقتول ہی جیسا کوئی ہے۔ بالکل اسی جیسا ہم شکل، ڈیل ڈول، قد و قامت، سب کچھ ویسا ہی ہے۔"

ٹھاکر نے پھر آواز لگائی۔ "سیّد حسین! کہاں ہو، میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔"

شیخ وجیہہ الدین اس کے سامنے پہنچ گئے اور پوچھا۔ "تو کون ہے اور بار بار سیّد حسین ہی کو کیوں بلا رہا ہے؟"

ٹھاکر نے جواب دیا۔ "میں مقتول ٹھاکر کا بھائی ہوں۔ آپ ہی کی طرح میں بھی اکیلا کھڑا ہوں، چاہیں تو مجھے قتل کر دیں لیکن شرطِ شجاعت یہ ہے کہ میرے بھائی کا قاتل میرے سامنے آئے۔ میں اپنے بھائی کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔"

شیخ وجیہ الدین نے جواب دیا: "تیرے بھائی کو میں نے قتل کیا تھا، پھر تو نے سید حسین کو کیوں آواز دی ہے؟"

اُس نے کہا: "اس لیے کہ میرے بھائی کا مقابلہ سید حسین سے ہو رہا تھا۔"

شیخ وجیہ الدین نے کہا: "تب پھر سید حسین کو بھول جا اور مجھ سے مقابلہ کر۔"

دونوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ ٹھاکر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا اور شیخ وجیہ الدین ان حملوں کو نہایت استادی اور مہارت سے روک رہے تھے۔ آخر ٹھاکر تھک گیا اور شیخ وجیہ الدین کے حملوں کا آغاز ہوا۔ آپ کے حملوں میں جتنی تندی اور تیزی پائی جاتی تھی، ٹھاکر کے لیے وہ بہت پریشان کن تھی۔ شیخ نے کہا: "لے، روک میرے وار۔"

ٹھاکر گھبرا گیا اور اسی گھبراہٹ میں شیخ کی تلوار اٹھ کر پہلو میں اتر گئی۔ وہ چیخ مار کر گھوڑے سے گر گیا۔

شیخ وجیہ الدین وہیں کھڑے رہے اور ٹھاکروں کو للکارا: "ٹھاکرو! تمھارا دوسرا سردار بھی مارا گیا۔ کیا ان دونوں کا کوئی اور بھائی بھی ہے؟ اگر ہے تو میرے سامنے آئے، میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔"

یکایک ٹھاکروں میں سے ایک اور سردار نمودار ہوا۔ یہ ٹھاکر بھی دونوں مُردہ ٹھاکروں کی شکل کا تھا، آپ نے ازراہِ مذاق پوچھا۔ "کیا تیرے ماں باپ نہیں ہیں؟"

دوسری طرف سے جواب ملا: "میرے ماں باپ موجود ہیں اور میں انھی کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

شیخ نے کہا: "تب تُو سرخ رُو تو ہو جائے گا مگر ماں باپ کی نظروں میں نہیں۔ میری تلوار تیرا چہرہ سرخ کرے گی اور پھر تیرے سرخ چہرے کو ایک زمانہ دیکھے گا۔"

ٹھاکر نے کڑک کر کہا: "او میرے دو بھائیوں کے قاتل! زیادہ باتیں نہ بنا، مجھ سے مقابلہ کر۔"

آپ نے جواب دیا: "میں باتیں نہیں بنا رہا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تو خود پر اور اپنے ماں باپ پر رحم کھا، واپس جا اور کسی اور کو میرے مقابلے پر بھیج دے۔"

ٹھاکر نے پوچھا: "کیا تو مجھ سے ڈر گیا؟"

شیخ نے غصہ میں جواب دیا: "میں اور تجھ سے ڈر گیا، خوب۔"

اس کے بعد دونوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ ٹھاکر نے گھوڑے پر سے چھلانگ لگا دی اور آپ کو اپنی گرفت میں لے کر زمین پر آ گیا۔ ٹھاکر بہت طاقتور تھا، اس نے آپ کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ آپ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ طاقت سے ٹھاکر کو زیر کرنا ناممکن ہے، اس لیے آپ نے اعلان کیا، فرمایا: "ٹھاکر! جنگ میں تو یہ جائز ہے اب میں تجھے زیر کرنے کے لیے تو یہ اختیار کرتا ہوں۔" اس کے بعد آپ نے اپنے کسی فرضی ساتھی کو آواز دی: "بھائی ذکا! ذرا اس ٹھاکر کو سنبھالنا تو سہی۔"

ٹھاکر نے آپ کو چھوڑ دیا اور ذکا سے بچنے کی فکر کرنے لگا۔ وہاں ذکا نام کا کوئی تھا ہی نہیں۔ ٹھاکر آپ کو چھوڑ کر جیسے ہی مڑا آپ نے اس پر خنجر سے وار کر دیا۔ ٹھاکر تڑپنے لگا اور ذرا سی دیر میں سرد پڑ گیا۔ ٹھاکروں نے یکے بعد دیگرے اپنے تین چار سرداروں کو اس طرح ہلاک ہوتے دیکھا، تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔

مسلمانوں نے اُن کا پیچھا نہیں کیا اور اپنی چھاؤنی میں واپس چلے گئے۔

مسلمان بہت خوش تھے، انھوں نے خوشیاں منائیں۔ آپ اپنے خیمے میں آرام فرما رہے تھے۔ سید حسین آپ کے مدّاحوں میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ ہر وقت آپ کے آگے پیچھے رہنے لگا تھا۔ سید حسین آپ کے خیمے سے نکل کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ اس دوران ایک بوڑھی عورت چھاؤنی میں داخل ہوئی اور سپاہیوں سے پوچھا: "اے مسلمانو! میں اس نوجوان سے ملنا چاہتی ہوں جس نے تین دن پہلے تین ٹھاکر بھائیوں کو قتل کر دیا تھا۔"

سپاہیوں نے کہا: "ارے بھائی! یہ وجیہ الدین کو پوچھ رہی ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے بڑی بی کو وجیہ الدین کے پاس پہنچا دیا، آپ خیمے کی دیوار کی طرف منہ کیے کچھ سوچ رہے تھے کہ اچانک آپ نے سنا کوئی سپاہی کہہ رہا تھا: "حضرت! یہ خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

آپ نے مڑ کر دیکھا اور اشارے سے کہا: "آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟"

بڑی بی نے جواب دیا: "ہاں میں اپنے بیٹوں کے قاتل سے ملنا چاہتی ہوں۔"

آپ نے پوچھا: "میں آپ کے بیٹوں کا قاتل ہوں؟ کس طرح؟ آپ ہیں کون؟"

بڑی بی نے کہا: "تو نے ایک ہی مقابلے میں یکے بعد دیگرے جن تین ٹھاکروں کو قتل کیا ہے میں اُن بدنصیبوں کی ماں ہوں۔"

آپ نے فرمایا: "ماں! مجھے اس کا افسوس ہے لیکن وہ تینوں اس لیے مارے گئے کہ اگر وہ نہ مارے گئے ہوتے تو میں مارا جاتا۔ اور پھر یہ معرکہ، حق و باطل تھا۔ میں اپنے دور دراز وطن سے چل کر یہاں آیا ہوں۔ میں نے سُنا تھا کہ یہاں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے، چنانچہ میں آیا، میں لڑا اور کامیاب ہوا۔ اب آپ فرمائیں کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں ؟"

بڑی بی نے جواب دیا: "بیٹے! تو نے مجھے ماں کہا ہے اس لیے اب ہمیشہ اس کا خیال رکھنا۔ میں نے اپنے تینوں بیٹوں کو ہمیشہ دنیا کے بہادر نوجوان سمجھ رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں زیر کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا لیکن بھگوان تجھے زندہ و سلامت رکھے کہ تو ان تینوں سے بہادر نکلا۔ اب میں تجھے اپنا بیٹا بنانا چاہتی ہوں۔"

آپ نے جواب میں فرمایا: "جو کچھ ہوا، اس پر میں نادم اور شرمسار ہوں۔ خدا آپ کو صبر عطا فرمائے۔ میں نے بھی اگر آپ کو ماں کہا ہے تو زندگی بھر ماں کہتا اور ماں مانتا رہوں گا یہ میرا وعدہ ہے۔"

بڑی بی نے کہا: "اس طرح نہیں۔ بیٹا اپنی ماں کے پاس رہتا ہے۔ اگر تو نے جو کچھ کہا، دل سے کہا ہے تو پھر اس کو عملاً بھی ثابت کر۔"

آپ نے پوچھا: "اس کو عملاً کس طرح ثابت کروں ؟"

بڑی بی نے جواب دیا: "تو میرے ساتھ میری بستی، میرے گھر چل۔ وہاں چند دن میرے ساتھ رہ۔ تب میں سمجھوں گی تو میرا بیٹا ہے۔"

آپ نے فرمایا: "مجھے آپ کے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن آپ ہندو ہیں اور میں مسلمان۔ آپ کے دھرم والے اس پر اعتراض نہیں کریں گے ؟"

بڑی بی نے جواب دیا: "دھرم والے کیا کہیں گے، جو کہیں گے کہتے رہیں۔ اگر وہ زیادہ کچھ کہیں گے تو میں مسلمان ہو جاؤں گی۔ اگر تو چند دن بھی میرے ساتھ رہ جائے گا تو میں اپنے تینوں بیٹوں کا غم دُور کر سکوں گی۔"

آپ نے فرمایا: "اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے ساتھ آپ کی بستی میں چلوں گا اور چند دن آپ کے ساتھ ضرور رہوں گا۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا: "میرے گھوڑے پر زین کس دے، میں ماں کے ساتھ ان کے گھر جا رہا ہوں۔"

سید حسین کو جب ان باتوں کا علم ہوا تو انھوں نے آپ کو الگ بلا کے سمجھایا: "آپ تو عقلمند آدمی ہیں، یہ کیا کر رہے ہیں ؟"

آپ نے جواب دیا: "سید حسین! میں ماں کے ساتھ اس کی بستی جا رہا ہوں، دل سے نکلنے والی آواز دل میں اُتر جاتی ہے۔ ماں کے لفظوں میں اور ماں کی آواز میں درد اور سوز پایا جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ دھوکا نہیں کیا جائے گا۔"

سید حسین نے کہا: "یہ آپ کہہ رہے ہیں، میں آپ کو نہیں جانے دُوں گا چاہے کچھ ہو جائے۔"

اب آپ کے بعض عزیزوں کو بھی حوصلہ ملا۔ انہوں نے آپ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور کہا: "ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کس طرح یہاں سے جاتے ہیں۔ ہم آپ کی راہ میں لیٹ جائیں گے اور آپ ہمیں اپنے گھوڑے کے ٹاپوں تلے روند کر ہی یہاں سے جا سکیں گے۔"

آپ نے دیکھا وہ سب واقعی آپ کے گھوڑے کے چاروں طرف لیٹ گئے۔

بڑی بی نے ان سب سے کہا: "آخر تم لوگ ایسا کیوں کر رہے ہو ؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک ماں اپنے بیٹے کو دھوکا دے گی ؟ کیا میں اپنے منہ بولے بیٹے کو دھوکا دوں گی ؟ بھگوان کے لیے ایسا نہ سوچو۔"

آپ کو بڑی بی پر بہت رحم آیا۔ آپ نے فرمایا: "ماں! اس وقت تو آپ چلی جائیں، یہ لوگ مجھے یہاں سے نہیں جانے دیں گے لیکن میں، آپ کا بیٹا آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بہت جلد آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا بس آپ اپنا پتہ سمجھا دیں مجھے۔"

بڑی بی کو بہت مایوسی ہو رہی تھی، بولیں: "پتہ تو میں سمجھا دوں گی مگر میرا خیال ہے کہ اگر تم میرے ساتھ نہ چل سکے تو پھر کبھی نہ آ سکو گے۔"

آپ نے جواب دیا: "یہ بات نہیں ہے، میں جو وعدہ کر رہا ہوں اسے پورا کروں گا۔"

بڑی بی نے انھیں اپنا پتہ سمجھا دیا اور چلی گئیں۔

بڑی بی کے جاتے ہی لوگوں نے انھیں سمجھانا شروع کر دیا لیکن آپ پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ موقع کی تلاش میں رہے آپ ہر ایک سے یہی کہتے تھے کہ مجھے دھوکا نہیں دیا جائے گا، مجھے کچھ نہیں ہو گا۔

آخر ایک دن موقع پا کر آپ چلے گئے۔ آپ اس بستی میں داخل ہوئے اور پتہ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچ گئے۔ یہ خالص ہندوؤں کی بستی تھی۔ آپ کو وہاں کے ہندو بہت غور اور حیرت سے دیکھتے۔ آپ نے بڑی بی کے در پر دستک دی۔ دروازہ کھلا تو ٹھکرائن نے اپنے سامنے جو کچھ دیکھا کچھ دیر تک اس پر یقین ہی نہیں آیا، حیرت سے پوچھا: "تو یہ تم ہو، تم آ گئے، میں کس طرح یقین کروں ؟"

آپ نے گھوڑے کو باہر ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا اور خود اندر چلے گئے۔ اس عورت نے آپ کے لیے صاف ستھرا بستر بچھایا یہ مکان کیا، اچھا خاصا محل تھا۔ آپ نے پوچھا: "کیا اس پورے محل میں آپ اکیلی رہتی ہیں؟"

بڑی بی نے جواب دیا: "نہیں تو۔ نوکر چاکر بھی ہیں۔ کیوں؟ یہ سوال کیوں کیا تم نے؟"

آپ نے کہا: "اس لیے کہ دستک دیتے ہی آپ باہر نکل آئیں حالانکہ اس محل میں گھنٹوں دستک دینے کے بعد بھی جواب کا ملنا آسان بات نہیں ہے، ہاں اگر در پر دربان موجود ہو تو کوئی مشکل نہیں۔"

بڑی بی نے دروازے کے پاس ہی ایک بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ میرا بستر ہے اور یہ اس دن سے یہیں بچھا ہوا ہے جس دن سے تم سے مل کر یہاں آئی ہوں اور اس دن تک بچھا رہتا جب تک تم آ نہ جاتے۔ میں اپنا بستر یہاں لگا کر تمھارا انتظار کر رہی تھی۔"

آپ کے دل پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ اس عورت نے آپ کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

آس پاس کے ہندوؤں نے اس پر اعتراض کیا اور ٹھکرائن کو سمجھایا: "ٹھکرائن! بڑا اچھا موقع ہے۔ تمھارے بیٹوں کا قاتل تمھارے قبضے میں ہے اگر تم چاہو تو ہم تمھاری مدد کرسکتے ہیں اور اس کا کام کر دیں گے۔"

ٹھکرائن نے جواب دیا: "لوگو! یہ میرا بیٹا ہے، میں نے اسے اپنا بیٹا بنایا ہے بھلا کوئی ماں اپنے بیٹے کو کس طرح مار سکتی ہے۔"

ہندوؤں نے کہا: "یہ مسلمان ہے اور تیرے بیٹوں کا قاتل ہے۔ تجھ کو تیرے بیٹوں کی روحیں ملامت کریں گی۔"

ٹھکرائن نے کہا: "ایسا نہیں ہوگا میرے بیٹے بہادر تھے اور بہادر بہادر کی عزت کرتے ہیں۔ میرے بیٹوں کی روحیں مجھے ملامت نہیں کریں گی کیونکہ وہ خود بھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ ان کی ماں کی گود اپنے بہادر بیٹوں کی موت سے خالی رہے۔ میری گود اب بھی بھری ہوئی ہے۔"

ٹھکرائن کا بھتیجا کہنے لگا: "آپ ہندو ہیں اور یہ مسلمان۔ ایک ملیچھ کو اپنے گھر میں رکھ کر خود کو، پورے گھر کو بھرشٹ کر ڈالا۔ اب آپ برادری اور ہندو جاتی میں کس طرح آئیں جائیں گی؟"

ٹھکرائن بہت جذباتی ہو رہی تھیں، بولیں: "میں نے کہہ تو دیا کہ میں اپنے تینوں بیٹوں کو کھو دینے کے بعد اسے نہیں کھو سکتی۔ اگر میری برادری اور ہندو جاتی مجھے پسند نہیں کرتی تو مجھے بھی ان کی کوئی پروا نہیں۔"

آپ ٹھکرائن کے پاس کئی دن رہے، دوسری طرف سید حسین اور ان کے ساتھی آپ کے لیے بہت پریشان تھے۔ سید حسین اپنی فوج لے کر اس بستی کے پاس پہنچ گئے اور اسے محاصرے میں لے کر، اعلان کیا: "بستی والو! تمھاری بستی میں ٹھکرائن کے گھر میرے دوست وجیہ الدین آئے تھے۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں انھیں لینے آیا ہوں۔ اگر وہ مجھے نہیں ملے تو میں یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔"

اس اعلان نے پوری بستی میں کھلبلی مچادی۔ آپ ٹھکرائن کے ساتھ بستی کے باہر آئے اور سید حسین سے کہا: "سید حسین! تم کیسے ناسمجھ انسان ہو۔ کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ ٹھکرائن میری ماں ہے اور میری ماں میرے ساتھ دھوکا نہیں کرے گی۔ میں اپنی ماں کے ساتھ خیریت سے رہ رہا ہوں۔"

سید حسین نے کہا: "شیخ! آپ کا بیٹا رحیم الدین بہت پریشان ہے۔"

آپ نے ٹھکرائن سے اجازت لی اور سید حسین کے ساتھ چھاؤنی میں چلے گئے۔

آپ کئی دن بعد ٹھکرائن کے پاس دوبارہ گئے اور اس بار اپنے بیٹے رحیم الدین[1] کو بھی لیتے گئے۔ ٹھکرائن نے رحیم الدین کو اپنا پوتا سمجھا اور انھیں بڑی محبت دی۔

●

اورنگ زیب عالمگیر کا اپنے بھائیوں سے جھگڑے کا آغاز ہو چکا تھا۔ دارا شکوہ اور شجاع ایک طرف تھے شہزادہ مراد اور اورنگ زیب دوسری طرف۔ عالمگیر کی فوج میں شیخ وجیہ الدین بھی تھے۔ شاہ شجاع بنگالے کی طرف سے کوچ کرتا ہوا آیا اور اورنگ زیب نے اس کو راستے ہی میں روک لیا۔ شجاع کی فوج میں سرکش اور جنگ جو ہاتھیوں کی کثرت تھی۔ شاہ شجاع نے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا اور ان کی مدد سے اورنگ زیب کی فوج پر حملہ کر دیا۔ شاہ شجاع نے اپنے ہاتھیوں کے پیچھے زرہ پوشوں کے دستے متعین کر رکھے تھے۔

ہاتھیوں نے اورنگ زیب کی فوج میں بھگدڑ مچادی، وہ بھاگنے لگے۔ اس جنگ میں عالمگیر پر اتنا برا وقت آیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں

---

[1] ان دنوں رحیم الدین چار سال کے تھے اور یہ رحیم الدین شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد ہیں۔ رحیم الدین کا بیان ہے کہ بڑے ہونے کے بعد بھی میں اس ٹھکرائن کو اپنی دادی سمجھتا رہا۔ یہ ہمیشہ حقیقی دادی کی طرح محبت اور شفقت فرماتی رہیں۔

آیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے راہِ فرار اختیار کی اور بس چند آدمی باقی رہ گئے ان میں شیخ وجیہہ الدین بھی شامل تھے۔ اورنگ زیب نے کہا۔ "شیخ صاحب! اگر آپ بھی اپنی جان بچانا چاہیں تو میری طرف سے آپ کو اجازت ہے آپ جا سکتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میدانِ جنگ سے بھاگنا مردوں کا کام نہیں ہے۔ پھر میں کیونکر بھاگ سکتا ہوں؟"

اورنگ زیب نے کہا۔ "اب جان بچنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں اپنی جان بچا کر میدانِ جنگ سے بھاگ جاؤں، یہ کس طرح ممکن ہے؟"

آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ساتھیو! میں ان میں سے کسی ایک ہاتھی پر حملہ کرنا چاہتا ہوں، تمھاری کیا رائے ہے؟"

ایک ساتھی نے جواب دیا۔ "آپ ہاتھی پر حملہ کر کے بچیں گے کس طرح؟ وہ ہاتھی چشم زدن میں آپ کو ہلاک کر دے گا۔"

آپ نے اپنے جملہ ساتھیوں سے فرمایا۔ "میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر عمل کروں گا۔ جو ساتھی میرا ساتھ دینا چاہیں رُکے رہیں اور جو جانا چاہیں چلے جائیں مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

آپ کا یہ فرمانا تھا کہ چار کے سوا سبھی نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کر لی۔ آپ نے ان چاروں کے لیے فرمایا۔ "میرے یہ چار ساتھی آخر وقت تک میرے ساتھ رہیں گے یہاں تک کہ میں فتح حاصل کر لوں گا۔"

آپ کے چاروں ساتھیوں نے قسم کھائی۔ "ہم بھی آپ سے عہد کرتے ہیں کہ جب تک ہماری جان میں جان ہے ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔"

آپ اپنے چاروں ساتھیوں کو لے کر ہاتھیوں کی طرف بڑھے اور ان میں جو ہاتھی سب سے زیادہ سرکش تھا، اس کے سامنے پہنچ گئے آپ کے ساتھیوں نے پوچھا۔ "کیا ہم اس پر حملہ کر دیں؟"

آپ نے منع کیا۔ "ابھی نہیں دیکھو یہ ہاتھی کیا کرتا ہے؟"

ابھی آپ کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہاتھی نے اپنی سونڈ اٹھائی وہ آپ کو اپنی سونڈ کی گرفت میں لینا چاہتا تھا کہ آپ نے اس کی سونڈ پر تلوار کا بھرپور وار کیا، ہاتھی کی سونڈ کٹ کر دور جا گری۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہوا واپس ہوا اور اپنی ہی فوج کو روندنے لگا۔ اس کے پیچھے دوسرے ہاتھی بھی بھاگنے لگے اور چشم زدن میں شاہ شجاع کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اورنگ زیب اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں شاہ شجاع کو شکست ہوگئی، اور بنگالے واپس چلا گیا۔

اورنگ زیب آپ کے پاس گیا اور کہا۔ "شیخ صاحب! آپ نے جو اس وقت کارنامہ انجام دیا ہے میں اسے زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں مشیت ایزدی سے کس طرح انحراف کرتا۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ میں آپ کا ساتھ دوں۔"

اورنگ زیب نے کہا۔ "حضور والا! میں چاہتا ہوں آپ کے منصب میں اضافہ کر دیا جائے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں، میں جہاں ہوں صحیح ہوں۔ قناعت اور استغنا کا دامن کس طرح چھوڑ دوں؟"

اورنگ زیب نے آپ کے اس کارنامے اور احسان کو ہمیشہ یاد رکھا۔

شاہی منصب داروں میں سید شہاب الدین کی کسی نے شکایت کی کہ اس نے شاہی امانت میں خرد برد کی ہے، بادشاہ نے اس کو اپنے سامنے طلب کیا اور کہا۔ "شہاب الدین! اپنا حساب پیش کرو۔"

شہاب الدین نے حساب پیش کیا تو اس میں مجرم قرار پائے۔ بادشاہ نے کہا۔ "میں تجھ کو سزا دوں گا۔"

شہاب الدین رونے لگا اور درخواست کی۔ "حضور والا اگر مجھے وقت دیا جائے تو میں یہ رقم پوری کر دوں گا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "میں تجھ کو کسی ضمانت کے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔"

شہاب الدین نے کہا۔ "لیکن میں کس کی ضمانت پیش کروں؟"

ان واقعات کا علم شیخ وجیہہ الدین کو ہوا تو انھوں نے ضامن کی حیثیت سے خود کو پیش کر دیا، بولے۔ "شہاب الدین کا ضامن میں بنتا ہوں۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "شہاب الدین! تو مطلوبہ رقم کتنے دنوں میں واپس کر دے گا؟"

شہاب الدین نے جواب دیا۔ "کم از کم چھ ماہ میں۔"

بادشاہ نے آپ سے فرمایا۔ "حضور والا! آپ کے علم میں ہے کہ یہ رقم واپس کرنے کی چھ ماہ کے لیے مہلت مانگ رہا ہے جو میں دے رہا ہوں

آپ اس کو اپنے طور پر ہدایت فرما دیں کہ یہ وعدے کا پاس کرے۔"

آپ نے شہاب الدین سے کہا: "میں نے تیری ضمانت دی ہے، تجھے اس کا خیال کرنا ہوگا۔"

شہاب الدین نے جواب دیا: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ مطلوبہ رقم چھ ماہ کے اندر واپس کر دوں گا۔"

شہاب الدین کو رہائی مل گئی۔

اس بات کو چھ ماہ گزر گئے، مگر شہاب الدین کی طرف سے رقم نہیں واپس کی گئی۔ بادشاہ نے اپنا آدمی آپ کے پاس بھیجا اور آپ کو مطلع کیا: "شہاب الدین نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔"

آپ نے شہاب الدین کو اپنے گھر بلایا اور پوچھا: "شہاب الدین! کیا تم نے بادشاہ کی رقم واپس کر دی؟"

شہاب الدین نے جواب دیا: "رقم تو میں نے ابھی تک نہیں واپس کی۔"

آپ نے پوچھا: "تو نے چھ ماہ کا وعدہ کیا تھا، اس کو کتنی مدت گزر چکی ہے؟"

شہاب الدین نے جواب دیا: "تقریباً سات ماہ۔"

آپ نے فرمایا: "تو بادشاہ کی رقم پہنچا دے، یہ تو بڑی شرمناک بات ہے۔"

شہاب الدین نے جواب دیا: "بات شرمناک ہو یا افسوسناک، میرے پاس تو پھوٹی کوڑی تک نہیں، میں کہاں سے ادا کروں؟"

آپ نے کہا: "بات پھوٹی کوڑی کی نہیں، وعدے اور اصول کی ہے۔ بادشاہ کی رقم اسے ملنی چاہیے۔"

شہاب الدین نے اپنی تلوار آپ کی طرف بڑھا دی اور کہا: "رقم تو میرے پاس نہیں، یہ تلوار حاضر ہے، آپ جو چاہیں کریں۔"

آپ نے طنزاً کہا: "شہاب الدین تلوار پکڑنا تو آسان ہے مگر اس سے عہدہ برآ ہونا مشکل۔"

شہاب الدین کو آپ کی یہ بات بہت گراں گزری، اس نے اپنی تلوار سے اچانک آپ پر حملہ کر دیا لیکن آپ نے اس کا وار خالی دیا، اور دوسرے ہی لمحے سیدھے ہاتھ سے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ شہاب الدین زمین پر گر گیا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

آپ نے اپنے خادم سے کہا: "اس کو قید خانے میں ڈال دو اور اس کے اصطبل سے مویشی کھول لاؤ۔"

کچھ دیر بعد شہاب الدین کو ہوش آ گیا۔

آپ نے اس سے کہا: "تیری وہ ڈینگیں کہاں گئیں؟"

شہاب الدین نے جواب دیا: "میں نے کوئی غلطی نہیں کی، میں بے قصور ہوں۔ رہ گئی یہ بات کہ آپ نے مجھے زیر کر لیا، تو حضرت ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی میرا ہاتھ اٹھا ہی تھا کہ آپ نے جھانپڑ رسید کر دیا۔ آپ نے مجھ پر حملے میں پہل کر دی تھی، اس لیے آپ جیت گئے ورنہ میں دیکھتا۔"

آپ نے فرمایا: "اچھا تو یہ بات تھی۔" اس کے بعد آپ نے اپنے خادم سے کہا: "اس کو تلوار دے دو تاکہ یہ دل کی حسرت نکال لے۔"

خادم نے تلوار دے دی۔ شہاب الدین نے تلوار لے تو لی اور حملے کے لیے ہاتھ بھی اٹھایا مگر مجھ پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ رونے لگا۔ آگے بڑھا کر قدموں میں گر گیا۔ بولا: "حضرت! مجھے معاف فرما دیں، میں بادشاہ کی رقم آج ہی واپس کر دوں گا۔"

چنانچہ اس نے بادشاہ کی رقم اسی دن واپس کر دی۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ وجیہہ الدین میں معلوم نہیں کیا بات تھی کہ میں لرز گیا۔ مجھے ایسا لگا گویا میں ہلاک کر دیا جاؤں گا۔"

❁

ایک بار آپ نے جنگ میں حصہ لیا اور طرفین بہت خون خرابہ ہوا۔ یہ مقابلہ بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہوا تھا۔ شام کو مسلمانوں نے فتح حاصل کی اور غیر مسلم فرار ہو گئے۔ اس میں کافی آدمی مارے گئے تھے۔ رات کو آپ کی فوج کا سپہ سالار دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ بیٹھا اور مقتولین کی تعداد کا ذکر چھیڑا۔ کوئی کہتا تھا: "دونوں طرف کے ہزار تو ضرور مارے گئے ہوں گے۔"

دوسرے نے رائے دی: "نہیں ہزار تو نہیں لیکن سات ساڑھے سات سو سے کم نہیں مارے گئے ہوں گے۔"

آپ نے فرمایا: "نہ ہزار نہ سات سو۔ مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ کل پانچ کم دو سو یا پانچ اوپر دو سو آدمی مارے گئے۔"

سپہ سالار نے پوچھا: "ایک طرف کے، یا دونوں طرف کے؟"

آپ نے جواب دیا: "دونوں طرف کے۔"

سپہ سالار نے کہا: "مجھے یقین نہیں آرہا۔"

آپ نے اُن سب کو وہیں چھوڑا اور خود زخمیوں اور مُردوں میں پہنچ گئے۔ لوگوں کو شُبہ بھی نہیں گزرا کہ آپ کس مقصد سے جا رہے ہیں۔

یہ بڑی طوفانی رات تھی۔ طوفانِ باد و باراں نے ہیبت طاری کر رکھی تھی۔ آپ میدانِ کارزار میں پہنچ گئے۔ آپ کو جس جگہ بھی شُبہ ہُوا، وہیں جھک کر ٹٹول لیا۔ آپ نے ایک شخص کو ٹٹولا تو چیخ مار کر رو دیا، بولا: "حضرت! میں زندہ ہوں مجھ زخمی کو یہاں سے نکال لے چلو۔"

آپ نے جواب دیا: "میرا نام وجیہ الدین ہے میں یہاں سے واپس جا کے آدمی بھیجوں گا وہ تجھے اُٹھا لے جائیں گے۔"

آپ میدانِ کارزار کے بعد گاؤں میں چلے گئے۔ یہاں بھی زخمی اور مُردہ پڑے ہُوئے تھے۔ اندھیرے میں آپ کا ہاتھ کسی بوڑھی عورت پر پڑا تو وہ خوف سے رونے لگی۔ آپ نے پوچھا: "تو کیوں رو رہی ہے؟"

عورت نے جواب دیا: "میں جان بچانے بھاگ رہی تھی کہ رات ہو گئی اور اس جگہ چھُپ گئی۔ اب رات کے سنّاٹے اور باد و باراں کے طوفان میں کہیں جانے کی ہمت نہیں رہی۔"

آپ نے فرمایا: "عورت! میرا نام وجیہ الدین ہے اور میں مسلمانوں کے لشکر سے آیا ہُوں۔ تو یہیں موجود رہ۔ کچھ دیر بعد میرے ساتھی یہاں آئیں گے وہ تجھ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

عورت جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ آپ اپنے لشکر میں واپس گئے، آپ نے دیکھا سپہ سالار اور دوسرے سردار اسی طرح سر جوڑے بیٹھے تھے۔ آپ نے اُن سب سے کہا: "ابھی ابھی میں مقتولوں کو گن کر آیا ہُوں۔ اُن میں دو زندہ ہیں۔ ایک زخمی مرد اور ایک خوفزدہ بوڑھی عورت۔ بقیہ دو سو پانچ کی لاشیں پڑی ہیں۔"

سپہ سالار نے حیرت سے پوچھا: "آپ اتنی جلدی گن بھی آئے۔ جب کہ میرے خیال میں وہاں جا کے اتنی جلدی واپس آ جانا ہی ناممکن ہے، اور پھر ان حالات میں کہ باد و باراں نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔"

آپ نے جواب دیا: "تم لوگ چاہو تو جا کر گن لو۔ تمھارا جانا وہاں یوں بھی بہت ضروری ہے کہ وہاں دو زندوں کی جانیں بچ جائیں گی۔"

سپہ سالار نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا: "آپ حضرات کیا مشورہ دیتے ہیں؟"

ایک سردار نے کہا: "اس وقت میدانِ جنگ اور مذکورہ گاؤں میں جانا اتنا آسان بھی نہیں ہے اندھیری رات میں یہ کام کس طرح ہوگا؟"

لیکن دوسرے سردار نے مثبت مشورہ دیا، بولا: "ہمیں وہاں پہنچنا چاہیے کیونکہ دو زندوں کو بچا لانا ثواب کا کام ہے۔ اندھیرے کو مشعلوں سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ بارش رُک جائے تو ہم سب اس مہم کا آغاز کر دیں۔"

سپہ سالار نے اسی وقت سو مشعلیں روشن کرا دیں اور یہ لوگ بارش کے تھمتے ہی اُدھر روانہ ہو گئے۔

ان لوگوں نے مقتولوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شمار کیا تو ان کی تعداد دو سو پانچ سے کچھ نہیں نکلی اور دونوں زندہ بھی انھیں مل گئے — اُن دونوں نے تلاش کرنے والوں سے پوچھا: "کیا آپ کے ساتھ وجیہ الدین بھی آتے ہیں؟"

ایک سردار نے جواب دیا: "وجیہ الدین فوج میں ہیں، اُن سے آپ کا کوئی کام؟"

ان دونوں نے یکے بعد دیگرے ایک ہی جواب دیا: "نہیں۔ ہم نے ان کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ کچھ دیر پہلے یہاں آئے تھے۔"

دونوں کی باتوں نے سبھی کو متحیّر اور متعجب کر دیا۔ وجیہ الدین جتنی جلدی واپس گئے تھے اس سے یہ باتیں اُن کی کرامت سے کم نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ سپہ سالار نے کہا: "وجیہ الدین ولی ہیں۔ وہ خود کچھ کہیں نہ کہیں لیکن اُن کا وجود کرامت آمیز ہے۔"

❁

آپ کہا کرتے تھے کہ میں نے رسولِ مقبولؐ کی سنت کو اپنانے میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ یہاں تک کہ میں نے کفار سے جنگیں تک لڑی ہیں پھر آپ نے شاہی ملازمت چھوڑ دی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ آپ کے صاحبزادے شاہ عبدالرحیم رات کو اُٹھ اُٹھ کر آپ کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

آپ تہجد میں بھی اتنے ہی مستعد تھے جتنے پانچ وقت کی نمازوں کے۔ آپ کی تہجد کا ایک وقت مقرر تھا۔ شاہ عبدالرحیم نے محسوس کیا، تہجد گزاری کا وقت گزر چکا ہے مگر آپ بستر پر نہیں آتے۔ یہ والد کو دیکھنے کے لیے حجرے میں جو پہنچے تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ آپ سجدے میں بے سُدھ پڑے ہوئے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم کافی دیر کھڑے دیکھتے رہے۔ وہ بے حس و ساکت سجدے میں پڑے تھے۔ انھیں شُبہ گزرا شاید اُن کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ انھوں نے دوسروں کو خبر کرنے کے لیے جیسے ہی حجرے سے نکلنا چاہا تو اُن کے جسم میں ہلکی سی حرکت ہوئی، یہ ٹھہر گئے۔ آپ نے سجدے سے سر اُٹھایا تو تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے پوچھا: "پدرِ بزرگوار! خیریت تو ہے، آپ کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا: "میں پریشان نہیں ہوں۔ میں سجدے میں غیبت کی سیر کر رہا تھا۔ میں نے غیبت میں اپنے خاندان کے اُن بزرگوں سے ملاقاتیں کیں جو مختلف جنگوں میں شہید ہو چکے ہیں۔ میں نے ہر ایک کو بلند درجات اور اعلیٰ مقامات پر فائز دیکھا۔ میں بے حد خوش ہوا اور اسی عالم میں میں نے اپنے خدا سے استدعا کی کہ مجھے بھی شہادت کا مرتبہ عطا ہو۔ میں بہت رویا گڑگڑایا۔ یہاں تک کہ میری دعا قبول ہوگئی اور مجھے وہ جگہ دکھا دی گئی یہ جگہ دکن میں ہے میں نے اس جگہ کو دیکھ اور پہچان لیا ہے۔"

دوسرے دن صبح آپ نے اپنے بیٹوں سے کہا: "میں دکن جانا چاہتا ہوں میرا سامان سفر تیار کر دیا جائے۔"

آپ کے تینوں بیٹوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ شیخ ابوالرضا، شیخ عبدالرحیم اور شیخ عبدالحکیم۔ عبدالرحیم کو حکم دیا گیا کہ گھوڑا خرید لیا جائے۔ ایسا گھوڑا جس پر دکن کا سفر کیا جا سکے۔

سامان سفر تیار تھا۔ گھوڑا بھی خرید کر آپ کے حوالے کر دیا گیا۔ آپ نے فرمایا: "میں دکن جا رہا ہوں، وہاں میرا مقابلہ شاید شیوا جی مرہٹہ سے ہوگا۔ میں اگر واپس نہ آؤں تو میرا انتظار نہ کرنا اور نہ فکر اور غم کرنا۔"

آپ دکن روانہ ہوگئے اور سیدھے برہان پور چلے گئے۔ برہان پور میں تہجد کے دوران آپ کو بتایا گیا: "مقام شہادت تم پیچھے چھوڑ آئے ہو اس لیے واپس جاؤ۔"

آپ نے علی الصبح برہان پور چھوڑ دیا اور جدھر سے آئے تھے اسی طرف واپس چلے۔ راستے میں تاجروں کا قافلہ مل گیا۔ یہ تاجر نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ ان لوگوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آپ نے اُن کی محبت کی وجہ سے اُن سے وعدہ کیا کہ پتہ نہیں میں کہاں شہید کر دیا جاؤں اس لیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں تمہارا دوست اور غمخوار رہوں گا۔

تاجر آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔

دوران سفر ایک جگہ آپ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس سے چلا نہیں جا رہا تھا مگر سفر کر رہا تھا، آپ نے اسے روک لیا اور پوچھا: "بڑے میاں! آپ کہاں جا رہے ہیں اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

بڑے میاں نے انھیں اس طرح دیکھا جیسے اُن کی بینائی بھی جواب دے چکی ہے۔ انھوں نے وجیہہ الدین کو پہچاننے کی کوشش کی، بولے "میاں جی بُرا نہ مانیے گا، میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے، آپ کا نام کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "میرا نام وجیہہ الدین ہے۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں کہیں ملے ہوں لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس سے پہلے بھی میں نے کہیں آپ کو دیکھا ہے۔"

بوڑھے نے کہا: "میں ہندو ہوں مگر بڑھاپے نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا۔"

آپ نے پوچھا: "اس بڑھاپے میں آپ کو اپنے گھر بیٹھنا تھا، یہ کہاں چل دیے؟"

اس نے جواب دیا: "میرا ایک بیٹا ناراض ہو کر دہلی چلا گیا ہے میں اسے منانے جا رہا ہوں۔"

آپ نے بے خیالی میں فرمایا: "آپ دہلی تو خیر کیا جائیں گے بہرحال جہاں تک آپ ہمارے ساتھ ہیں آپ کو مجھ سے ہر روز تین پیسے مل جایا کریں گے۔"

بوڑھے ہندو نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور آپ اُسے ہر روز تین پیسے دینے لگے۔

راستے میں ایک جگہ آپ نے اس بوڑھے سے کہا: "بڑے میاں! رات مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ مجھے وہیں لیے جا رہے ہیں جہاں میرا خاتمہ بالخیر ہونا ہے۔"

بڑے میاں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور بڑبڑانے لگے: "رام رام رام۔ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے اور میں ہی تمھیں کسی ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں تمھارا خاتمہ ہوگا۔"

آپ نے فرمایا: "مجھے تو کچھ یہی بتایا گیا ہے۔"

قافلہ قصبہ ہنڈیا سے پہلے نوین بریا نامی سرائے میں ٹھہر گیا۔ یہ سرائے دریائے نربدا سے دو تین منزل ہندوستان کی طرف ہے۔ بڑے میاں اس سرائے سے غائب ہوگئے۔ آپ نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ آپ نے اپنے تاجر ساتھیوں سے کہا: "دال میں کچھ کالا کالا ہے ہوشیار رہو۔"

لیکن تاجر جنگجو نہیں تھے، بولے: "ہم سب اپنے رب کی مشیت کے تابع ہیں۔"

صبح فجر کی نماز کے بعد آپ تلاوتِ کلامِ پاک میں مشغول تھے کہ سرائے کو سینکڑوں آدمیوں نے گھیر لیا۔ یہ ہتھیار بند ڈاکو تھے۔

ڈاکوؤں میں سے تین آدمی آگے بڑھے اور پکار کر پوچھا "تم میں وجیہہ الدین کس کا نام ہے؟ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔"

آپ نے قرآن پاک کی تلاوت کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دیا۔ کسی دوسرے شخص نے آپ کی طرف اشارہ کیا "ان کا نام وجیہہ الدین ہے۔ ان سے کوئی کام ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "ہم انتظار کریں گے کہ یہ اپنی مقدس کتاب پڑھ چکیں تو ہم ان سے کوئی بات کریں۔"

جب آپ قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہوئے تو قرآن کو جزدان میں رکھ کر بوسہ دیا اور اسے اونچی جگہ پر رکھ کر نو آمدوں سے پوچھا "کیا بات ہے؟ میرا ہی وجیہہ الدین نام ہے۔"

تینوں میں سے ایک نے کہا "شریمان جی! ہمیں آپ سے کوئی غرض نہیں، آپ یوں بھی بہت بھلے مانس انسان ہیں اور یہ کہ آپ نے ہمارے ایک آدمی کو بہت سکھ دیا ہے، اس نے آپ کا نمک کھایا ہے ہم اس نمک کا پاس کریں گے۔"

آپ نے پوچھا "مگر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اس ہندو نے جواب دیا "جیسا کہ ہم نے بتایا کہ ہم تم سے کچھ نہیں بولیں گے مگر تم جس قافلے کے ساتھ ہو اسے ہم نہیں چھوڑیں گے۔"

آپ نے کہا "اس قافلے کے ساتھ میں بھی تو ہوں۔"

اس ہندو نے کہا "ہم نے آپ کو پناہ دی ہے آپ قافلے سے الگ ہو جائیں۔"

آپ نے جواب دیا "ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس قافلے سے عہد و پیمان کیا ہے، میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔"

اُسی ہندو نے اکڑ کر کہا "اور ہم بھی مجبور ہیں کہ اس قافلے کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

آپ نے اپنے ہتھیار پر ہاتھ ڈالا، کہا "میں اپنے قافلے کی حفاظت میں جنگ کروں گا۔"

اُس ہندو نے واپس جاتے ہوئے کہا "بہرحال ہم نے ابھی تک اپنے کسی محسن پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔"

آپ نے فرمایا "تم نے اپنے محسن پر ہاتھ نہیں اُٹھایا تو میں نے بھی آج تک اپنے کسی دوست یا ساتھی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔"

تینوں ہندو واپس جانے لگے، ایک نے کہا "ہماری طرف سے آپ کو اس وقت تک پناہ ہے جب تک آپ ہمارا مقابلہ نہیں کریں گے۔"

آپ نے جواب دیا "مجھے ایسی پناہ نہیں چاہیے۔"

ہندوؤں کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکوؤں نے لوٹ مار شروع کر دی آپ تلوار لے کر آگے بڑھے۔ تاجروں نے بھی مقابلہ کیا مگر لٹیرے بہت زیادہ تھے۔ کچھ دیر مقابلہ جاری رہا۔ آخر تاجر قتل کر دیے گئے اور آپ کے جسم پر بھی بائیس زخم آئے آپ زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ ایک ہندو آگے بڑھا اور سر تن سے جدا کر دیا، بولا "اس نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔"

آپ ایک بار پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اس ہندو کا پیچھا کیا وہ بدحواس ہو کر بھاگا، ایک ہندو عورت نے آپ کو اس حال میں دیکھا تو حیرت سے بولی "میاں جی! یہ کیا۔ یہ کیا؟"

آپ اُسی وقت گر گئے۔

ڈاکوؤں کی لوٹ مار کے بعد سرائے والوں نے وہیں آپ کو دفن کر دیا۔

شہادت کے بعد آپ کو شاہ عبدالرحیم نے اپنے گھر میں دیکھا آپ کمرے کے دروازے پر خون میں لت پت کھڑے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے گھبرا کر پوچھا "بابا جان! آپ کب تشریف لائے؟ یہ آپ کو کیا ہوا؟"

آپ نے اپنے بیٹے کو پوری تفصیل بتا دی اور فرمایا "چند بھلے آدمیوں نے مجھے نوین ہریا کی سرائے کے باہر دفن کر دیا ہے۔"

شاہ عبدالرحیم کی آنکھیں بھر آئیں، پوچھا "کیا آپ کے جسدِ مبارک کو وہاں سے لے آیا جائے؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں وہیں ٹھیک ہوں۔"

اس کے بعد شاہ عبدالرحیم نے دیکھا آپ دھوئیں کی طرح فضا میں تحلیل ہو گئے۔

ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے

مخزن اصفیا

ملتان کا بادشاہ

شیخ نظام الدین

شمس عرفان

شاہ عبدالرحمان

عارف حق

شاہ دولہ

ابوسفیان ثوری

شیخ نجیب الدین

سلطان باہو

خواجہ باقی باللہ

فضل رحمن

جان جاناں کا خلیفہ

محبوب الٰہی

تصوف کی زبان

شیخ وجیہہ الدین